مقدمۂ دستور

(حصہ دوم)

حزب التحریر

من منشورات حزب التحرير

یہ کتاب حزب التحریر کی نشر کردہ کتب میں سے ہے

اقتصادی نظام: 6

تعلیمی پالیسی: 182

خارجہ پالیسی: 203

پہلا ایڈیشن:1382ھ- 1963ء

دوسرا ایڈیشن:1431ھ- 2010ء

اردو ترجمہ- 2014ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝ وَاَنِ احۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَیۡكَ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ اَنۡ یُّصِیۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ وَاِنَّ كَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ۝ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِیَّةِ یَبۡغُوۡنَ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۝

(المائدۃ:48 – 50)

”اور ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر حاوی (منسوخ کرنے والی) ہے۔ پس ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے، اس کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی پیروی کبھی نہ کیجئے گا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت کر دیتا لیکن وہ تمہیں اپنے دیے ہوئے حکموں میں آزمانا چاہتا ہے لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو اللہ کے پاس پہنچنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا اور کون ہے؟ یہ بات ایسی قوم کے لیے ہے جو یقین رکھتی ہے“

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتصادی نظام

دفعہ نمبر 123: اقتصادی پالیسی یہ ہے کہ (ریاست کے شہریوں کی) ضروریات کو پورا کرتے وقت معاشرے کی بنیاد (حکم شرعی) کو مد نظر رکھا جائے گا یعنی ضروریات کو پورا کرنے کی اساس حکم شرعی ہو گی۔

یہ دفعہ کئی دلائل سے مستنبط ہے اور حکم شرعی کو جس طرح ایک دلیل سے مستنبط کیا جاتا ہے، اسی طرح کئی ایک دلائل سے بھی مستنبط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دفعہ کو اشیاء کی ملکیت کو مخصوص کیفیتوں میں محدود کرنے، ملکیت کے اسباب کو معین اسباب تک محدود کرنے، ملکیت کی نشوونما کو خاص کیفیت پر منحصر کرنے اور بعض اشیاء و اعمال کو حرام قرار دینے، والے دلائل سے مستنبط کیا گیا ہے۔ پس ان چار امور کے دلائل سے اقتصادی پالیسی (حکمت عملی) کو اخذ کیا گیا ہے۔

ان مذکورہ دلائل سے استنباط کی گئی اقتصادی پالیسی یہ ہے کہ دولت کو اس نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ کہ وہ ضروریات کو پورا کرتی ہے، یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس دولت کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے۔ چنانچہ گندم اور شہد دولت ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں مباح قرار دیا ہے جبکہ حشیش اور شراب دولت میں شمار نہیں ہونگے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ وہ مال جو خریدا جاتا ہے یا وہ مال جو اجرت کی شکل میں حاصل کیا جاتا ہے، دولت میں شمار ہونگے کیونکہ شرع نے ان دونوں حالتوں میں مال حاصل کرنے کو مباح قرار دیا ہے۔ اس کے بر خلاف وہ مال جو چوری سے یا باطل عقد (ناجائز معاہدے) کے ذریعے کمایا جائے، دولت نہیں سمجھی جائے گی کیونکہ شرع نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ پس ضروریات کو پورا کرتے وقت حکم شرعی پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس بات میں بھی حکم شرعی ہی اساس ہونا چاہئے کہ دولت

ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے، یعنی پیداوار (کمائی) اور خرچ دونوں حکم شرعی کے عین مطابق ہونے چاہیے۔ مذکورہ دفعہ میں جو بیان کیا گیا کہ اقتصادی پالیسی یہ ہے کہ انسانی ضروریات کو پورا کرتے وقت معاشرے کے فرائض پر نظر رکھی جائے، اس کا یہی معنی ہے۔ جس چیز پر معاشرہ قائم ہونا چاہیے، جس چیز پر لوگوں کے درمیان تعلقات کا دارومدار ہونا چاہیے وہ حکم شرعی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان تعلقات کا قیام اور ان تعلقات کا جاری رہنا شرعی احکامات میں مقید ہونا چاہیے۔ جس طرح معاشرے کی بنیاد میں احکام شرعیہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اسی طرح ضروریات کو پورا کرتے وقت بھی انہی احکام شرعیہ کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے، چاہے اس کا تعلق پیداوار سے ہو یا خرچ سے۔ یعنی دونوں صورتیں حکم شرعی پر مبنی ہوں۔ پس اسلامی نظام میں دولت کے لیے یہ قاعدہ (اصول) ہے کہ دولت ایسا اقتصادی مادہ ہے جس کی پیداوار بھی صحیح اور استعمال کرنا بھی صحیح ہے۔ معاشرے یعنی لوگوں کے درمیان تعلقات کا حکم شرعی میں مقید ہونا ہی اساسی چیز ہے۔ اسی اساس کو مدنظر رکھتے ہوئے دولت کو دیکھا جائے گا کہ یہ انسانوں، فرد یا سب کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، اسی بنیاد پر پیداوار اور خرچ کا نظام قائم ہو گا۔

اگرچہ یہ بنیاد کہ حکم شرعی کی پابندی کرنا عمومی طور پر وارد ہوا ہے اور ایک مسلمان کے لیے تمام اعمال میں حکم شرعی کو فیصلہ کن حیثیت دینا واجب ہے، لیکن شریعت نے اقتصادی پالیسی میں عام دلائل پر ہی اکتفا نہیں کیا جیسا کہ یہ آیت ہے **وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ "اور تمہیں رسول نے جو دیا تم اسے لے لو اور جس چیز سے تمہیں روکیں اس سے باز آجاؤ"** (الحشر: 7)۔ بلکہ دولت کے متعلق تفصیلی دلائل وارد ہوئے ہیں، دولت میں اضافے اور اس کے ذریعے ضروریات پورا کرنے کے لحاظ سے۔ اور یہ دلائل ملکیت کی کیفیت کی حد بندی، ملکیت کے اسباب کی حد بندی، ملکیت کی نشو نما کی حد بندی، اور بعض اشیاء اور اعمال کے حرام ہونے کے متعلق ہیں۔ اسلام کی اقتصادی پالیسی صرف اس نظریہ کے اوپر مبنی نہیں کہ دولت ضروریات کو پورا کرتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ

دولت مباح (جائز) ہو اور جس ضرورت کو وہ پورا کرتی ہے وہ بھی مباح ہو۔ یعنی اسلام کی اقتصادی پالیسی لوگوں کے درمیان تعلقات کو احکام شرعیہ کے مطابق منظم کرنے کے نقطہ نظر پر مبنی ہے۔

دفعہ 124: اقتصادی مسئلہ اموال اور منافع کو رعایا کے تمام افراد کے درمیان تقسیم کرنا ہے، اسی طرح اس مال سے نفع اٹھانے یعنی دولت کو اکٹھا کرنے اور اس کیلئے کوشش کرنے کو ان کے لیے آسان بنانا ہے۔

اس دفعہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اقتصادی مسئلے کی دو شقیں ہیں: اول: افراد کی غربت کو ختم کرنا، یعنی اس بات کی ضمانت دینا کہ ملک کی دولت رعایا کے افراد میں سے ہر فرد کو اس طرح میسر ہو کہ کوئی بھی فرد اس سے محروم نہ رہے۔ جبکہ دوسری شق یہ ہے کہ رعایا کے ہر فرد کے لیے دولت جمع کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کو ممکن بنانا۔ پہلی شق کی دلیل وہ آیات اور احادیث ہیں جو فقیر مسکین اور مسافر کے بارے میں ہیں۔ ان آیات کی کثرت اور تنوع کو دیکھ کر اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں تک آیات کا تعلق ہے تو ان میں سے کچھ یہ ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ** "**اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ**"(الحج: 28)۔ اور فرمایا **وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ہ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** " **اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔ صدقات کے مستحق صرف وہ غربا ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں روک دیئے گئے**"(البقرۃ:272-273)۔ اور فرمایا: **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ** "**صدقات (زکوٰۃ) صرف فقیروں، مسکینوں، ان صدقات کے وصول کرنے والوں، دل جیتنے کے لیے، گردن چھڑانے میں، قرض داروں کے لیے، اللہ کے راستے میں اور مسافروں کے لیے ہیں**"(التوبۃ: 60)۔ اور فرمایا **مَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى**

فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ "بستیوں والوں کا جو (مال) اللہ تعالیٰ تمہارے لڑے بھڑے بغیر اپنے رسول کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور قرابت والوں کا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا" (الحشر: 7) اور فرمایا لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ "اور (فئی کا مال) مہاجر مسکینوں کے لیے ہے" (الحشر: 8)۔ اور فرمایا اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۖ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ "اگر تم صدقے خیرات کو ظاہر کرو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے" (البقرۃ: 271)۔ اور فرمایا وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ۖ "اور جو لوگ روزہ نہیں رکھ سکتے ان کے اوپر فدیہ یعنی (ایک روزے کے بدلے میں) ایک مسکین کو کھانا کھلانا واجب ہے" (البقرۃ: 184)۔ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ۚ "اور جس کو یہ طاقت بھی (ساٹھ روزہ رکھنے کی) نہ ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے" (المجادلۃ: 4)۔ اور فرمایا وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا "اور اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین، یتیم اور قیدی کو" (الانسان:8)۔ اور فرمایا اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ " بھوک والے دن کھانا کھلانا کسی رشتہ دار یتیم یا خاکسار مسکین کو" (سورۃ البلد:14-16) اور فرمایا قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۗ (البقرۃ: 215) "آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو وہ ماں باپ کے لیے ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے" اور فرمایا: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ (البقرۃ: 177) " بلکہ حقیقتاً نیک وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، اور جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے"۔ اور فرمایا اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ (المائدہ:95-)" اور خواہ کفارہ مساکین کو دے دیا جائے"۔ اور فرمایا فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیْنَ "اس کا کفارہ دس محتاجوں

کو کھانا دینا ہے"(المائدہ: 89)۔ اور فرمایا **وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ " اور ان کے مال میں مانگنے والوں کا اور نہ مانگنے والوں کا حق تھا"** (الذاریات: 19)۔ اور فرمایا: **وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ہ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے یعنی مانگنے والوں کا اور نہ مانگنے والوں کا"**(المعارج: 24-25)۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: **«وَأَيُّمَا أَهْلُ عَرْصَةٍ أَصْبَحَ فِيهِمْ امْرُؤٌ جَائِعٌ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللَّهِ تَعَالَى» "کسی بستی میں کوئی شخص بھوکا سوئے تو اس بستی والوں کی ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ بری ہے"** اس حدیث کو امام احمد نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور احمد شاکر نے اس روایت کو صحیح قرار ہے۔ اور آپ ﷺ اپنے رب سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **«مَا آمَنَ بِي مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهُ جَائِعٌ وَهُوَ يَعْلَمُ» "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ شخص مجھ پر ایمان ہی نہیں لایا جس نے خود تو پیٹ بھر کر کھایا اور اس کا ہمسایہ بھوکا سویا، حالانکہ اسے (ہمسائے کی حالت کا) علم بھی تھا "**۔ اس حدیث کی تخریج بزار نے انسؓ سے کی ہے جسے ہیثمی اور منذری نے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ تمام آیات اور وہ احادیث جو خرچ کرنے کے بارے میں ہیں، اس طرح صدقات کے احکام، زکوٰۃ کے احکام اور فقرا، مساکین، ضرورت مند مسافر اور سائل کی حاجت روائی کرنے کے احکامات کو جو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی یا معاشی مسئلہ افراد کی ضرورتمندی ہے یعنی دوسرے الفاظ میں افراد کے درمیان دولت کی غلط تقسیم ہے، جس کا نتیجہ افراد کی غربت کی شکل میں نکلتا ہے۔ چنانچہ مسئلہ رعایا کے تمام افراد پر دولت کو تقسیم کرنا ہے۔ لہٰذا دولت کی تقسیم کے مسئلے کو حل کرنا ضروری ہے تاکہ دولت تمام افراد کو مل سکے۔ جس امر کے متعلق دلائل وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ دولت تمام افراد کو پہنچنی چاہئے۔ ہر فرد تک دولت پہنچانے کے لئے محرومی کا ازالہ کرنا ہوگا۔ یعنی وہ افراد جن میں صفت فقر پائی جائے جیسا کہ فقرا، مساکین، مسافر اور سوالی، ان کے مسائل کو حل کرنا پڑے گا۔ پس اس دفعہ کی پہلی شق کے یہی دلائل ہیں۔

دفعہ کی دوسری شق کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مباح ذریعے سے مال کے مالک بننے کو عمومی طور پر جائز (مباح) قرار دیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ»** **"جو کوئی کسی بنجر زمین کے ارد گرد چار دیواری بنالے تو وہ اس کی ہو گئی"**۔ احمد اور ابو داؤد نے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور ابنِ جارود اور زین نے اس کے اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ** **" تمہارے لیے سمندر کا شکار حلال کیا گیا ہے"** (المائدہ : 96)۔ اسی طرح ملکیت کا مباح ہونا اور اس اباحت کا ریاست کے ہر فرد کے لیے عام ہونا، چاہے مسلم ہو یا ذمی، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر فرد کے لیے مال حاصل کرنا، اس کے لیے کوشش کرنا مباح ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء لباس، مکان اور دوسرے مال ومتاع سے فائدہ اٹھانے کے مباح ہونے کے بھی عام دلائل وارد ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فَكُلُوْا مِنْهَا** **"اور اس میں سے کھاؤ جو رزق ہم نے دیا ہے"** (سورۃ الحج:28) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ»** **"آدمی کے لیے اپنے ہاتھ کی کمائی کے کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں"** اس حدیث کو بخاریؒ نے المقدام کے واسطے سے روایت کیا ہے۔ اور ارشاد باری ہے: **كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ** **" جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے کھاؤ"** (الانعام : 142)۔ اور ارشاد باری ہے: **وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلَالًا طَيِّبًا** **"اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ"** (المائدہ : 88)۔ اور ارشاد ہے **كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ** **" جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ"** (البقرہ : 172)۔ اور ارشاد باری ہے: **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ** **"آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسبابِ زینت کو، جنہیں اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟"** (الاعراف: 32)۔ اس کے علاوہ اور دلائل بھی وارد ہوئے ہیں، اور یہ سب دلائل عام ہیں۔ اباحت کی اس عمومیت میں رعایا کے تمام افراد شامل ہیں خواہ

مسلمان ہوں یا ذمی، یعنی کوئی بھی شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس تمام کا یہ مطلب ہے کہ شریعت نے رعایا کے ہر فرد کے لیے مال کے مالک بننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کو ممکن بنایا ہے۔

یوں شرعی دلائل نے بنیادی مسئلے کو اور اس کے حل کو بیان کیا ہے، یعنی مسئلہ افراد کی غربت اور ان کا مال کمانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ ہونا ہے۔ چنانچہ شرع نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ افراد کی غربت کو دور کرنے کے لیے مال کمانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کو عموماً مباح قرار دیا اور اسی اباحت کو اقتصادی معاملات کی بنیاد بنایا۔ یہ اباحت اقتصادی امور کی بنیاد ہے۔ بالفاظ دیگر بنیادی مسئلہ دولت کی تقسیم ہے نہ کہ دولت کی پیداوار کا، کیونکہ مسئلہ افراد کی غربت اور ان کا مال کمانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ ہونا ہے نہ کہ ملک کے غریب ہونے یا دولت کے کم ہونے کا، پس اصل مسئلہ دولت کی تقسیم ہے نہ کہ دولت کو پیدا کرنا۔

رہی یہ بات کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ اصل مسئلہ دولت کی تقسیم کا ہے نہ کہ پیداوار کا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلے سے متعلق جتنی بھی شرعی دلائل ہیں وہ غربت کے مسئلے کو حل کرنے، ملکیت کے جائز ہونے اور اس ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے مباح ہونے کے متعلق ہیں اور یہی معاشی زندگی کی حقیقت بھی ہے۔ جہاں تک شرعی دلائل کی بات ہے تو یہ دلائل افراد کی غربت کے حل، ملکیت کے مباح ہونے اور ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے مباح ہونے کے بارے میں ہیں، یعنی دولت کی تقسیم کے حوالے سے ہیں اور اسی طرح ملک کی غربت کے مسئلے کے حل حوالے سے بھی دلائل وارد ہوئے ہیں یعنی مال کی پیداوار و نشوونما کے متعلق۔ ان دونوں امور کی دلائل کو باریک بینی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی غربت، ملکیت کی اباحت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے دلائل کثیر اور متنوع ہیں جس سے اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ یہ دلائل اصل مسئلے کے حل سے متعلق ہیں نہ کہ کسی فروعی مسئلے کے متعلق۔ چنانچہ غربت یعنی دولت کی غلط تقسیم اور اس کے حل کے حوالے سے جتنی آیات اور احادیث ہیں وہ بہت زیادہ ہیں، اسی طرح ملکیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے مباح ہونے کے بارے میں دلائل بھی کثیر ہیں۔ یہ تو ایک پہلو سے ہوا۔

جب کہ دوسرے پہلو سے، جس مسئلے کو شرع نے حل کیا ہے وہ دولت کو جمع کرنا، ہے جو کہ معیشت کی اصل الاصول ہے اور اسی سے تمام فروعی اقتصادی مسائل جنم لیتے ہیں نتیجتاً معلوم ہوا بنیادی مسئلہ دولت کی تقسیم کا ہے کیونکہ غربت، ملکیت کی اباحت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے مباح ہونے کے دلائل بے شمار ہیں اور اس مسئلے کو اصولی اور بنیادی مسئلے کے طور پر حل کرتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم کا مسئلہ ہی اصل اور بنیادی مسئلہ ہے اسی سے دوسرے فروعی مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ملک کی غربت کے دلائل، بالفاظ دیگر پیداوار کے متعلق دلائل محدود ہیں اور ضمنی طور پر پیداوار کے مسئلے کو حل کرتے ہیں، اور براہ راست پیداوار کو موضوع نہیں بناتے۔ پیداوار سے متعلق براہِ راست کوئی خاص دلائل نہیں ہیں۔ کچھ احکام شرعیہ ہیں جو ملکی دولت میں اضافے کا تقاضا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ضمناً پیداوار کے مسئلے کو حل کرتی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ "تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو"** (الانفال: 60)۔ یہ آیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ریاست کے پاس دولت ہو اور اس دولت کو حاصل کرنے کا عمل بھی لازمی ہے۔ اس طرح رعایا کے لیے امن و امان کا قیام، ان کے مفادات کی نگرانی، جیسے سڑکیں تعمیر کرنا، پانی مہیا کرنا، تعلیمی ادارے اور مساجد بنوانا، علاج معالجے اور تعلیم کی سہولیات فراہم کرنا، حادثات اور ہنگامی صورت حال جیسے زلزلہ، طوفان اور رعایا کی ناگزیر ذمہ داریوں وغیرہ کی صورت میں مال و دولت کی ضرورت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سرمایہ دستیاب ہو اور اس کے حصول کے لیے کام کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح افراد کی غربت جو کہ بنیادی اقتصادی مسئلہ ہے، کو حل کرنے کے لیے بھی سرمائے کا ہونا اور اس کے حصول کے لیے کام کرنا لازمی ہے۔ یہ سارے احکام ان چیزوں کے حل سے متعلق ہیں جو پیداوار کا تقاضا کرتی ہیں، نہ کہ یہ احکام براہِ راست پیداوار سے متعلق ہیں۔ لیکن یہ آیات اس قاعدے کے تحت سرمائے کے حصول کو واجب قرار دیتے ہیں **ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب** کہ **" جس کام پر کسی واجب عمل کی ادائیگی کا دارومدار ہے تو وہ کام بھی واجب ہے"**۔ جہاں تک ان احکامات کا تعلق ہے جو صریحاً دولت کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں وہ انتہائی محدود اور گنے چنے ہیں۔

ارشاد باری ہے: **فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** "**جب نماز ہو چکے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو**"(الجمعۃ:10)۔ اور فرمایا: **فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ** " **پس تم اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اس کے عطا کردہ رزق کھاؤ**"(الملک: 15)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ»** "**تم میں سے کوئی شخص اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھاتا**"۔ اس حدیث کو بخاری نے مقدام کے حوالے سے کیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلاَلاً، اسْتِعْفَافاً عَنِ المَسْأَلَةِ، وَسَعْياً عَلَى أَهْلِهِ، وَتَعَطُّفاً عَلَى جَارِهِ، جَاءَ يَوْمَ القِيَامَةِ وَجْهُهُ كَالقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ»** "**جو حلال طریقے سے مال کمائے اس نیت سے کہ سوال سے بچے گا اور اپنے اہل خانہ پر خرچ کرے گا اور اپنے ہمسایئے پر مہربانی کرے گا تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہو گا**"۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں مکحول سے مرسلاً نقل کیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«طَلَبُ الحَلالِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»** "**حلال مال کمانا ہر مسلمان پر فرض ہے**" ۔ اس حدیث کو طبرانی نے الاوسط میں انسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ہیثمی و منذری نے اس کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ مذکورہ دلائل براہِ راست رزق کے طلب کے بارے میں ہیں یعنی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں ریاست کی غربت کے مسئلے کی تعبیر دیتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی یہ بات ظاہر ہے کہ ان میں افراد کو مخاطب کیا گیا ہے۔ مال کے حصول کی حوصلہ افزائی ان کی انفرادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہے یعنی افلاس کو ختم کرنے یا ملکیت کو بڑھانے یا اس مال سے نفع اٹھانے کے مباح ہونے کے بارے میں ہیں۔ یہ تو ایک پہلو تھا، جبکہ دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ ان دلائل سے براہ راست جس چیز کا علاج کیا گیا ہے یا جس چیز کا یہ تقاضا کرتی ہیں وہ ہے عمل (کام) برائے ملکیت، نہ کہ کام برائے کام۔ یعنی دولت کا حصول اسے جمع کرنے کے لیے نہ کہ صرف پیداوار برائے پیداوار۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے کی وجہ دولت جمع کرنا ہے، اس لیے کام کرنا اصل نہیں۔ اصل دولت جمع کرنا ہے، کام کرنا فروعی چیز ہے یعنی مقصد دولت جمع کرنا ہے نہ کہ کام کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے جتنے

بھی احکامات ہیں ان میں جمع کرنے کیلئے مال کمانے کا حکم ہے۔ اسی طرح احکامات پیداوار سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں وارد ہوئے ہیں یعنی آیت میں مال کمانے کی کوشش کا جو حکم ہے وہ مال کو کھانے کے لیے ہے۔ اسی طرح پہلی حدیث میں کھانے کے لیے مال کمانے کا حکم ہے اور دوسری اور تیسری حدیث میں کمانے کی کوشش کو طلب دنیا اور طلب حلال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سارے احکامات مال کو اکٹھا کرنے کے دلائل ہیں۔ اس تمام بحث سے یہ معلوم ہو گیا کہ پیداوار معیشت کا بنیادی مسئلہ نہیں بلکہ اقتصادی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بنیادی مسئلہ ملکیت کا ہے یعنی مال کا جمع کرنا اور اس مال کو تقسیم کرنا۔

یہ ساری بحث شرعی دلائل کے حوالے سے تھی جہاں تک معاشی زندگی کی حقیقت کا تعلق ہے، تو کسی کو بھی اس بات سے انکار نہیں کہ ہر وہ ملک جس کو معاشی مسائل کا سامنا ہے وہ دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے ہے، پیداوار کی کمی کی وجہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام (Socialism) جس میں سے کمیونزم بھی نکلتا ہے، اس معاشی ظلم کے نتیجے میں ہی اُبھرا جو سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی طرف سے معاشرہ کے اوپر ڈھایا جارہا تھا، یعنی مال کی غلط تقسیم کے نتیجے میں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار بھی اپنے نظام میں جو پیوندکاری کی کوشش کرتے رہتے ہیں اس سب کا تعلق دولت کی تقسیم سے ہے۔ اشتراکی تشریحات کا تعلق بھی صرف اور صرف دولت کی تقسیم سے ہے۔ وہ علاقے جنہیں یہ لوگ پسماندہ علاقے قرار دیتے ہیں، ان کی پسماندگی کی وجہ بھی دولت کی غلط تقسیم ہے، نہ کہ علاقے کی غربت۔ یوں اقتصادی نظام میں بنیادی مسئلہ صرف دولت کی غلط تقسیم ہے پیداوار کی کمی نہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کو ہر انسان چاہے مسلم ہو، اشتراکی ہو یا سرمایہ دار، محسوس کرتا ہے۔ دنیا میں پیداوار اس قدر ہے کہ تمام انسانوں کی ضرورت سے بھی زیادہ ہے، لیکن غلط تقسیم کی وجہ سے کچھ لوگ انتہائی مالدار اور کچھ انتہائی غریب ہیں۔ حتیٰ کے وہ ممالک جو پیداوار کی کمی کا رونا روتے ہیں ان کا بھی بنیادی مسئلہ غلط تقسیم کا ہے، اور پیداوار کا مسئلہ ثانوی ہے۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ بنیادی مسئلہ دولت کی تقسیم کا ہے نہ کہ پیداوار کا۔

دفعہ نمبر 125: تمام افراد کی فرداً فرداً تمام بنیادی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کرنے کی ضمانت دینا لازمی ہے، اس طرح ہر فرد کو یہ ضمانت بھی دی جائے گی کہ ہر فرد ممکن حد تک اعلیٰ معیار زندگی کی ضروریات حاصل کرنے کے قابل ہو سکے۔

یہ دفعہ دو شقوں پر مشتمل ہے :

اول: بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی ضمانت دینا۔

دوم: اعلیٰ معیار زندگی کی ضروریات کو ممکن بنانا۔

پہلی شق کے کئی دلائل ہیں کیونکہ شارع نے مال کمانے، رزق طلب کرنے اور اس کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب دی ہے اور رزق کمانے کو ہر طاقت رکھنے والے ضرورت مند پر اپنی اور اپنے اہلخانہ کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد باری ہے: **فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ** "**پس تم اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اس کے عطا کردہ رزق کھاؤ**"(الملک: 15)۔ اور فرمایا: **فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** "**پھر جب نماز ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ**"(الجمعہ:10)۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا «**كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْماً أَنْ يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوتُ**» "**آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنی روزی ضائع کرے**"۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے نقل کیا ہے اور امام نووی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ انسان کو اپنی تمام بنیادی ضروریات کو اپنی کمائی سے پورا کرنے کی ضمانت دینے کے بارے میں بنیاد (اصل) ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر طاقت رکھنے والے ضرورت مند مرد پر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کام کرنے کو فرض قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کام کی طاقت رکھنے والے پر کام کرنا لازم ہے، اگر وہ کام نہیں کرے گا تو اپنا فرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے اسے سزا ملے گی۔ عورتوں اور ایسے مردوں کا جو کام کرنے کے قابل نہیں، اللہ نے ان کا نفقہ فرض کیا ہے، اور اسے ایک لازمی حق ٹھہرایا ہے، اور ریاست کو شرعی طریقے سے ان

کے نفقہ کا بندوبست کرنے کا پابند کیا ہے۔ پس بیوی کا نفقہ شوہر پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ» "عورتوں کا طعام اور لباس تم پر دستور کے مطابق فرض ہے"**۔ اسی طرح اولاد کا نفقہ باپ پر فرض کر دیا ہے۔ ارشاد باری ہے: **وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ "جس کا بچہ ہے اس پر دودھ پلانے والی عورتوں کا طعام اور لباس فرض ہے دستور کے مطابق"**(البقرہ : 233)۔ رسول اللہ ﷺ نے ہند سے فرمایا جب اس نے ابو سفیان کی بخل کی شکایت کی **«خُذِيْ مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ» "جو تیرے لیے اور تیرے بچے کے لیے کافی ہو، وہ دستور کے مطابق لے لو"**۔ اس طرح ذی رحم محرم رشتہ داروں پر خرچ کرنے کو بھی فرض قرار دیا، فرمایا: **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۗ " وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے"**(البقرہ: 233)۔ اور یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بعد ہے: **وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ "جس کا بچہ ہے اس پر دودھ پلانے والی عورتوں کا طعام اور لباس فرض ہے دستور کے مطابق"**(البقرہ:233)۔ چنانچہ شرع نے بیوی کے لیے مطلقاً نفقہ فرض قرار دیا یعنی اس کے اوپر کمائی کرنا فرض ہی نہیں۔ جبکہ اس مرد کے اوپر نفقہ کو فرض قرار دیا جس کے ذی محرم غریب ہوں اور کمانے کے قابل بھی نہ ہوں۔ اگر ایسا کوئی شخص نہیں کہ جس پر ان کا نفقہ فرض ہے، یا ایسا شخص تو ہے لیکن وہ نفقہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا تب یہ نفقہ حکم کے مطابق بیت المال یعنی ریاست پر فرض کر دیا ہے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ، وَمَنْ تَرَكَ كَلاًّ فَإِلَيْنَا» "جس نے مال چھوڑا تو اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جس نے لاوارث چھوڑا ہو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے"**۔ یہ حدیث ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔ اور اس حدیث میں **" الكَلُّ "** کا جو لفظ ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا نہ باپ ہو اور نہ ہی اولاد، جبکہ دوسری روایت میں ہے **«مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِأَهْلِهِ وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ» "جس نے (مرنے کے بعد) مال چھوڑا تو اس کے اہل و عیال کے لیے ہے اور جس پر قرضہ ہو یا جس کا اہل و عیال ہو ان کی ذمہ داری ہم پر ہے"**۔ اس حدیث کو جابرؓ سے مسلم نے روایت

کیا ہے۔ اس حدیث میں ضیاع کا جو لفظ ہے اس کا مطلب ہے اہل و عیال۔ جیسا کہ القاموس المحیط میں بیان کیا گیا ہے **"والضَّياعُ أيضاً: العِيالُ، أو ضُيَّعُهُم"**۔ چنانچہ ان دلائل کی بنیاد پر محتاج خواہ عورت ہو یا مرد ہو جو کمانے سے عاجز ہو یا اس کی کمائی اس کیلئے ناکافی ہو، شرع اس کی تمام بنیادی ضروریات کی ضمانت دیتی ہے۔ عاجز (محتاج) شریعت کی نظر میں وہ شخص ہے جو یا تو حقیقتاً عاجز ہو (یعنی کام کرنے کے قابل نہ ہو)، یا حکماً عاجز ہو یعنی بے روزگار ہو، ان دونوں صورتوں میں وہ عاجز ہے۔ شریعت نے مذکورہ دلائل کے ذریعے ان عاجزوں کو تمام بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت اس طرح دے دی کہ عورت کا نفقہ تو غیر مشروط طور پر شوہر پر جبکہ مردوں میں وہ شخص جو حقیقتاً یا حکماً عاجز ہے، اس کا نفقہ ذی رحم محرم پر فرض قرار دیا۔ پھر اگر یہ بھی اس فرض کی ادائیگی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو یہ بیت المال یعنی ریاست پر فرض قرار دیا۔

مذکورہ نفقات کی ضمانت دینے کے لیے شرع نے بیت المال کا قیام عمل میں لایا اور اس کے مخصوص ذرائع آمدن مقرر کر دیے۔ پس بیت المال میں ضرورت مندوں کے لیے زکوٰۃ کا شعبہ مختص کیا، ارشاد ہے **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ "صدقات زکوٰۃ، تو فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں"** (التوبۃ: 60)۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد تک کہ **وَابْنِ السَّبِيْلِ "اور مسافروں کے لیے"**۔ اگر زکوٰۃ اس کے لیے کافی نہ ہو تو یہ نفقات بیت المال کے دوسرے ذرائع سے دیئے جائیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ» "اور جو قرض یا اہل و عیال چھوڑ مرے تو اس کی ذمہ داری میری ہے"**۔ اس حدیث کو مسلم نے جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس میں "میری ذمہ داری ہے" کا مطلب ہے کہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ **«الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» "امام (خلیفہ) چرواہا ہے اور وہ اپنے رعایا کا ذمہ دار ہے"**۔ اس حدیث کو بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ رعایا کی ذمہ داریوں میں سے اہم ترین ذمہ داری انہیں بنیادی ضروریات پورا کرنے کی ضمانت دینا ہے، اس لیے یہ خرچ بیت المال کی آمدن میں سے ہونا چاہیے۔ ریاست کے ذمہ فقیر کا نفقہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔ اگر بیت المال کی مستقل آمدن ان نفقات کے لیے کافی نہ

ہو تو حسب ضرورت مالدار مسلمانوں پر ٹیکس لگایا جائے گا جو اس کام کے لیے کافی ہو، اور یہ بھی ان احکام شرعیہ کے مطابق ہو گا جن کی رو سے ایسی حالت میں فقیر کے نفقہ کے واسطے خلیفہ ٹیکس لگا سکتا ہے، کیونکہ جب زکوٰۃ بھی کافی نہ ہو اور بیت المال کے دوسرے ذرائع آمدن بھی اس کام کے لیے ناکافی ہوں تب یہ تمام مسلمانوں پر فرض ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَأَيُّمَا أَهْلُ عَرْصَةٍ أَصْبَحَ فِيهِمْ امْرُؤٌ جَائِعٌ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللَّهِ تَعَالَى»** **"کسی بستی میں کوئی آدمی بھوکا سوئے تو اللہ تعالیٰ اس بستی والوں کی ذمہ داری سے بری ہے"**۔ اس حدیث کو احمد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور احمد شاکر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ ایک خبر ہے لیکن اس میں طلب موجود ہے، یعنی اس حدیث کے مفہوم میں بھوکے کو کھلانے کا مطالبہ موجود ہے۔ نہ کھلانے کی صورت میں مذمت کی گئی ہے یعنی یہ طلب ایک قطعی طلب (طلبِ جازم) ہے یعنی فرض ہے۔ اس لیے خلیفہ صاحب استطاعت لوگوں پر ٹیکس لگا کر اس فرض کو بھی دوسرے فرائض کی طرح ادا کرے گا۔ اس پوری بحث سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گئی کہ شرع تمام افراد کو فرداً فرداً تمام بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی ضمانت دیتی ہے اور ان ذرائع آمدن کا تعین بھی کر دیا گیا ہے جو ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ اسی طرح اس فرض کی ادائیگی دائمی طور پر کرنے کی ضمانت بھی فراہم کر دی ہے۔

یہ تو تھا تمام افراد کی ضروریات کو فرداً فرداً پورا کرنے کے حوالے سے۔ رہی بات ان تمام ضروریات کی جنہیں پورا کرنے کی ضمانت دی گئی کہ وہ کون کون سے ہیں، تو زندگی کی حقیقت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان ہیں اور شرع نے بھی نفقہ کی شکل میں روٹی، کپڑا اور مکان کی ضمانت دی ہے۔ شرعی دلائل وارد ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ روٹی، کپڑا اور مکان ہی بنیادی ضروریات ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ بنیادی ضرورت میں داخل نہیں۔

جہاں تک ان دلائل کی بات ہے کہ نفقہ سے مراد روٹی کپڑا اور مکان ہے، تو ارشاد باری ہے کہ **وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ** **" اور جن مردوں کے بچے ہیں ان کی**

ذمہ ان عورتوں کا روٹی کپڑا ہے"(البقرہ: 233)۔ اور فرمایا: **اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ** " تم اپنی طاقت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو وہاں ان (طلاق والی) عورتوں کو رکھو"(الطلاق :6)۔ اور فرمایا: **مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ** " اوسط درجے کا کھانا جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو"(المائدہ :89)۔ غور فرمائیں اللہ تعالیٰ نے روٹی، کپڑا اور مکان کو ہی نفقہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں یعنی بیویوں کے بارے میں فرمایا **«أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ»** "اور سنو! ان کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ ان کو اچھے کپڑے پہناؤ اور اچھا کھانا کھلاؤ"۔ اس حدیث کو ترمذی نے عمرو بن الاحوص کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ»** " اور ان عورتوں کو روٹی اور کپڑا دستور کے مطابق دینا تم پر فرض ہے"۔ اس حدیث کو مسلم نے جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفقہ سے مراد روٹی، کپڑا اور مکان ہے اور یہ بنیادی ضروریات ہیں۔

رہی یہ بات کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ روٹی کپڑا اور مکان ہی افراد کی بنیادی ضروریات ہیں اور اس کے علاوہ چیزیں اضافی ہیں، تو احمد نے عثمانؓ بن عفان کے حوالے سے یہ حدیث روایت کی جس کی سند کو احمد شاکر نے صحیح قرار دیا، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«كُلُّ شَيْءٍ سِوَى ظِلِّ بَيْتٍ، وَجِلْفِ الْخُبْزِ، وَثَوْبٍ يُوَارِي عَوْرَتَهُ، وَالْمَاءِ، فَمَا فَضَلَ عَنْ هَذَا فَلَيْسَ لابْنِ آدَمَ فِيهِ حَقٌّ»** " سر چھپانے کے لیے گھر، پیٹ کے لیے روٹی، جسم کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور پانی یہی سب کچھ ہے جس میں ابن آدم کا حق ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس میں ابن آدم کا کوئی حق نہیں" یہی حدیث دوسرے الفاظ میں بھی وارد ہے: **«لَيْسَ لابْنِ آدَمَ حَقٌّ فِي سِوَى هَذِهِ الْخِصَالِ: بَيْتٌ يَسْكُنُهُ، وَثَوْبٌ يُوَارِي عَوْرَتَهُ، وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَاءِ»** :"ان چیزوں کے علاوہ کسی چیز پر ابن آدم کا حق نہیں، رہنے کے لیے گھر، ستر چھپانے کے لیے کپڑا، بھوک مٹانے کے لیے روٹی اور پانی" اس کو ترمذی نے نقل

کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے۔ اس حدیث میں جس چیز کا ذکر ہے وہ روٹی، کپڑا اور مکان ہی ہے **«ظِلُّ بَيْتٍ»** **" سر چھپانے کے لیے گھر** **«بَيْتٌ يَسْكُنُهُ»** **رہائش کے لیے گھر** **«ثَوْبٌ يُوارِي عَوْرَتَهُ»** **" ستر چھپانے کے لیے کپڑا"** **«جِلَفُ الخُبْزِ وَالْمَاءِ»** **" بھوک مٹانے کے لیے روٹی اور پانی"** یعنی یہ چیزیں کافی ہیں، اور ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری اشیاء بنیادی ضروریات میں داخل نہیں، حدیث کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے **«فَمَا فَضَلَ عَنْ هَذَا فَلَيْسَ لابْنِ آدَمَ فِيهِ حَقٌّ»** **" یعنی جو ان کے علاوہ ہے اس میں اولاد آدم کا کوئی حق نہیں"**۔ یہ دونوں حدیث اس بات کے لیے نص ہیں کہ بنیادی ضروریات "Basic Need" روٹی کپڑا اور مکان ہیں اس کے علاوہ چیزیں بنیادی ضروریات میں داخل نہیں، ان تین چیزوں کی فراہمی سے افراد کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔

رہی یہ بات کہ بنیادی ضروریات کو پورا کرنا مکمل طور پر ہونا چاہیے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ مذکورہ تمام دلائل میں دستور کے مطابق کافی ہونے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں **بِالْمَعْرُوْفِ" دستور کے مطابق"** اور اس قول میں بھی کہ **وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ " اور جن کے بچے ہیں، ان کے ذمہ ان عورتوں کا روٹی کپڑا ہے جو دستور کے مطابق ہو"**۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی" **«بِالْمَعْرُوفِ»** " یعنی دستور کا لفظ استعمال کیا، جیسا کہ فرمایا **«وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ»** **" اور ان کا حق تمہارے اوپر دستور کے مطابق روٹی اور کپڑا ہے"**۔ اور آپ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ھند سے فرمایا کہ **«مَا يَكْفِيكِ»** **" جو تمہارے لیے کافی ہو"** ساتھ ہی فرمایا **«بِالْمَعْرُوفِ»** **" دستور کے مطابق"** ھند سے یوں فرمایا: **«خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ»** **" اتنا لے لو جتنا دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچے کے لیے کافی ہو"**۔ عائشہؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے، یہ بقدر کفایہ کے بارے میں نص ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ضروریات کو پورا کرنا مکمل طور پر ہو یعنی تمام بنیادی ضروریات کو لوگوں کے درمیان رائج دستور کے مطابق پورا کیا جائے۔ پس اس میں کافی ہونے کی شرط عائد کی گئی ہے یعنی کھانے سے پیٹ بھرے، کپڑے سے جسم ڈھکے اور گھر رہنے کے

قابل ہو۔ اور کافی ہونے کے ساتھ ساتھ دستور کے مطابق ہونا بھی شرط ہے، مراد یہ ہے کہ کافی ہونا انتہائی کم درجے کا نہ ہو بلکہ علاقے میں موجود عام دستور "رواج" کے مطابق ہو۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ضروریات کو پورا کرنا مکمل انداز سے ہونا چاہیے اور یہ سب دفعہ کے پہلی شق کی دلیل ہے۔

شرعی دلائل نے صرف افراد کی بنیادی ضروریات کو فرداً فرداً پورا کرنے کو ہی فرض قرار نہیں دیا بلکہ امت کی بنیادی ضروریات یعنی امن وامان، رعایا کے علاج معالجے اور تعلیم کو بھی فرض قرار دیا ہے۔

جہاں تک امن و امان کا تعلق ہے تو رعایا کے لیے امن و امان کو قائم رکھنا ریاست کی اولین فرائض میں سے ہے، اگر امن و امان کو برقرار نہ رکھ سکے تو ریاست کا وجود ہی مٹ جائے گا، اس لیے کہ یہ دارالاسلام کی شرط ہے کہ وہ صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر امن و امان کی حفاظت پر قادر ہو، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مسلمانوں کو دارالہجرت کی خبر دی، سب سے پہلے امن و امان کا ذکر فرمایا، ارشاد فرمایا **«إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ جَعَلَ لَكُمْ إِخْوَاناً وَدَاراً تَأْمَنُونَ بِهَا» "اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسے بھائی اور ایسا گھر (دار) دیا جہاں تم امن سے رہو گے"**۔ اسی طرح جب انصار نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابی ابو بکرؓ کا استقبال کیا، تو سب سے پہلے امن سے رہنے کی بات کی۔ چنانچہ احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ انسؓ سے روایت کیا ہے کہ **«فَاسْتَقْبَلَهُمَا زُهَاءُ خَمْسِمائةٍ مِنَ الأَنْصَارِ حتى انْتَهَوْا إِلَيْهِمَا. فقالت الأنصارُ: انْطَلِقَا آمِنَيْنِ مُطَاعَيْنِ» "انصار میں سے پانچ سو شرفاء آپ دونوں کے استقبال کے لیے نکلے، جب ان کے پاس پہنچے تو انصار نے کہا، تشریف لائیے آپ کے لیے امن ہے اور آپ کی اطاعت کی جائے گی"**۔ یوں رعایا کیلئے امن وامان کی فراہمی ریاست کی بنیادی فرائض میں سے ہے۔

رعایا کے لیے صحت اور علاج معالجے کی ضروریات کو فراہم کرنا بھی ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ ڈسپنسریاں اور ہسپتالیں وہ سہولیات ہیں جن سے مسلمان ادویات اور علاج معالجے کے سلسلے میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یوں میڈیکل بھی مفادات اور ضروریات میں داخل ہے۔ ان مفادات اور ضروریات کی فراہمی ریاست کے فرائض میں سے ہے، کیونکہ ان چیزوں کی رعایت کرنا گویا رسول اللہ ﷺ کے اس قول پر عمل

کرنا ہے کہ **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» " امام (خلیفہ) چرواہا (نگران) ہے اور اس سے اس کے رعایا کے بارے میں باز پرس ہو گی"**، اس حدیث کو بخاریؒ نے عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے یہ حدیث صحت اور علاج معالجے کی ریاست کی ذمہ داری ہونے کے بارے میں ایک عام نص ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی رعایا کی نگہبانی کے زمرے میں آتی ہیں۔

صحت اور علاج معالجے کے حوالے سے خاص دلائل بھی ہیں۔ مسلم نے جابرؓ کے واسطے سے روایت کی ہے کہ **«بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ طَبِيبًا فَقَطَعَ مِنْهُ عِرْقًا ثُمَّ كَوَاهُ عَلَيْهِ» "رسول اللہ ﷺ نے ابیؓ بن کعب کے پاس ایک طبیب (ڈاکٹر) بھیجا جس نے آپؓ کے ایک رگ کو کاٹا اور پھر اسے بند کر دیا" "یعنی پچھنا لگایا"**۔ اور حاکم نے مستدرک میں زید بن اسلم سے ان کے والد یعنی اسلم کے بارے میں روایت کیا ہے کہ **«مَرِضْتُ فِي زَمَانِ عُمَرَ بِنَ الْخَطَّابِ مَرَضاً شَدِيداً فَدَعَا لِي عُمَرُ طَبِيباً فَحَمَانِي حَتَّى كُنْتُ أَمُصُّ النَّوَاةَ مِنْ شِدَّةِ الْحِمْيَةِ» " عمر بن خطابؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک دفعہ میں انتہائی سخت بیمار ہو گیا تو عمر بن خطابؓ نے میرے لیے طبیب (ڈاکٹر) بلایا جس نے مجھے کھانا کھانے سے روک دیا یہاں تک کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے میں گٹھلی چوسنے لگا"**۔

رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت حکمران ڈاکٹر کا انتظام کیا اور اسی طرح عمر بن خطابؓ نے بھی، جو کہ دوسرے خلیفہ راشد ہیں، بحیثیت حکمران اسلم کے علاج کا بندوبست کیا، یہ دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ صحت اور علاج بھی رعایا کے بنیادی ضروریات میں سے ہیں۔ ریاست کے اوپر واجب ہے کہ وہ رعایا میں سے ضرورت مند کو یہ سہولت مفت فراہم کرے۔

جہاں تک تعلیم کا سوال ہے تو رسول اللہ ﷺ نے کفار کے جنگی قیدیوں کا فدیہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا مقرر کیا حالانکہ یہ مال غنیمت کے متبادل کے طور پر تھا جو کہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس

طرح معلمین کو بیت المال سے مقررہ مقدار میں اجرت دینے پر صحابہؓ کا اجماع بھی اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ریاست پر واجب ہے کہ وہ تمام رعایا کو امن، علاج اور تعلیم کی سہولت فراہم کرے۔ اس کی ضمانت دینا بیت المال کا کام ہے اور اس میں مسلمان یا ذمی مالدار یا غریب کے درمیان فرق نہیں ہے۔

فرد اور امت کے لیے بنیادی ضروریات کی اہمیت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان بنیادی ضروریات کا حصول ایسا ہے جیسا پوری دنیا کو حاصل کرنا۔ یہ کنایہ ہے ان بنیادی ضروریات کی اہمیت کے حوالے سے، چنانچہ ترمذی نے مسلمہ بن عبید اللہ بن محصن الانصاری سے ان کے والد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ، مُعَافًى فِي جَسَدِهِ، عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ، فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا» "تم میں سے جس کا راستہ پر امن ہو، جسم تندرست ہو اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو یہ اس کے لیے ایسا ہے جیسا کہ اس کے پاس دنیا کی دولت ہے"** ابو عیسیٰ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اسی طرح ابن ماجہؒ نے بھی اس کو حسن اسناد سے روایت کیا ہے اور ابو نعیم نے الحلیۃ میں اسے ابو الدرداءؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے، لیکن اس میں حذافیر کا لفظ زیادہ ہے یعنی **«حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيرِهَا» : " دنیا کے سارے خزانے اس کے قبضے میں دیئے گئے"**۔ یوں یہ تمام شرعی دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ رعایا کے تمام افراد کو فرداً فرداً تمام بنیادی ضروریات، یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی ضمانت دینا، اس طرح تمام بنیادی خدمات، یعنی امن، صحت اور تعلیم کی ضمانت دینا ریاست کا فرض ہے۔

اب دوسری شق کی طرف آتے ہیں جو کہ اعلیٰ معیار زندگی کی ضروریات کے حوالے سے ہے۔ تو کام کرنے کے قابل مرد پر کام کو فرض قرار دینا جس طرح اس بات کی دلیل ہے کہ بنیادی ضروریات کی فراہمی فرض ہے، بالکل اسی طرح اعلیٰ معیار زندگی کی ضروریات کی فراہمی کی بھی دلیل ہے، کیونکہ اس میں مطلق کمائی کرنے کی ترغیب ہے صرف بنیادی ضروریات کو پورا کرنے تک بات کو محدود نہیں کیا گیا ہے۔ یہ اس بات

کی دلیل ہے کہ شرع نے کمائی کے ذریعے اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس طرح حلال چیزوں سے فائدہ اٹھانے کو مباح قرار دے کر بھی اعلیٰ معیار زندگی کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ** ﷺ **"ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ"**(البقرۃ:57)۔ اور فرمایا **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ** ؕ **" آپ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے اسباب زینت کو، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو، کس شخص نے حرام کیا ہے؟"**(الاعراف:32)اور فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ** **"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں انہیں حرام مت کرو"**(المائدہ: 87)۔ اور فرمایا؛ **لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ** ﷺ **"کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے"**(الطلاق: 7)اور فرمایا: **وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا** ﷺ **"اور اپنے دنیاوی حصے کو بھی نہ بھول"**(القصص: 77)۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ شرع نے ہر فرد کے لیے اپنی معیار زندگی کو بہتر بنانے کو مباح قرار دیا۔ اس کے علاوہ بخل اور کنجوسی سے منع کیا گیا ہے اور حلال اشیاء سے فائدہ اٹھانے سے منع کرنے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شرع نے انسان کے لیے اپنی معیار زندگی کو بلندی کرنے کو مباح قرار دیا ہے۔ یہ تھیں دفعہ کی دوسری شق کی دلائل۔

دفعہ 126: مال صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اسی نے بنی نوع انسان کو اس مال میں اپنا جانشین بنایا ہے اور اسی عمومی جانشینی کی وجہ سے انسان کو ملکیت کا حق حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے فرد کو اس مال کا مالک بننے کی اجازت دی ہے، اسی خاص اجازت کی وجہ سے انسان بالفعل (عملی طور پر) مال کا مالک بن گیا۔

اس دفعہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ** ؕ **"اور اللہ تعالیٰ نے جو مال تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں بھی دو"**(النور: 33)۔ مال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

ذات کی طرف منسوب فرمایا۔ اسی طرح ارشاد ہے **وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ** " اور **تمہیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا**"(نوح:12)۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مال میں ترقی دینے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ** **"اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے"**(الحدید: 7)۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مال میں اپنا خلیفہ، جانشین بنایا۔ مال میں بھی اصل (قاعدہ) اللہ تعالیٰ کا اذن (اجازت) ہے۔ مال کا حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس نے انسان کو جانشین بنا کر ملکیت کا حق عطا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر بیان کردہ استخلاف والی آیت انفرادی ملکیت کی دلیل نہیں، بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے انسان کو مال کا مالک بننے کا حق ہے، اور جہاں تک فرد کی ملکیت کا تعلق ہے یعنی اس کا عملاً مال کما کر اس کا مالک بننا، تو اس کی دلیل الگ ہے، یہ وہ سبب ہے جس نے انسان کے بالفعل مالک بننے کو مباح قرار دیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ»** **"جس شخص نے کسی بنجر زمین کے ارد گرد دیوار کھڑی کر دی تو وہ اس زمین کا مالک بن گیا"**۔ اس حدیث کو احمد اور ابو داؤد نے ایسے اسانید سے روایت کی ہے جنہیں ابن الجارود اور الزّین نے صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ایک اور قول ہے کہ **«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ»** " **جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے**"۔ اس حدیث کی تخریج بخاری نے عمرؓ سے تعلیقًا (معلق اسناد کے ساتھ) کی ہے، جبکہ احمد اور ترمذی نے اس حدیث کو صحیح اسناد کے ساتھ جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **لِّلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ** **"ماں باپ اور اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی"**(النساء: 7)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ** **"تمہارے لیے پانی کا شکار حلال کر دیا گیا ہے"**(المائدہ: 96)۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک نصوص ہیں۔ یوں ہر انسان کے لیے اس چیز کی ملکیت جائز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور بالفعل ملکیت (عملی ملکیت) بھی شارع (اللہ تعالیٰ) کی

اجازت کی محتاج ہے کہ ملکیت کی کیفیت کیسی ہو کہ جس مال کا انسان مالک بننا چاہتا ہے۔ یعنی اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ شرع اسے مباح قرار دے، یوں اس دفعہ کے اندر تین باتیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ہر چیز کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کی دلیل سورۃ النور کی یہ آیت ہے: **وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ** "**اور اللہ کے مال میں سے انہیں دے دو**"(النور:33)۔

دوم: انسان کو مال کی ملکیت کا حق حاصل ہے اور اس کی دلیل استخلاف والی آیت ہے **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ** "**اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے**"(الحدید: 7)۔

سوم : بالفعل کسی چیز کے مالک بننے کے لیے شارع کی اجازت کی ضرورت ہے یعنی ایسی دلیل کی ضرورت ہے جو اس چیز کی ملکیت کو جائز قرار دے دے۔ اس کے دلائل وہ نصوص ہیں جو بالفعل مالک بننے کو مباح قرار دیتی ہیں یوں اس دفعہ کی دلیل بھی واضح ہو گئی۔

دفعہ نمبر 127: ملکیت کی تین قسمیں ہیں: انفرادی ملکیت، عوامی ملکیت اور ریاستی ملکیت

ہر ایک ملکیت کی تعریف کی دلیل کتاب و سنت سے اخذ کی گئی ہے۔ اس طرح تمام اقسام کی ملکیت کی چھان بین بھی شرعی دلائل سے ہی مُستنبط ہے۔ ملکیت اور اس کی تعریف کے بارے میں موجود تمام شرعی دلائل کی تحقیق اور چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے ملکیت انہی تین اقسام میں محصور ہے کہ جن کا اس دفعہ میں ذکر کیا گیا۔

دفعہ نمبر128: انفرادی ملکیت عین (اصل) یا منفعت (فائدہ) کے بارے میں وہ حکم شرعی ہے جو مالک کو اس چیز سے نفع اُٹھانے یا اس کے عوض (متبادل) کسی دوسری چیز کے لینے کا اختیار دیتا ہے۔

اس دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ شرعی دلائل نے انفرادی ملکیت کی اس طرح تعریف کر دی کہ وہ عین (اصل) سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں شارع کی اجازت ہے، یوں فائدہ اٹھانے کے بارے میں شارع کی اجازت بھی اس میں شامل ہے اور ہر فائدہ اٹھانے کے لئے ایک دلیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ فائدہ اٹھانا بندے کا فعل ہے تو بندے کے فعل کے بارے میں شارع (اللہ تعالیٰ) کا خطاب ضروری ہے۔ اس اجازت میں عین (اصل) بھی اس میں شامل ہے کہ اس عین سے فائدہ اٹھائے یا نہیں، لیکن فائدے کے برعکس ہر عین کے لیے الگ دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ ہر عین میں قاعدہ یہ ہے کہ ایک عام دلیل سے اس کے مالک بننے کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشاد ہے: **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** ''**اور زمین و آسمان کی ہر چیز کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے**'' (الجاثیۃ: 13)۔ اس لیے کسی عین کی ملکیت سے روکنے کے لیے نص کی ضرورت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کسی معین چیز سے فائدہ اٹھانے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ فائدہ اٹھانا فعل ہے، اگر اس عین (اصل) کی ملکیت ممنوع کر دینے والی کوئی دلیل بھی موجود نہ ہو۔ کیونکہ تمام اشیاء کے انسان کے لیے مباح ہونے کے دلائل اس چیز کو حاصل کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ اسی سے ملکیت کی تعریف نکلتی ہے کہ وہ عین سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں شارع کی اجازت ہے۔ اس دفعہ میں مذکور تعریف کا معنی بھی یہی ہے کہ عین سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں شارع کی اجازت، جیسا کہ روٹی کی ملکیت، تو مثال کے طور پر یوں کہا جائے گا کہ روٹی عین ہے، اس کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ شارع نے انسان کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، خواہ یہ فائدہ اٹھانا خود استعمال کرنے کی شکل میں ہو، اس سے نفع حاصل کرنے کی شکل میں ہو یا اس کے بدل (متبادل) کی شکل میں ہو۔ یہ وہ فائدہ ہے جو اس روٹی کا مالک، اس روٹی سے اٹھا سکتا ہے جس کی شرع نے اجازت دی ہے، یعنی وہ اسے کھائے، اسے فروخت کرے یا اس کے بدل کچھ حاصل کرے۔ پس حکم شرعی کا تعلق عین یعنی روٹی سے ہے یعنی اس کو استعمال کرنے یا تبدیل

کرنے کی اجازت ہے۔ دفعہ میں موجود مذکورہ تعریف کی یہی حقیقت ہے یعنی عین (اصل) سے فائدہ اٹھانے کی شارع کی اجازت، اس بنیاد پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر129: عوامی ملکیت سے مراد عوام کو مشترکہ طور پر کسی عین سے فائدہ اٹھانے کی شرع کی طرف سے اجازت ہے۔

اس دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ شرعی دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عوامی ملکیت کی تعریف یہ ہے کہ یہ شارع کی جانب سے عوام کو مشترکہ طور پر کسی عین سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔ اس تعریف (definition) کے دلائل وہ نصوص ہیں جو اس (عوامی ملکیت) حوالے سے وارد ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **«الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ: الْمَاءِ وَالْكَلإِ وَالنَّارِ» "مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی، چراگاہیں اور آگ پیدا کرنے والی چیزیں"**۔ اس حدیث کو احمد نے ایک صحابی سے نقل کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ (قابل بھروسہ) ہیں۔ اس طرح ترمذی نے ابیض ابن حمال سے نقل کیا ہے کہ **«أنه وفد إلى رسول الله ﷺ فاستقطعه الملح، فقطع له. فلما أن ولّى قال رجل من المجلس: أتدري ما قطعت له؟ إنما قطعت له الماء العد. قال فانتزعه منه» "انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر نمک کی کان (نمک کی پہاڑی) طلب کی، آپ ﷺ نے انہیں دے دی۔ جب وہ واپس گئے، تو مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو کیا دیا؟ آپ ﷺ نے تو اس کو ماء العد دے دیا، آپ ﷺ نے فرمایا واپس لے لو"**۔ اور ماء العد وہ ہوتا ہے جو مسلسل جاری ہو، یعنی آپ ﷺ نے انہیں نہ ختم ہونے والا معدن دے دیا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ **«مِنًى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ» "منیٰ میں جو پہلے پہنچے (اونٹ باندھے) اس کا حق ہے"**۔ ترمذی نے اس حدیث کو عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔ منیٰ حجاز میں ایک معروف جگہ ہے جہاں حجاج کرام وقوف عرفہ کے بعد آکر ٹھہرتے ہیں، جہاں جو پہلے پہنچتا تھا وہ اپنا اونٹ باندھ

لیتا تھا آپ ﷺ نے اسے بر قرار رکھا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے عوامی راستوں کی شرکت کو بھی بر قرار رکھا۔

یہ تمام نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شارع نے ان اعیان (جمع عین) میں شرکت کی اجازت دی ہے، جس سے عوامی ملکیت کی تعریف مستنبط (اخذ) ہوئی، اس بنیاد پر مذکورہ دفعہ کو وضع کیا گیا۔

دفعہ نمبر 130: ہر وہ مال جسے خرچ کرنا خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے وہ ریاست کی ملکیت سمجھی جائے گی مثلاً ٹیکس، خراج اور جزیہ۔

اس کی دلیل وہ شرعی دلائل ہیں جو ریاست کی ملکیت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ شارع کی طرف سے خلیفہ کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق مال خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مال فئے کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق خرچ کیا، اسی طرح جزیہ کے مال کو اور مختلف علاقوں سے آنے والے خراج کے مال کو بھی اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق خرچ کیا، کیونکہ ان اموال کے بارے میں نص آئی ہے جس میں ان اموال کے خرچ کو رسول اللہ ﷺ کے صوابدید پر چھوڑا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ امام کو ان اموال کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق خرچ کرنے کا اختیار ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فعل شرعی دلیل ہے، اس لیے امام (خلیفہ) کو ان اموال کو اپنی رائے اور اجتہاد سے خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ تو یہ ریاستی ملکیت کی تعریف ہے۔

پس زکوٰۃ کے اموال ریاست کی ملکیت میں داخل نہیں کیونکہ زکوٰۃ کے اموال کو خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر نہیں چھوڑا گیا ہے، بلکہ شارع نے اس کے مصارف بیان کر دیے ہیں، ریاست انہی مصارف میں ان اموال کو خرچ کرنے کی نگران ہے، خلیفہ اپنی رائے یا اجتہاد سے اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔

اس لیے جس مال کے بارے میں شرعی نص خلیفہ کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق تصرف کی اجازت دیتی ہے وہی مال ریاست کی ملکیت سمجھا جائے گا اور یہ شرعی نص خلیفہ کے لیے اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق مسلمانوں کے فائدے کے لیے اموال کو خرچ کرنے کی اجازت ہو گی۔ اس وجہ سے فئے، خراج اور جزیہ یا اس سے ملتے جلتے دوسرے جائز ٹیکس سب ریاست کی ملکیت ہوں گے، اور ان اموال کے اندر ریاست کی آمدنی بھی داخل ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ کے فعل سے مستنبط (اخذ کردہ) تعریف اور وہ نصوص جو ان اموال کو خرچ کرنے کا حکم دیتی ہیں ان کی عمومیت، اس حقیقت پر منطبق (apply) ہوتی ہیں، اور اسی بنیاد پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا ہے۔

یہ تھیں ملکیت کی ہر قسم کی تعریفیں اور یہ تھے وہ دلائل جن سے ان تعریفات کو مستنبط کیا گیا ہے۔ ملکیت کی ان تعریفوں کو باریک بینی سے دیکھنے سے اور ان نصوص کی چھان بین سے کہ جن سے یہ تعریف اخذ کی گئی ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ملکیت کی یہی تین قسمیں ہیں۔ اور وہ ہیں: انفرادی ملکیت، عوامی ملکیت اور ریاست کی ملکیت۔ جہاں تک زکوٰۃ کے اموال کا تعلق ہے تو وہ کسی معین شخص کی ملکیت نہیں بلکہ کچھ متعین جہات (مصارف) کی ملکیت ہیں۔ لیکن یہ انفرادی ملکیت اس معنی میں ہو گی کہ شارع نے ان مصارف (فقراء، مساکین وغیرہ) کو اس کی ملکیت کی اجازت دی ہے خواہ زکوٰۃ دینے والا کوئی شخص ہو یا خلیفہ، اس لیے یہ ملکیت کی چوتھی قسم نہیں ہے۔ چنانچہ ملکیت کی قسمیں تین ہی ہیں۔ اس تمام تر بیان سے دفعہ نمبر 127 کی شرعی دلیل تفصیلی طور پر سامنے آجاتی ہے، جس میں ملکیت کی قسموں کا بیان ہے۔

دفعہ نمبر 131: اموالِ منقولہ اور غیر منقولہ دونوں کی انفرادی ملکیت کے مندرجہ ذیل پانچ شرعی اسباب ہیں:

ا) عمل (کام کاج یا تجارت وغیرہ)

ب) میراث

ج) جان بچانے کے لیے مال کی ضرورت

د) ریاست کا اپنا مال عوام کو عطا کرنا۔

ھ) وہ اموال جو افراد کو بغیر بدل کے (مفت میں) یا بغیر جدوجہد کے حاصل ہو۔

ملکیت کے حصول کے لیے ایسے اسباب کا ہونا لازمی ہے جن کی شارع نے اجازت دی ہو۔ اس لئے جب شرعی سبب پایا جائے گا تو مال کی ملکیت بھی پائی جائے گی۔ جب تک شرعی سبب نہیں ہو گا مال کی ملکیت بھی ثابت نہیں ہو گی، اگرچہ وہ مال عملاً کسی کے قبضے میں ہی ہو۔ کیونکہ ملکیت ایسے شرعی سبب سے مال کو حاصل کرنا ہے جس کی شارع نے اجازت دی ہو۔ شرع نے ملکیت کے اسباب کو متعین طریقوں کے ساتھ محدود کر دیا ہے، اور انہیں مخصوص تعداد میں بیان کیا اور مطلق نہیں چھوڑا۔ ان کے لیے ایک ایسے واضح وسیع اصول وضع کیے کہ جس کے تحت متعدد جزئیات اور فروعات آ گئیں اور اس کے احکام کے تمام مسائل بھی اس کے ماتحت آ گئے۔ شرع نے ملکیت کے لئے کلی علت مقرر نہیں کی کہ جس پر دوسرے کلیات کو قیاس کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوع بحث نئے حالات میں نئے اموال ہیں نہ کہ معاملات یا تعلقات کا نظام، بلکہ یہ تعلقات کے نظام کے موضوع کے ماتحت ہے۔ اس لیے معاملات کو متعین (خاص) حالات میں محدود کرنا لازمی ہے جو نئے اور متعدد حاجات پر منطبق ہو یعنی مال کے اوپر بحیثیت مال کے اور محنت کے اوپر بحیثیت محنت کے۔ انفرادی ملکیت کو اس طرح محدود کرنا فطرت کے بھی مطابق ہے اور ملکیت کو اس طرح منظم کرتا ہے جس سے معاشرہ اس تباہی سے بچ جاتا ہے جو اس کو آزاد چھوڑنے کی صورت میں معاشرے میں رونما ہوتی ہے۔

یہ دفعہ ملکیت کے شرعی اسباب یعنی ان حالات کو بیان کرتی ہے جن حالات میں شارع نے عین سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ ملکیت کے بالفعل اسباب ہیں نہ کہ اس ملکیت کی نشوونما کے۔ شارع نے ملکیت کے اسباب یعنی اصل مال پر قبضہ کے اسباب بیان کر دئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ

یہ وہ اسباب ہیں جن سے ایک شخص اس مال کا مالک بن جاتا ہے جس کا وہ پہلے مالک نہیں تھا۔ اسی طرح شرع نے اس مال کی نشوونما کے اسباب کو بھی بیان کیا ہے جس کا وہ مالک بن گیا ہے۔ پس شارع نے ان تمام احکامات کو بیان کر دیا کہ جس سے ملکیت حاصل ہوتی ہے اور جس سے اس ملکیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ مال کی فروخت اور کرایہ پر دینے کے عقود کے احکامات کا تعلق مال یعنی ملکیت کی نشوونما سے ہے، جبکہ کام جیسے شکار اور مضاربہ کا تعلق ملکیت کے حصول کے احکامات سے ہے۔ اس دفعہ میں ملکیت کے اسباب کو بیان کیا گیا ہے نہ کہ اس ملکیت کی نشوونما کے احکامات کو۔

اس دفعہ کی دلیل وہ دلائل ہیں جن میں شارع کی طرف سے عین سے فائدہ اٹھانے کی اجازت کا بیان ہے یعنی بالفعل ملکیت کے دلائل۔ ان تمام دلائل کی چھان بین سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ملکیت کے پانچ ہی اسباب ہیں۔ ملکیت کے تمام اسباب ان پانچوں میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت آتے ہیں اب آگے ان پانچ اسباب کی دلائل کا بیان ہے:

پہلا سبب یعنی عمل (کام وغیرہ)۔ اس کے دلائل وہ حالات ہیں جن میں ایک فرد بالفعل مال پر قبضہ کرتا ہے یعنی وہ کام یا عمل جس کو انجام دے کر مال حاصل ہوتا ہے۔ یہ سات صورتیں ہیں: اول: بنجر زمین کو آباد کرنا اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے **«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ» "جس نے بنجر زمین کو آباد کیا تو وہ اس زمین کا مالک ہے"**۔ اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے صحیح اسناد سے نقل کیا ہے، اسی طرح بخاری نے بھی عمرؓ کے حوالے سے اسے معلق اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ عَمَّرَ أَرْضًا لَيْسَتْ لأَحَدٍ فَهُوَ أَحَقُّ» "جس نے ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی اور کی نہ ہو تو وہ اس کا حقدار ہے"**، اس حدیث کو بخاری نے عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ» " جس نے کسی زمین کے گرد چار دیواری بنائی وہ زمین اسی کی ہے"**۔ اس حدیث کو احمد اور ابو داؤد نے ایسی اسناد سے روایت کیا ہے جن کو ابن الجارود اور الزّین نے صحیح قرار دیا ہے۔ بنجر یا مردہ زمین سے مراد وہ زمین ہے جو کسی کی ملکیت نہ ہو یعنی ایسی کوئی چیز نہ ہو جس سے ظاہر

ہو تا ہو کہ یہ کسی کی ہے جیسے چار دیواری، کھیتی باڑی یا کسی عمارت کے آثار وغیرہ۔ اس طرح اس کی آباد کاری یہ ہے کہ اس میں کوئی عمارت بنائی جائے، کاشت کی جائے یا درخت وغیرہ لگائے جائیں، اس طرح اس زمین میں کوئی ایسی چیز رکھنا بھی قبضہ سمجھا جائے گا جس سے ملکیت ظاہر ہو، جیسے اس کے گرد کوئی رسی وغیرہ باندھنا، دیوار کھڑی کرنا یا ڈنڈے وغیرہ لگا دینا۔

یوں ریاست کا ہر شہری کوئی بنجر زمین آباد کر کے شرعی احکامات کے موافق اس کا مالک بن سکتا ہے، چاہے یہ آباد کار مسلمان ہو یا اہل ذمہ (ریاست کے غیر مسلم شہری) میں سے ہو کیونکہ مذکورہ نصوص عام ہیں جو رعایہ کے تمام افراد کے لیے ہیں۔

دوم: شکار، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا** "**ہاں جب تم احرام کھولو تو شکار کھیل سکتے ہو**"(المائدہ: 2)۔ اسی طرح فرمایا **اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ** "**تمہارے لیے دریا کا شکار حلال کیا گیا ہے**"(المائدہ: 96)۔ یوں شکار کردہ جانور اس شخص کی ملکیت ہے جس نے احکام شرعیہ کے مطابق شکار کھیلا ہے۔

سوم: دلالی کرنا اور بولی لگوانا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قیس بن ابی غرزہؓ الکنانی نے کہا کہ: ہم مدینہ میں بولی لگواتے تھے اور اپنے آپ کو بھی دلال (بولی لگانے والا) کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آئے اور ہمارے اپنے رکھے ہوئے نام سے اچھے نام سے ہمیں پکارا اور فرمایا: **«يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ، إِنَّ هَذَا الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ، فَشُوبُوهُ بِالصَّدَقَةِ»** "**اے تاجرو! اس خرید و فروخت میں بے ہودہ باتیں ہوتی ہیں اور قسم کھائی جاتی ہے، اسے صدقہ دے کر پورا کرو**" اس حدیث کو احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

چہارم: مضاربہ (تجارت کے لیے مال دینا) اس کی دلیل وہ روایت ہے کہ العباسؓ بن عبد المطلب جب بھی کسی کو مضاربہ کے لیے رقم دیتے تھے اس میں شرط لگاتے تھے کہ اس مال کو لے کر سمندری سفر نہ

کریں، کسی وادی میں نہ ٹھہریں اور اس مال سے کوئی جاندار چیز نہ خریدیں، اور اگر ایسا کیا تو تم خود ذمہ دار ہو۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے پسند فرمایا، اگرچہ الحافظ نے کہا ہے کہ البیھقی نے اس کے اسناد کو ضعیف کہا ہے تاہم مضاربہ اجماع صحابہؓ سے بھی ثابت ہے، اس لیے ابن حزم نے مراتب اجماع میں مضاربہ کے بارے میں کہا ہے کہ اگرچہ سنت میں اس کے بارے میں مجھے کوئی دلیل نہیں ملی لیکن یہ اجماع سے ثابت ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ یہ آپ ﷺ کے زمانے میں تھا آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا آپ ﷺ نے اس کو برقرار رکھا اگر ایسی بات نہ ہوتی تو یہ جائز نہ ہوتی، یہی بات ابن حزم سے الحافظ نے **" تلخیص الحبیر"** میں نقل کی ہے۔

اجماع صحابہ کی دلائل میں سے یہ واقعہ بھی ہے جو امام مالکؒ نے زید بن اسلم سے اور اس نے اپنے والد (اسلم) سے نقل کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ عمر بن خطابؓ کے دو بیٹے عبد اللہ اور عبید اللہ فوج کے ساتھ عراق گئے ہوئے تھے، بصرہ میں ان کی ملاقات بصرہ کے حاکم (گورنر) ابو موسیٰ الاشعریؓ سے ہوئی انہوں نے دونوں کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ: میں تم دونوں کو ایک ایسا کام بتاتا ہوں کہ جس کے کرنے سے تم دونوں کو بہت نفع ہو گا۔ کام یہ ہے کہ میرے پاس اللہ کے مال میں سے کچھ مال (نقد) ہے اور میں اسے تم دونوں کے ذریعے مدینہ منورہ بھیجنا چاہتا ہوں اگر تم دونوں اس مال (نقد) سے عراق میں کچھ تجارتی مال خریدو اور مدینہ پہنچ کر اس کو بیچ دو اور اصل مال امیر المومنین کے حوالے کرو اور جو منافع حاصل ہو تم دونوں تقسیم کرو۔ دونوں نے حامی بھر لی اور انہوں نے امیر المومنین کو خط بھی لکھا کہ ان دونوں سے اصل مال وصول کرو، دونوں جب مدینہ پہنچے، مال بیچ دیا اور فائدہ اپنے پاس رکھ کر اصل مال عمرؓ بن خطاب کے حوالے کیا، تو عمرؓ نے فرمایا جو مال تم دونوں کو دیا گیا کیا کیا اس طرح پوری فوج کو بھی دیا گیا؟ دونوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ تم دونوں امیر المومنین کے بیٹے ہو، کیا اس لیے؟ تم مال اور اس سے حاصل ہونے والا فائدہ سب جمع کرو۔ یہ سن کر عبد اللہ تو خاموش ہو گئے جبکہ عبید اللہ نے کہا کہ اے امیر المومنین اگر اس مال میں کوئی کمی یا نقصان ہوتا یا ضائع ہو جاتا تو ہم نے اس کی ضمانت (گارنٹی) دی ہوئی تھی۔ آپؓ نے پھر فرمایا: مال جمع کرو۔ عبد اللہ پھر چپ ہو گئے

اور عبید اللہ نے اپنی بات دہرائی۔ یہ سن کر حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین اگر آپ اس مال کو قراض (مضاربہ) بنالیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں نے اس مال کو مضاربہ بنایا اور اصل مال کے ساتھ آدھا منافع بھی لے لیا، باقی آدھا عبد اللہ اور عبید اللہ نے آپس میں تقسیم کیا **(الموطأ)** الحافظ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہیں، یہ صحابہ کی ایک جماعت کی موجودگی میں ہوا۔

اس طرح قراض (مضاربہ) کا کام ہے:

مالک نے العلاء بن عبد الرحمان سے ان کے والد اور ان کے دادا کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عثمان بن عفانؓ نے انہیں مال دیا مضاربہ کے طور پر اور فرمایا کہ نفع ہم دونوں کے درمیان برابر ہو گا۔ بیھقی نے سنن الکبریٰ میں اور الحافظ نے بھی مضبوط اسناد کے ساتھ حکیم بن حزامؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک آدمی کو مضاربہ کے لیے مال دیتے تھے اور اس میں یہ شرط لگاتے تھے کہ اس مال کو لے کر کسی وادی سے نہ گزرنا، کوئی جاندار چیز نہ خریدنا اور سمندری راستے سے اس مال کو لے کر سفر نہ کرنا، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں مال کا نقصان پورا کرنا پڑے گا۔ فرمایا کہ اگر کوئی خلاف ورزی کرتا تو آپ اس سے پورا مال لیتے۔

پنجم: مساقات: (پانی دینا)۔ اس کی دلیل عبد اللہ بن عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ **«عَامَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَهْلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ»: "آپ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ اس شرط پر مساقات کا معاملہ کیا کہ پھل کی جو بھی فصل ہو گی اس کا ایک حصہ تمہارا ہے"۔**

ششم: دوسروں کے لیے اجرت پر کام کرنا: اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ "پھر اگر تمہارے کہنے سے وہ دودھ پلائیں تو تم انہیں اس کی اجرت دے دو"** (الطلاق:6)۔ دوسری دلیل عائشہؓ کی یہ روایت ہے: کہ **«اسْتَأْجَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلاً مِنْ بَنِي الدِّيلِ هَادِياً خِرِّيتاً وَهُوَ عَلَى دِينِ قَوْمِهِ وَدَفَعَا إِلَيْهِ رَاحِلَتَيْهِمَا وَوَاعَدَاهُ غَارَ ثَوْرٍ بَعْدَ ثَلاثِ لَيَالٍ» "رسول اللہ ﷺ نے بنی الدیل میں سے ایک آدمی کو اجرت پر لیا تا کہ وہ**

(مدینہ کا) راستہ بتائے حالانکہ وہ آدمی مسلمان نہیں تھا اور دونوں (آپ ﷺ اور ابو بکرؓ) نے اپنی سواریاں اس کے حوالے کیں اور تین دن کے بعد غار ثور میں ملنے کا وعدہ لیا"۔ اس کی تخریج بخاری نے کی ہے۔

ہفتم: رکاز (خزانہ)۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے کہ **«وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ»** **"ملنے والے دفن خزینے میں خمس ہے"**۔ یہ متفق علیہ حدیث ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔

ان سات حالات کے یہ دلائل ہی ملکیت کے پہلے سبب یعنی عمل کے دلائل ہیں۔

دوسرا سبب میراث: اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ** **" اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکے کے مال کا دو تہائی ملے گا"** (النساء: 11)۔ اس طرح میراث سے متعلق قرآن و حدیث میں موجود بہت سے نصوص بھی اس کے دلائل میں شامل ہیں۔

تیسرا سبب: زندہ رہنے کے لیے مال کی ضرورت۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص عملاً کمانے کے قابل نہ ہو جیسے چھوٹا بچہ، یا معذوری کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ ہو یا حکماً کمانے کے قابل نہ ہو جیسے کام نہ ملنے کی وجہ سے بے روزگاری۔ ان تمام صورتوں میں اس شخص کے لیے نفقہ شرعاً واجب ہے، پہلے رشتہ داروں پر، اگر وہ اس قابل نہیں تو بیت المال پر، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندہ رہنے کے لیے جو مال اس کو ملتا ہے وہ اس کا مالک ہے۔ یہ ملکیت کا تیسرا سبب ہوا۔

چوتھا سبب: ریاستی بخشش، جیسے زمین کا کوئی ٹکڑا یا قرضہ اتارنے کے لیے نقد یا کاشتکاری میں مدد دینے کے لیے مال دینا وغیرہ۔ زمین دینے کی دلیل بلال المزنی کی یہ روایت ہے کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَقْطَعَهُ العَقِيقَ أَجْمَعَ»** **" رسول اللہ ﷺ نے پورا کا پورا عقیق (علاقہ) ان کو دے دیا"**۔ ابو عبید نے اس حدیث کو الاموال میں روایت کیا ہے، اسی طرح عمروؓ بن شعیب کی روایت میں ہے کہ **«أَقْطَعَ رَسُولُ**

اللهِ ﷺ نَاساً مِنْ مُزْيَنَةِ أَوْ جُهَيْنَةِ أَرْضاً» **"رسول اللہ ﷺ نے مُزَینہ یا جُہینہ (قبیلے) کے کچھ لوگوں کو زمین کے ٹکڑے دیئے"**۔ اس کی تخریج ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں کی ہے۔ جہاں تک قرضہ اتارنے کے لیے مال دینے کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف میں مقروضوں کا ذکر کیا ہے، فرمایا: **وَالْغَارِمِيْنَ** (التوبۃ: 60) **:" اور قرضداروں کا"**۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«فَمَنْ تَرَكَ دَيْناً فَعَلَيَّ، وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ»** **"جو قرضہ چھوڑ کر مرا تو اس کی ادائیگی میری ذمہ داری ہے اور جو مال چھوڑ کر مرا تو اس کے وارثوں کا ہے"**۔ ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ **«فَعَلَيَّ»** میری ذمہ داری ہے سے مراد یہ ہے کہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے اور بیت المال وہ قرضہ ادا کرے گا۔ رہی بات کسانوں کو زراعت کے لیے مال دینے کی، تو عمر بن خطابؓ نے بیت المال میں سے عراقی کسانوں کو اموال عطاء کئے تاکہ وہ کاشتکاروں کی مدد کر سکیں اور کاشکار اپنی ضروریات کو پورا کر سکیں اور آپ نے یہ مال واپس بھی نہیں مانگا۔ کسی نے اس حوالے سے آپ کی مخالفت نہیں کی اور یوں یہ صحابہ کا اجماع ہے۔

تو یہ تین حالات: زمین عطا کرنا، قرض اتارنے کے لیے مال دینا اور کاشتکاروں کی معاونت کے لیے مال دینا، ملکیت کے اسباب میں سے ہیں۔ یہ سارے کام مباح ہیں یوں امام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق اموال خرچ کرے اور جس کو وہ مال دے دے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

پانچواں سبب: وہ اموال جو افراد کو مال یا محنت کے بغیر حاصل ہوں، یہ پانچ احوال پر مشتمل ہے۔

پہلی حالت: افراد کا ایک دوسرے سے صلہ رحمی جیسے ہدیہ دینا، ھبہ کرنا، وصیت کرنا، ابو حمیدؓ ساعدی سے روایت ہے **«غَزَوْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ غَزْوَةَ تَبُوكَ... وَأَهْدَى مَلِكُ أَيْلَةَ لِلنَّبِيِّ ﷺ بَغْلَةً بَيْضَاءَ وَكَسَاهُ بُرْدًا»** **" ہم غزوہ تبوک میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے... ایلہ کے بادشاہ نے آپ ﷺ کو سفید خچر ہدیہ کے طور پر دے دیا اور ایک چادر آپ ﷺ پر ڈال دی"**۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدیہ لینا دینا جائز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **«تَهَادَوْا تَحَابُّوا»** **:" ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے"**۔ اس حدیث کو بخاری نے **الأدب المفرد** میں ابو

ہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور بیہقی نے بھی اسے نقل کیا ہے یہ بھی ہدیہ کے مباح ہونے کی دلیل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«لاَ يَرْجِعْ أَحَدُكُمْ فِي هِبَتِهِ إِلاَّ الْوَالِدَ مِنْ وَلَدِهِ» "تم میں سے کوئی ھبہ کرنے کے بعد اس کو واپس نہ لے، سوائے والد کے اپنے بیٹے سے"**۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب کے واسطے سے ان کے والد سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا **«الْعَائِدُ فِي هِبَتِهِ كَالْعَائِدِ فِي قَيْئِهِ» " ھبہ کر کے واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ قے (الٹی) کر کے اس کو دوبارہ کھانے والا"**۔ ابنِ عباسؓ سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے، جس سے ھبہ کے مباح ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سعد بن مالک سے فرمایا: **«أَوْصِ بِالثُّلُثِ، وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ» "تیسرے حصے کی وصیت کرو اور تیسرا حصہ بہت ہوتا ہے"** ۔ سعدؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے اور یہ ھبہ کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔

دوسری حالت: کسی نقصان (تاوان) کی وجہ سے مال کا مستحق ہونا جیسے قتل کی دیت یا زخم کی دیت، ارشاد ہے **وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ "جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرنا اور مقتول کے عزیزوں کا خون بہا ادا کرنا ہے"** (النساء: 92)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«فِي السِّنِّ خَمْسٌ مِنَ الإِبِلِ» "دانت (کی دیت) میں پانچ اونٹ ہیں"**۔ اس حدیث کو بیہقی نے نقل کیا ہے اور ابن حبان و حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«فِي دِيَةِ الأَصَابِعِ الْيَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَاءٌ عَشْرٌ مِنْ الإِبِلِ لِكُلِّ أُصْبُعٍ» " دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کی دیت " خون بہا" برابر ہے، ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں"**۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے اور بیہقی نے اسی قسم کی ایک حدیث ابو بکر بن محمد کی کتاب سے نقل کی ہے۔ مقتول کی دیت تو اس کے ورثاء لے لیں گے، جبکہ اعضاء کی دیت وہ آدمی خود لے گا۔

تیسری حالت: مہر اور اس کے متعلقات کا حقدار ہونا۔

ارشاد باری ہے: **وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً** "اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو"(النساء: 4)۔ عورت صرف عقد (معاہدے) سے اپنے مہر کی مالک بن جائے گی۔

چوتھی حالت: لُقطہ (کسی کی کھوئی ہوئی چیز) ملنا۔

رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا **«مَا كَانَ مِنْهَا فِي طَرِيقِ الْمِيتَاءِ أَوْ الْقَرْيَةِ الْجَامِعَةِ فَعَرِّفْهَا سَنَةً فَإِنْ جَاءَ طَالِبُهَا فَادْفَعْهَا إِلَيْهِ وَإِنْ لَمْ يَأْتِ فَهِيَ لَكَ»** **"کوئی چیز تمہیں کسی عام راستے میں یا کسی بڑے گاؤں میں ملے تو ایک سال تک اس کے مالک کے بارے میں پوچھتے رہو اگر اس کو ڈھونڈنے والا آگیا تو دے دو، ورنہ وہ چیز تمہاری ہو جائے گی"**۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت کیا ہے اور اس میں لفظ (المیتائ) سے مراد عام چلنے پھرنے کا راستہ ہے۔ اسی طرح عیاض بن حمار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ وَجَدَ لُقَطَةً فَلْيُشْهِدْ ذَوَيْ عَدْلٍ وَلْيَحْفَظْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا فَلاَ يَكْتُمْ وَهُوَ أَحَقُّ بِهَا وَإِنْ لَمْ يَجِئْ صَاحِبُهَا فَإِنَّهُ مَالُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ»**: **"جس شخص کو لُقطہ (گری ہوئی چیز) ملے تو وہ دو افراد کو گواہ بنائے اور جیسا تھا ویسا ہی رکھے اگر اس کا مالک آگیا، تو اس کے حوالے کرے کیونکہ وہ اس کا حقدار ہے اور اگر نہ آئے تو یہ اللہ کا مال ہے جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔"** اس حدیث کو احمد نے صحیح اسناد سے نقل کیا ہے، پائی ہوئی چیز کا مالک وہی ہے جسے وہ مل گئی مگر اس کی شرائط کے ساتھ۔

پانچویں حالت: خلیفہ، معاونین، والیوں اور سارے حکمرانوں کو عوض دینا۔

ابنِ ھشام نے "السیرۃ" میں نقل کیا ہے کہ زید بن اسلم کے حوالے سے یہ بات مجھ تک پہنچی: **«لَمَّا اسْتَعْمَلَ النَّبِيُّ ﷺ عِتَابَ بْنَ أُسَيْدٍ عَلَى مَكَّةَ رَزَقَهُ كُلَّ يَوْمٍ دِرْهَماً، فَقَامَ عِتَابٌ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَجَاعَ اللهُ كَبِدَ مَنْ جَاعَ عَلَى دِرْهَمٍ، فَقَدْ رَزَقَنِي اللهُ دِرْهَماً كُلَّ يَوْمٍ، فَلَيْسَتْ بِي حَاجَةٌ إِلَى أَحَدٍ»** **"جب رسول اللہ ﷺ نے عتاب ؓ بن اسید کو مکہ کا عامل مقرر کیا تو ان کا معاوضہ ایک دن کا ایک درہم مقرر فرمایا۔ عتاب نے لوگوں سے**

خطاب کرتے ہوئے کہا، اے لوگو! اللہ اس شخص کو بھوکا کرے جو ایک درہم کے باوجود بھوکا بنتا ہے، مجھے تو اللہ ہر دن کا ایک درہم دیتا ہے اس لیے مجھے کسی کی ضرورت نہیں"۔ اس طرح ابن سعد نے "الطبقات" میں مرسل اسناد کے ساتھ قابل اعتماد راویوں کے ذریعے نقل کیا ہے **«لَمَّا اسْتُخْلِفَ أَبُو بَكْرٍ أَصْبَحَ غَادِياً إِلَى السُّوقِ، عَلَى رَأْسِهِ أَثْوابٌ يَتَّجِرُ بِهَا، فَلَقِيَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الجَرَّاحِ فَقَالَ: كَيْفَ تَصْنَعُ هَذَا وَقَدْ وُلِّيتَ أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ؟ قَالَ: فَمِنْ أَيْنَ أُطْعِمُ عِيَالِي؟ قَالُوا: نَفْرِضُ لَكَ، فَفَرَضُوا لَهُ كُلَّ يَوْمٍ شَطْرَ شَاةٍ»"جب ابو بکرؓ کو مسلمانوں کا خلیفہ منتخب کیا گیا تو وہ کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھا کر بیچنے کے لیے بازار جا رہے تھے کہ راستے میں عمر بن خطابؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ سے ملاقات ہوئی۔ ان دونوں نے کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں آپ کو تو امیر المومنین کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ فرمایا کہ پھر گھر والوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ ان دونوں نے کہا کہ ہم آپ کے لیے کچھ معاوضہ مقرر کرتے ہیں، چنانچہ آپ کے لیے ایک دن کا معاوضہ آدھی بکری مقرر کی گئی"**۔ اسے ابنِ حجر نے فتح الباری میں اور زیلعی نے نصب الرایہ میں نقل کیا ہے۔ یہ صحابہؓ کی طرف سے خلیفہ کو معاوضہ ادا کرنے کے بارے میں اجماعِ صحابہؓ ہے۔ یہ معاوضہ خلیفہ، والیوں اور عمال کے لیے ہے۔ یہ ملکیت کے اسباب میں سے ہے اور یہ اجرت بھی نہیں اس لیے یہ ملازم کی اجرت کے باب میں داخل نہیں۔

ملکیت کے احوال میں سے پانچویں سبب کی یہ پانچ صورتیں ہیں۔ یہ ملکیت کے ان پانچ اسباب کے دلائل ہیں، ان پر غور و فکر کرنے (استقراء) سے معلوم ہوا کہ ملکیت کے یہی پانچ اسباب ہیں اس کے علاوہ کوئی سبب نہیں۔ ملکیت کے اسباب کے طور پر انہی کے لیے شرعی اجازت موجود ہے۔ ان پانچ اسباب کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ملکیت کی نشوونما کے اسباب ہیں جیسا کہ تجارت، صنعت، زراعت، یہ ملکیت کے اسباب نہیں، یوں اس دفعہ کے دلائل واضح ہو گئے۔

دفعہ نمبر 132: ملکیت میں تصرف شارع کی اجازت سے مشروط ہے، خواہ یہ تصرف خرچ کرنے سے متعلق ہو یا ملکیت کی نشوونما کے حوالے سے ہو۔ چنانچہ اسراف، نمود و نمائش، کنجوسی، سرمایہ دار

کمپنیاں، کو آپریٹو سوسائٹیز اور تمام خلافِ شرع معاملات ممنوع ہیں۔ اسی طرح سود، غبن فاحش (ٹھگی)، ذخیرہ اندوزی، جوا اور اس جیسی دیگر چیزیں سبھی ممنوع ہیں۔

اس کی دلیل بھی وہی دلائل ہیں جو خرچ کرنے کے بارے میں ہیں۔ اور ملکیت کو بڑھانے کے دلائل 'قولی تصرفات' کے دلائل ہیں، جیسے بیع (بیچنا)، اجارہ (کرایہ پر دینا) وغیرہ۔ خرچ کے دلائل یہ ہیں: قرآن میں ارشاد ہے **لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ "کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے"**(الطلاق: 7)۔ اور اسراف سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا **:وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ "اور خرچ کرنے میں حد سے مت گزرو یقیناً اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے"**(الانعام: 141)۔ اور فرمایا: **وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ "اور حرام پر خرچ کرنے سے بچو۔ حرام امور پر خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"**(الاسراء: 26-27)۔ اور کنجوسی (واجب امور پر خرچ نہ کرنے) سے منع کرتے ہوئے فرمایا **وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا "اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں، نہ بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان خرچ کرتے ہیں"**(الفرقان:67)۔ جہاں تک قولی تصرفات کا تعلق ہے تو شارع نے اسے متعین معاملات تک محدود کر دیا ہے، جیسے بیع (خرید و فروخت)، اجارہ، شرکت، وغیرہ، اور ان کی کیفیت بھی مقرر کر دی اور اس کے علاوہ کو حرام قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» "جو کوئی ایسا کام کرے جس کے بارے میں ہمارا حکم نہیں تو وہ کام مردود ہے"**۔ اس حدیث کو مسلم نے عائشہؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ پس معاملات کی یہ تحدید مخصوص کیفیت کے ساتھ ہے اور کچھ مخصوص معاملات سے منع کیا گیا وہ بھی انتہائی صراحت کے ساتھ، یوں ملکیت کی بڑھوتری کو شارع کی اجازت سے مشروط کیا گیا ہے۔

کچھ معاملات ایسے ہیں جن کا حکم مخصوص اور محدود طریقے سے ہے، اور ان معاملات کے انعقاد اور ان کی صحت کے لیے شرعی نصوص میں ایسی شرائط موجود ہیں، جو طلب جازم کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، تو ان

معاملات کو بعینہٖ اس طرح انجام دینا واجب ہے، جیسا کہ شرعی نصوص میں بیان کیا گیا ہے۔ اوران معاملات کو شرعی نصوص میں وارد تمام شروط انعقاد اور شروط صحت کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ ان معاملات کی انجام دہی اگر نص کے خلاف ہو یا نص میں موجود انعقاد یا صحت کی شرائط کو پورا نہ کرتی ہو تو یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اگر یہ معاملہ انعقاد کی شرائط کے مطابق نہ ہو تو باطل ہے اور اگر معاملہ شرائط انعقاد کے علاوہ دیگر شرائط کو پورا نہ کرتا ہو، جس سے شرعی اوامر و نواہی کی مخالفت لازم آجاتی ہو، تو یہ معاملہ فاسد ہے۔ باطل ہونا یا فاسد ہونا شرع کے خلاف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کے خلاف ہے، جو کہ گناہ ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ شرعی عقد legal contract کے بارے میں شارع کا حکم ہے، کہ اس میں عقد (معاہدہ) کرنے والے دو فریق موجود ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ» "خریدنے والے اور فروخت کرنے والے، دونوں کو اختیار حاصل ہے"**۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اسے ابنِ عمرؓ اور حکیم بن حزام نے روایت کیا ہے۔ اور ایک حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے **«أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ» "میں دو شرکاء کے ساتھ تیسرا شریک ہوں"** اس حدیث کو ابو داؤد نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ اس طرح شارع نے یہ حکم بھی دے دیا ہے کہ دونوں فریقین کے درمیان ایجاب و قبول ہونا چاہیے۔ یہ دونوں کسی بھی کنٹریکٹ کے انعقاد کی شرائط ہیں اگر یہ (یعنی فریقین اور ایجاب و قبول) نہ ہو تو معاملہ باطل ہو گا اور منعقد ہی نہیں ہو گا اور ایسا معاملہ کرنا گناہ کا ارتکاب اور حرام کام کرنا ہے، کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہو گا جس کی شرع اجازت نہیں۔ اس کی مثال حصص والی کمپنیاں (شیئرز ہولڈرز) ہیں کیونکہ یہ یک طرفہ معاملہ کرتی ہیں۔ کسی بھی شخص کی جانب سے کمپنی کی شرائط پر دستخط کرنے سے وہ اس میں حصہ دار بن جاتا ہے، اسی طرح صرف شیئر خریدنے سے ایک شخص اس کمپنی میں حصہ دار بن جاتا ہے، یوں یہ سرمایہ داروں کے نزدیک یکطرفہ معاملہ ہے جیسا کہ اسلام میں وقف یا وصیت ہوتی ہے۔ شیئرز ہولڈرز کمپنیوں کے دو فریق نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی طرف سے سب کچھ ہوتا ہے، نہ ہی ان میں ایجاب و قبول ہوتی ہے بلکہ صرف ایجاب ہوتا ہے۔ شرع میں کمپنی میں شراکت داری کے لیے دونوں جانب سے ایجاب و قبول کے عقد کا ہونا

لازمی شرط ہے۔ یہ خرید و فروخت، اجارہ اور نکاح کی طرح ہے۔ اس لیے یک طرفہ ہونے کی صورت میں شرکت منعقد ہی نہیں ہوتی، بلکہ باطل اور حرام ہوتی ہے۔ شرع کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ وہ شرکت سمجھی جائے گی جس کی شرع اجازت ہی نہیں دیتی کیونکہ اس میں شرکت کے انعقاد کی ان شرائط کو ترک کیا گیا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس میں وہ کام انجام دیا گیا ہے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے **فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ "جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرناچاہیے"**(النور: 63)۔ چنانچہ اس کام کو کرنا گناہ کا ارتکاب اور ایک حرام فعل کو انجام دینا ہے، لہٰذا یہ معاملہ شریعت کے حرام کردہ معاملات میں سے ہوا، کیونکہ ہر باطل عقد حرام ہوتا ہے۔ اس کی دوسری مثال لائف انشورنس، سامان کی انشورنس یا جائیداد کا انشورنس ہے۔ یہ بیمہ کمپنی کی جانب سے اس بات کا ایک معاہدہ ہے کہ کسی بھی قسم کی نقصان کی صورت میں سامان یا جائیداد یا ان کی قیمت بطور معاوضہ کمپنی کی طرف سے دیا جائے گا، یا یہ کہ زندگی کی انشورنس کی صورت میں خاص مقدار مال کا دیا جائے گا، یا یہ کہ جسمانی اعضاء کا بیمہ کیا جائے، اس طور پر کہ معین مدت کے اندر کسی بھی قسم کے حادثے کی صورت میں خاص مقدار میں مال دیا جائے گا۔ اس قسم کی انشورنس میں کوئی مضمون عنہ (جس کی طرف سے ضمانت دی گئی) نہیں نہ ایک ضمہ کا دوسرے ضمہ سے تعلق ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی ایسا شخص نہیں جسے کمپنی نے ذمہ دار بنایا ہو اور کمپنی بھی اس کا ذمہ دار ہو گئی ہو۔ نیز اس قسم کی انشورنس میں، جس شخص کی انشورنس کی گئی ہے، اس کے لیے کسی کے ذمے مالی حق مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ یعنی بیمہ کمپنی نے کسی کو اس کا پابند نہیں بنایا۔ نہ یہ صورت ہے کہ جس کا بیمہ کیا جا رہا ہے اس کا کسی پر مالی حق ہے اور کمپنی نے آخر اس حق کی ادائیگی کی ضمانت دے دی۔ بیمہ ایک ضمانت ہے اور شریعت میں ضمانت، ضامن کی طرف سے مضمون عنہ (جس کی ضمانت دی جا رہی ہے) کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ لہٰذا اس میں ایک کی ذمہ داری کا دوسرے ذمہ داری کیساتھ ضم (منسلک ہونا) ضروری ہے۔ اور اس میں ضامن (جو ضمانت دے رہا ہے) اور مضمون عنہ (جس کی طرف سے ضمانت دی جا رہی ہے) اور مضمون لہ (جس کے لیے ضمانت دی جا رہی ہے) کا ہونا لازمی ہے۔ اور ایک ثابت شدہ حق کی ذمہ داری کی ضمانت دینا بھی ضروری

ہے۔ یہ ضمانت کے انعقاد اور صحت کی شرائط ہیں۔ چونکہ انشورنس کا معاہدہ ان شرعی شرطوں کو پورا نہیں کرتا، اس لیے یہ شرعاً باطل اور حرام ہے، اس لیے اس کام کو کرنا ایک گناہ اور حرام کام کرنا ہے اور شرعی طور پر حرام معاملات میں سے ہے، کیونکہ ہر باطل معاملہ حرام ہوتا ہے۔ یہ معاملات جیسے شرکت (کمپنی) یا ضمان وغیرہ، ان کے لیے شرعی نصوص کے مطابق ایسے مخصوص اور متعین شرائط ہیں جن کی پابندی واجب ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ملکیت کی نشو ونما میں ہر قسم کا تصرف شارع کی اجازت سے مقید ہے، کچھ معاملات (کام) ایسے ہیں جن سے واضح طور پر منع کیا گیا ہے جیسا کہ غبن فاحش (ٹھگی) وغیرہ۔ عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا ہے کہ وہ تجارت میں دھوکہ کھا جاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: **«إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لاَ خِلاَبَةَ» "جب خرید و فروخت کرو تو کہہ دو کہ دھوکہ نہیں"**۔ ابنِ عمرؓ سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے، اور خِلَابَۃ خا کے زیر کے ساتھ بمعنی دھوکہ کے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«بَيْعُ الْمُحَفَّلاَتِ خِلاَبَةٌ وَلاَ تَحِلُّ الْخِلاَبَةُ لِمُسْلِمٍ» "خرید و فروخت میں عیب چھپانا دھوکہ ہے اور کسی مسلمان کے لیے دھوکہ جائز نہیں"**۔ اس حدیث کو احمد اور ابنِ ماجہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے اس حدیث کو صحیح اسناد کے ساتھ عبد اللہ بن مسعودؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غبن فاحش حرام ہے، اسی طرح ذخیرہ اندوزی بھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ» "ذخیرہ اندوزی کرنے والا خطاکار ہے"** اس حدیث کو مسلم نے معمر بن عبد اللہ العدوی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہی حال جوئے کا ہے، ارشاد ہے **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں، ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح حاصل کر سکو"** (المائدہ: 90)۔ اسی طرح سود کا معاملہ ہے، ارشاد باری ہے: **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا "اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے"** (البقرہ: 275)۔ یہ معاملات اور ان سے ملتے جلتے دوسرے معاملات کے حوالے سے ممانعت کی یہ صراحت ملکیت کی نشو ونماء کو اس بات کیساتھ مقید کرتی ہے

کہ وہ ان جیسے معاملات کے دائرے میں نہ ہو۔ اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ملکیت کی نشوونما کے معاملات شارع کی اجازت میں مقید ہیں۔

دفعہ نمبر 133: عشری زمین وہ ہے جہاں کے رہنے والے اس زمین پر رہتے ہوئے (بغیر کسی جنگ سے یا صلح کے) ایمان لے آئے، اسی طرح جزیرۃ العرب کی زمین۔ جبکہ خراجی زمین وہ زمین ہے جو جنگ یا صلح کے ذریعے فتح کی گئی ہو، سوائے جزیرۃ العرب کے۔ عشری زمین اور اس کے پیداوار کے مالک افراد ہوتے ہیں، جبکہ خراجی زمین ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور اس کی پیداوار افراد کی ملکیت ہوتی ہے، ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شرعی معاہدوں کے ذریعے عشری زمین اور خراجی زمین کے پیداوار کا تبادلہ کرے اور دوسرے اموال کی طرح یہ زمین بطور میراث ایک سے دوسرے کو منتقل ہوگی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ زمین بھی دوسرے اموال کی طرح ایک قسم کا مال ہے، اگر جنگ کے ذریعے فتح کی گئی، تو دوسرے غنائم کی طرح مسلمانوں کے لیے مال غنیمت سمجھی جائے گی۔ یہی خراجی زمین ہے۔ اور یہ بیت المال کی ملکیت ہوگی۔ اور اگر زمین کے مالک زمین پر رہتے ہوئے اسلام لائے تو یہ ان مسلمانوں کی ملکیت ہے اور یہی عشری زمین ہے۔

اس بات کی دلیل کہ زمین بھی دوسرے غنائم کی طرح مال غنیمت ہے، حفص بن غیاث کی یہ حدیث ہے جو انہوں نے ابن ابی ذئب سے اور انہوں نے زُھری سے روایت کی ہے کہ **«قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِيمَنْ أَسْلَمَ مِنْ أَهْلِ الْبَحْرَيْنِ أَنَّهُ قَدْ أَحْرَزَ دَمَهُ وَمَالَهُ إِلاَّ أَرْضَهُ، فَإِنَّهَا فَيْءٌ لِلْمُسْلِمِينَ، لأَنَّهُمْ لَمْ يُسْلِمُوا وَهُمْ مُمْتَنِعُونَ»** "رسول اللہ ﷺ نے اہلِ بحرین میں سے ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کیا جو مسلمان ہوگئے کہ ان کی جان و مال تو بچ گئے مگر زمین نہیں، وہ مسلمانوں

کے لیے فئے ہے کیونکہ وہ اس زمین پر رہتے ہوئے (جنگ سے پہلے) ایمان نہیں لائے۔" کتاب الخراج یحییٰ بن آدم۔

رہی بات خراجی زمین کو دوسرے غنائم کی طرح تقسیم نہ کرنے کی، تو یہ اس لیے ہے کہ مصر کی زمین کی تقسیم کے حوالے سے زبیرؓ اور عمرؓ بن خطاب کے درمیان اختلاف، اسی طرح عراق کی زمین کے حوالے سے بلالؓ اور عمرؓ بن خطاب کے درمیان اختلاف، کی ہر دو صورتوں میں عمر بن خطابؓ کی دلیل زیادہ مضبوط ہے اور مہاجرین اور انصار میں سے دس صحابہ نے عمر بن خطابؓ کی تائید کی۔ مصر کو جب فتح کیا گیا تو زبیرؓ کی رائے یہ تھی کہ اس زمین کو دوسرے اموالِ منقولہ کی طرح لڑنے والوں کے درمیان تقسیم کی جائے اور مصر کے والی (گورنر) عمروؓ بن العاص نے عمرؓ بن خطاب کو خط بھی لکھا۔ لیکن عمرؓ بن خطاب نے انکار کر دیا اور جواباً عمروؓ بن العاص سے فرمایا «**أَقِرَّهَا حَتَى يَغْزُوَ مِنْهَا حَبَلُ الحَبَلَةِ**» " **اس زمین کے چپے چپے کو اپنی اصلی حالت پر برقرار رکھو تاکہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں**"۔ یعنی مسلمانوں کی آنے والی نسلیں بھی اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بلالؓ نے بھی یہ رائے دی کہ عراق کی زمین کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا جائے چنانچہ سعدؓ نے عمرؓ بن خطاب کو اس کے بارے میں لکھا تو آپ نے یوں جواب دیا کہ " **زمین اور اس میں بہنے والی نہروں کو انہیں لوگوں کے پاس رہنے دو جن کے پاس ہیں تاکہ اس کی آمدنی سے سارے مسلمان فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر زمین کو ہم موجود لوگوں کے درمیان تقسیم کرے تو آنے والے اس سے محروم رہیں گے**"۔ اسے ابو عبید نے الاموال میں ابو یوسف نے الخراج میں اور یحییٰ بن آدم نے الخراج میں یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے۔ اس رائے کے لیے عمر بن خطابؓ کی دلیل یہ آیت تھی **مَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ** "**اور ان کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا ہے**" اسی کے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ** ۙ " **وہ مال اللہ کا ہے اور رسول کا اور قرابت والوں کا اور یتیموں، مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے**"(الحشر: 6)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا **لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ** "**ان مہاجر مسکینوں کے لیے ہے**"(الحشر:8)۔ اللہ تعالیٰ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور آگے فرمایا

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ "اور ان کے لیے ہے جنھوں نے اس گھر (مدینہ منورہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں" (الحشر: 9)۔ یہ آیت خاص طور پر انصار کے بارے میں ہے، اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے بات ختم نہیں کر دی بلکہ اوروں کو بھی اس میں شامل کر دیا، چنانچہ فرمایا **وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ "اور ان کے لیے جو ان کے بعد آئیں"** (الحشر: 10)۔ یہ آیت عام ہے بعد میں آنے والے سب کو شامل ہے اس لیے مال فئے میں سب کا حصہ ہے۔ یہ تھی عمر بن خطابؓ کی اس رائے کی دلیل کہ وہ زمین جس کے رہنے والے اس پر رہتے ہوئے اسلام نہ لائیں بلکہ وہ زمین جنگ کے ذریعے فتح کی جائے تو وہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کی ملکیت ہو گی اور خلیفہ اس زمین سے حاصل ہونے والی آمدن کو لوگوں کے مفاد کے مطابق استعمال کرے گا۔ عمر بن خطابؓ نے مسلمانوں سے رائے طلب کی تاہم لوگوں نے اس مسئلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا تب آپ نے انصار میں سے دس افراد کو بلوایا۔ پانچ قبیلہ اوس میں سے تھے اور پانچ قبیلہ خزاج میں سے۔ یہ دس افراد اپنے قبیلے کے بڑے اور قابل احترام لوگ تھے۔ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ زمینوں اور اس میں کام کرنے والوں (غیر مسلموں) کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کروں بلکہ ان پر خراج لگا دوں تا کہ مسلمان مجاہدین اور ان کے آنے والی نسلوں کے لیے مال فراہم ہو سکے، دیکھئے یہ کتنی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت ہے یہ شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر۔ ان کے لیے ایک لشکر جرار کی ضرورت ہے جس کے لیے بہت مال درکار ہے اگر یہ زمینیں اور ان میں کام کرنے والے پست لوگوں کو ہم تقسیم کریں تو اسلامی فوج کے لیے خرچ کہاں سے آئے گا"۔ اسے ابو یوسف نے کتاب الخراج نقل کیا ہے۔ عمر بن خطابؓ کے جواب میں سب نے کہا کہ آپ اپنی رائے کے مطابق جو بہتر سمجھیں ایسا کریں۔ عمر بن خطابؓ کی جانب سے اس آیت سے استدلال اور زمین کو بیت المال کے لیے دائمی آمدنی کا ذریعہ برقرار رکھنا انتہائی مضبوط دلیل پر مبنی ہے۔ اس لیے ہر وہ زمین جو فتح کی جاتی تھی خراجی زمین سمجھی جاتی تھی جس کی پیداوار بیت المال کی ملکیت ہوتی تھی اور زمین والے بھی اس زمین سے فائدہ اٹھاتے

تھے۔ زمین کے بارے میں یہی حکم ہے خواہ وہ طاقت کے ذریعے فتح کی گئی ہو جیسا کہ عراق کی زمین یا صلح کی بنیاد پر فتح کی گئی ہو جیسا کہ بیت المقدس کا شہر، تاہم صلح سے فتح کرنے کی صورت میں اس بات کو مد نظر رکھا جائے گا کہ اگر صلح کے معاہدے میں زمین کے بارے میں کوئی شرط رکھی گئی ہو۔ یعنی مقررہ مقدار میں خراج دینے پر صلح کی گئی ہو تو صلح کے انہی شرائط کے مطابق معاملہ کرنا فرض ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِنَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُقَاتِلُونَ قَوْماً فَيَتَّقُونَكُمْ بِأَمْوَالِهِمْ دُونَ أَنْفُسِهِمْ وَأَبْنَائِهِمْ وَيُصَالِحُونَكُمْ عَلَى صُلْحٍ فَلاَ تَأْخُذُوا مِنْهُ فَوْقَ ذَلِكَ، فَإِنَّهُ لاَ يَحِلُّ لَكُمْ»** **"کسی قوم سے تمہاری جنگ ہو جائے اور وہ اپنے آپ اور اپنے بچوں کو بچانے کے لیے تم سے کچھ مال کے بدلے صلح کریں تو جس قدر مال دینے پر صلح ہو جائے اس سے زیادہ مال مت لو یہ تمہارے لیے حلال نہیں"**۔ ابو عبید نے اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ صلح والی زمین کے متعلق طریقہ یہ ہے کہ جتنا مال دینے پر صلح ہوئی ہو اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ اگرچہ اس حدیث کی اسناد میں راوی مجہول ہے تاہم صحابہ نے ہمیشہ صلح کی شرائط کی پابندی کی ہے، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے **«وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلاَّ شَرْطًا حَرَّمَ حَلاَلاً أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا»** **"مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام کرے یا کسی حرام کو حلال کرے"** اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے۔ اسی طرح اس حدیث کو کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف المزنی نے بھی اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے۔

پس اگر صلح کے وقت کسی قسم کی شرط نہیں رکھی گئی ہو جیسا کہ بیت المقدس کی فتح کے وقت ہوا تو اس زمین کو جنگ کے ذریعے فتح کی گئی زمین کی طرح سمجھا جائے گا کیونکہ وہ مسلمانوں کے لیے فئے (کا مال) ہو گی۔

یہ حکم جزیرۃ العرب کے علاوہ زمینوں کے لیے ہے کیونکہ جزیرۃ العرب کی زمین پوری کی پوری عشری زمین ہے۔ یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو بزور طاقت فتح کیا اور زمینوں کو ان کے مالکوں کے

پاس ہی رہنے دیا اور کوئی خراج نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زمین کا خراج آدمیوں سے جزیہ لینے کی طرح ہے اور جزیرۃ العرب میں جزیہ نہیں ہے کیونکہ عرب کے مشرکوں کے پاس دو ہی راستے ہیں یا اسلام لائیں یا تلوار سے ان کو ختم کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے **تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ** **''تم ان سے لڑو یا وہ مسلمان ہو جائیں''**۔(الفتح:16) اس لیے عرب کی زمین خراجی زمین نہیں بلکہ ہر اس زمین کی طرح عشری زمین ہے جس کے رہنے والے (بغیر جنگ کے) اسلام قبول کریں۔

عشری زمین پر زکوٰۃ ہے جو ریاست کاشت کار سے عملی پیداوار کے دسویں حصہ کے طور پر وصول کرے گی یہ اس صورت میں ہے کہ زمین بارانی ہو اور اگر زمین کو کسی مصنوعی طریقے سے سیراب کیا جاتا ہو، تب نصف عشر (بیسواں حصہ) وصول کرے گی۔ مسلم نے جابرؓ سے روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«فِيمَا سَقَتْ الأَنْهَارُ وَالْغَيْمُ الْعُشُورُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ نِصْفُ الْعُشْرِ»** **''جس زمین کو دریا یا بارش سے پانی دیا جائے اس پر عشر ہے اور جس کو مشک (موٹر پمپ یا ٹیوب ویل وغیرہ) سے پانی دیا جائے اس پر نصف عشر ہے''**۔ یہ عشر زکوٰۃ ہی ہے اس لیے اس کو بیت المال میں رکھا جائے گا اور اسے اس آیت میں مذکور ان آٹھ اصناف پر ہی خرچ کیا جائے گا۔ ارشاد ہے **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** **''صدقہ (زکوٰۃ) صرف فقیروں کے لیے ہیں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے دل جیتنا مقصود ہو اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اور راہگیر و مسافروں کے لیے۔ یہ فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علم و حکمت والا ہے''**(التوبہ: 60)۔ حاکم و بیہقی اور طبرانی نے ابو موسیٰؓ اور معاذؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو یمن بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو دین کے معاملات سکھائیں تو ان سے فرمایا **«لاَ تَأْخُذَا الصَّدَقَةَ إِلاَّ مِنْ هَذِهِ الأَرْبَعَةِ:**

الشَّعِيرِ، وَالْحِنْطَةِ، وَالزَّبِيبِ، وَالتَّمْرِ»"ان چار چیزوں کے علاوہ کسی چیز پر زکوٰۃ مت لو جو، گندم، کشمش اور کھجور"۔

خراجی زمین پر خراج ہے۔ جسے ریاست زمین کے مالک سے ایک خاص اور مقررہ مقدار میں وصول کرے گی اور یہ مقدار زمین کی ممکنہ پیداوار کے حساب سے مقرر کی جائے گی عملی پیداوار کے لحاظ سے نہیں۔ زمین کی پیداوار کا اندازہ اس طرح لگایا جائے گا کہ زمین کے مالک پر بھی ظلم نہ ہو اور بیت المال پر بھی۔ خراج سال میں ایک مرتبہ زمین کے مالک سے وصول کیا جائے گا خواہ وہ زمین کو کاشت کرے یا نہ کرے، خواہ فصل اچھی ہو یا بری ہو۔ ابو یوسف نے کتاب الخراج میں عمرو بن میمون اور حارث بن مضرب سے نقل کیا ہے کہ "عمر بن خطابؓ نے عثمان بن حنیف کو سواد (علاقے) کی طرف بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اس علاقے کی پیائش کریں اور ہر جریب خواہ زیر کاشت ہو یا قابل کاشت، پر ڈیڑھ درھم مقرر کریں"۔ اور الحاج بن ارطاۃ نے ابنِ عوف سے نقل کیا ہے کہ " عمر بن خطاب نے سواد (علاقہ) کی پیائش کی، ماسوائے حلوان پہاڑی کے۔ پھر ہر جریب خواہ آباد ہو یا غیر آباد، اور اسے کسی بھی ذریعے سے پانی دیا جا سکتا ہو اور اس میں کاشت کی گئی ہو یا نہیں، ایک درھم اور درھم کا کچھ حصہ مقرر کیا"۔ اس کو بھی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔

خراج صرف خراجی زمین پر ہوتا ہے کیونکہ خراج ایک قسم کا کرایہ ہے جو کہ بیت المال کی آمدن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«الْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ» "خراج ایک ضمانت ہے"**۔ اسے احمد اور اصحابِ السنن نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے، نیز حاکم نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ زمین بیت المال کی ملکیت ہوتی ہے لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس لیے اس پر ایک معلوم مقدار میں مال سالانہ کے حساب سے مقرر ہوتا ہے۔ یہ مال کرایہ کے قائم مقام ہوتا ہے اس لیے خلیفہ ہی اس کو مقرر کرتا ہے اور یہ زمین کے پیداوار کے مطابق ہوتا ہے۔

خراج بیت المال میں زکوٰۃ سے الگ رکھا جاتا ہے اور دوسرے اموال کی طرح اس کا خرچ بھی ریاست کی صوابدید پر ہوتا ہے۔

وہ زمین جو جنگ کے ذریعے فتح کی گئی ہو اور اس پر خراج مقرر کیا گیا ہو یہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے اگر زمین کے مالک مسلمان ہو جائیں یا اس زمین کو بیچ دیں تب بھی خراج ساقط نہیں ہو گا کیونکہ اس کی یہ صفت کہ یہ بزور قوت فتح کی گئی ہے یہ قیامت تک باقی رہے گی۔ خراج کے ساتھ ساتھ اس کا عشر بھی فرض ہو گا کیونکہ خراج زمین پر واجب ہے جبکہ عشر مسلمانوں کی زمین کے پیداوار پر واجب ہے جو کہ آیات اور احادیث میں وارد ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں کے واجب ہونے کے اسباب مختلف ہیں۔ اوراحناف نے عشر اور خراج کو جمع نہ کرنے کا جو استدال ایک حدیث کے حوالے سے کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **(لا يجتمع عشر وخراج في أرض مسلم) "مسلمان کی زمین پر عشر اور خراج اکھٹے نہیں ہوں گے"**۔ حقیقت میں یہ حدیث ہی نہیں۔ حدیث کے حفاظ سے یہ ثابت نہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔

پہلے خراج ادا کیا جائے گا اگر خراج کی ادائیگی کے بعد اتنا مال باقی رہے کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو تو فصل یا پھلوں پر جو نصاب کو پہنچے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ اگر نصاب مکمل نہ ہو سکے تو پھر زکوٰۃ نہیں ہو گی۔

اسی طرح اگر مسلمان کسی عشری زمین کا مالک بن جائے تو اس پر زکوٰۃ یعنی عشر یا نصف عشر بھی ہو گی، اور اگر وہ خراجی زمین کا مالک بن جائے تو اس پر زکوٰۃ کے ساتھ خراج بھی ادا کرنا ہو گا۔

اگر کافر کسی خراجی زمین کا مالک بن جائے تو اس پر خراج ادا کرنا ہو گا۔ اور اگر عشری زمین کا مالک بن جائے تب بھی خراج ہی ہو گا عشر نہیں ہو گا کیونکہ کافر پر عشر نہیں۔ بہر حال خراج ہر صورت میں ہو گا، زمین کسی صورت میں فائدے سے خالی نہیں ہو گی۔

خراجی زمینوں میں ایسی مردہ (بنجر) زمین کو کوئی زندہ کرے (آباد کرے) جس پر اس سے پہلے خراج مقرر نہ کی گئی ہو، تو اگر آباد کرنے والا مسلمان ہو تو یہ زمین عشری زمین بن جائے گی جس پر زکوٰۃ ہو گی اور اگر آباد کرنے والا ذمی ہو تو یہ خراجی زمین سمجھی جائے گی اور اس پر خراج مقرر ہو گا۔

اگر کوئی ایسی خراجی زمین کو آباد کرے جس پر بنجر ہونے سے پہلے خراج مقرر کیا گیا ہو تو وہ خراجی زمین ہی ہو گی چاہے آباد کرنے والا مسلمان ہو یا ذمی۔ یہ اس صورت میں ہے کہ زمین کی یہ آبادکاری زراعت کے لیے ہو۔ اگر اس زمین پر آبادی تعمیرات کی شکل میں ہو جیسے کوئی مکان، فیکٹری، سٹور یا باڑہ وغیرہ بنائے تو اس پر نہ خراج ہے اور نہ ہی زکوٰۃ کیونکہ جن صحابہ نے عمر بن خطابؓ کے زمانے میں عراق، مصر کو فتح کیا تو کوفہ، بصرہ اور فسطاط کو تعمیر کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی لے کر وہاں رہائش اختیار کی ان پر نہ خراج لگایا گیا اور نہ ہی وہ زکوٰۃ دیتے تھے کیونکہ رہائشی گھروں اور تعمیرات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

عشری زمین ہو یا خراجی دونوں کی خرید و فروخت اور انہیں بطور میراث حاصل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ زمین کسی بھی دوسری ملکیت کی طرح مالک کی حقیقی ملکیت ہوتی ہے اور ملکیت کے تمام احکام اس پر نافذ ہوتے ہیں۔ عشری زمین کا معاملہ تو واضح اور ظاہر ہے۔ تاہم خراجی زمین بھی ملکیت کے حوالے سے بالکل عشری زمین کی طرح ہے ان دونوں زمینوں میں سوائے دو باتوں کے اور کوئی فرق نہیں۔ پہلی بات عین کے مالک ہونے کے حوالے سے ہے دوسری بات یہ ہے کہ زمین پر کیا واجب ہے (عشر یا خراج)۔ جہاں تک عین کی ملکیت کی بات ہے تو عشری زمین کا مالک عین اور فائدہ (پیداوار) دونوں کا مالک ہوتا ہے جبکہ خراجی زمین کا مالک صرف زمین کی پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ اس لیے عشری زمین کا مالک جب چاہے اپنی زمین وقف کر سکتا ہے کیونکہ وہ اصل اور پیداوار دونوں کا مالک ہے جبکہ خراجی زمین کا مالک اس زمین کو وقف نہیں کر سکتا کیونکہ وقف کرنے کے لیے شرط ہے کہ وقف کرنے والا اس عین یعنی اصل کا مالک ہو جس کو وہ وقف کر رہا ہے اور خراجی زمین کا مالک چونکہ زمین کا مالک نہیں بلکہ صرف پیداوار کا مالک ہے زمین کا مالک بیت المال ہے۔

عشری زمین پر عشر اور نصف عشر واجب ہے۔ دوسرے الفاظ میں زمین کی پیداوار اگر نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ ہے، جبکہ خراجی زمین پر خراج یعنی ریاست کی جانب سے سالانہ کے حساب سے مقرر کیا ہوا مال ہے۔ خواہ زمین کاشت کی گئی ہو یا نہیں یا فصل اُگ گئی ہو یا نہیں۔ خشک سالی ہو یا ہریالی ہر حال میں خراج دینا پڑے گا۔ خراجی اور عشری زمین میں بس ان دو باتوں کا فرق ہے اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں اس کے دیگر

احکامات وہی ہیں جو مال کی ملکیت کے ہیں، اس لیے زمین خراجی ہو یا عشری اس میں تمام شرعی تصرفات اور معاملات جائز ہیں اور دیگر اموال کی طرح اس کے مالک سے اس کا وارث بھی بنا جا سکتا ہے۔

دفعہ نمبر134: آباد کاری اور حد بندی (پتھر وغیرہ رکھ کر) بنجر زمین کا مالک بنا جا سکتا ہے۔ جبکہ آباد زمین کا مالک کسی شرعی سبب سے بنا جا سکتا ہے جیسے میراث، خریداری یا ریاست کی جانب سے عطا کرنے سے۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے کہ **«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ»** **"جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کا مالک بن گیا"**۔ اس حدیث کو بخاری نے عمرؓ سے موقوفاً روایت کی ہے جبکہ احمد اور ترمذی نے اس کو جابرؓ کے حوالے سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ بھی حدیث ہے کہ **«مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ»** **"جو شخص کسی زمین کے گرد دیوار کھڑی کرے وہ زمین اس کی ہے"**۔ اس حدیث کو احمد اور ابو داؤد نے ایسے اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے جن کو ابن الجارود اور الزین صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا **«عَادِيُّ الأَرْضِ للهِ وَلِرَسُولِهِ، ثُمَّ هِيَ لَكُمْ»** **"بنجر زمین اللہ اور رسول کی اس کے بعد تمہاری ہے"**۔ اسے ابو عبید نے مرسل صحیح اسناد سے نقل کیا ہے۔ ابو یوسف نے الخراج میں سالم بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطابؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا **«من أحيا أرضا ميتة فهي له، وليس لمحتجر حق بعد ثلاث سنين»** **" جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے اور تین سال کے بعد حد بندی کرنے والے کا کوئی حق نہیں"**۔ ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے بنجر زمین کو آباد کیا یا حد بندی کی یعنی اس کے ارد گرد پتھر رکھ کر، رسی باندھ کر یا دیوار کھڑی کر کے، تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور ان احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر زمین بنجر نہ ہو تو وہ حد بندی یا آباد کاری سے اس کا مالک نہیں بن سکتا خواہ اس میں کاشت نہ ہو یا وہ محنت کے ذریعے قابل کاشت ہو سکتی اور اس

کا مالک معلوم نہ بھی ہو۔ زمین اگر مردہ (بنجر) نہ ہو اور اس کا مالک معلوم ہو تو ملکیت کے اسباب میں سے کسی سبب کے ذریعے سے ہی اس کا مالک بنا جا سکتا ہے اس کے بغیر نہیں۔ اگر مالک معلوم نہ ہو تو صرف خلیفہ کی جانب سے عطا کرنے سے ہی اس کا مالک بنا جا سکتا ہے اس کے بغیر نہیں۔ زمین اگر بنجر ہو تو آباد کاری یا صرف قبضہ کرنے سے یعنی بغیر آباد کاری کے بھی اس کا مالک بنا جا سکتا ہے۔ بنجر زمین وہ زمین ہے جس پر کسی کی ملکیت کی کوئی علامت نہ ہو یعنی کھیتی باڑی، یا ہل چلانے یا دیوار کھڑی کرنے یا کاشت کرنے یا کوئی اور تعمیراتی کام وغیرہ کا کوئی نشان نہ ہو۔ اس کا کوئی مالک نہ ہو اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہو۔ یہی بنجر زمین کہلاتی ہے اس کے علاوہ کسی زمین کو بنجر نہیں کہا جاتا، اگرچہ اس کا کوئی مالک نہ ہو یا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہو۔

دفعہ نمبر 135: زمین خواہ خراجی ہو یا عشری، اسے اجرت لے کر زراعت کے لیے دینا ممنوع ہے (یعنی کرایہ پر دینا)۔ اسی طرح زمین کو مزارعت (یعنی ٹھیکے پر دینا) بھی ممنوع ہے، تاہم مساقات مطلقاً جائز ہے۔

اس کے بہت سے دلائل ہیں جو کہ زمین کو کرایہ پر دینے سے منع کرتے ہیں۔ رافعؓ بن خدیج سے روایت ہے کہ **«كُنَّا نُخَابِرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ، فَذَكَرَ أَنَّ بَعْضَ عُمُومَتِهِ أَتَاهُ فَقَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ أَمْرٍ كَانَ لَنَا نَافِعاً، وَطَوَاعِيَةُ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنْفَعُ لَنَا وَأَنْفَعُ. قَالَ: قُلْنَا: وَمَا ذَاكَ؟ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيُزْرِعْهَا أَخَاهُ، وَلا يُكَارِيهَا بِثُلُثٍ وَلا بِرُبُعٍ وَلا بِطَعَامٍ مُسَمًّى»** "رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم زمین اجرت یا کرائے پر کاشت کے لیے دیتے تھے۔ ان کو یاد ہے کہ ان کے ایک چچا ان کے پاس آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ایسے کام سے منع فرمایا جو ہمارے لیے فائدہ مند تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہمارے لیے اس سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ (رافعؓ) کہتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ وہ کیا کام ہے۔ (چچا نے) کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو تو وہ خود کاشت کرے یا

اپنے بھائی کو کاشت کرنے کے لیے دے دیے، اس کو ایک تہائی یا ایک چوتھائی یا کسی بھی کھانے پینے کی چیز کے لیے کرایہ یعنی اجرت پر نہ دے"۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور ابن عمرؓ سے حدیث ہے کہ «مَا كُنَّا نَرَى بِالْمُزَارَعَةِ بَأْساً حَتَّى سَمِعْنَا رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ يَقُولُ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْهَا» "ہم مزارعت میں کوئی برائی نہیں دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہم نے رافعؓ ابن خدیج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے"۔ اسے ابنِ قدامہ نے المغنی میں نقل کیا ہے اور مسلم اور شافعی نے بھی معمولی فرق سے اسے روایت کیا ہے۔ اور جابرؓ کہتے ہیں «نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْمُخَابَرَةِ» "رسول اللہ ﷺ نے زمین کاشت کرنے کے لیے ٹھیکہ پر دینے سے منع فرمایا"۔ اس کی روایت مسلم نے جابرؓ کے حوالے سے کی ہے اس میں لفظ "المخابرۃ" المزاعۃ کے معنی میں ہے۔ اور بخاری نے بھی جابرؓ سے روایت کی ہے کہ وہ تیسرے حصے، ایک چوتھائی حصے یا نصف حصے کے بدلے زمین زراعت کے لیے دیتے تھے، تو نبی ﷺ نے فرمایا «مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيَمْنَحْهَا، فَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ» "جس شخص کے پاس زمین ہو تو وہ اسے کاشت کرے یا کاشت کرنے کے لیے کسی اور کو دے دے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اپنے پاس رہنے دے"۔ اور ابو داؤد نے زید بن ثابتؓ سے روایت کی ہے «نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْمُخَابَرَةِ، قُلْتُ: وَمَا الْمُخَابَرَةُ؟ قَالَ: أَنْ تَأْخُذَ الأَرْضَ بِنِصْفٍ أَوْ ثُلُثٍ أَوْ رُبْعٍ» "رسول اللہ ﷺ نے المخابرۃ سے منع فرمایا ہے، میں نے پوچھا کہ المخابرۃ کیا چیز ہے تو جواب دیا کہ تو کسی کی زمین اس شرط پر کاشتکاری کے لیے لے لے کہ پیداوار کا نصف، تیسرا حصہ یا چوتھا حصہ تمہارا ہو گا"۔ اور رافعؓ سے روایت ہے «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ» "نبی ﷺ نے زمین کو کھیتی باڑی کے لیے کرایے پر دینے سے منع فرمایا" یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور ظہیر بن رافع سے روایت ہے «دَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَا تَصْنَعُونَ بِمَحَاقِلِكُمْ؟ قُلْتُ: نُؤَاجِرُهَا عَلَى الرُّبُعِ، أَوْ عَلَى الأَوْسُقِ مِنْ التَّمْرِ وَالشَّعِيرِ، قَالَ: لا تَفْعَلُوا، ازْرَعُوهَا أَوْ أَمْسِكُوهَا» "رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا کر پوچھا: تم اپنے کھیتوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: ہم پیداوار کے چوتھائی حصے یا کھجور اور جو کی کچھ مقدار کے بدلے اجرت پر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ

نے فرمایا: ایسا مت کرو، کھیتی باڑی خود کرو یا اپنی زمین اپنے پاس ویسے ہی رہنے دو"۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْمُحَاقَلَةِ»** " رسول اللہ ﷺ نے " المحاقلۃ" سے منع فرمایا"۔ اسے نسائی و مسلم نے روایت کیا ہے اور "المحاقلہ" کا مطلب ہے گندم کے بدلے زمین کرائے پر دینا۔ اسی طرح صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيَمْنَحْهَا، فَإِنْ أَبَى فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ»** "جس کے پاس زمین ہو تو وہ خود کاشت کرے یا کسی بھائی کو دے دے۔ اگر نہیں چاہتا تو اپنی زمین اپنے پاس ہی رہنے دے"۔ صحیح مسلم میں جابرؓ سے روایت ہے **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُؤْخَذَ لِلأَرْضِ أَجْرٌ أَوْ حَظٌّ»** "رسول اللہ ﷺ نے زمین کی اجرت (کرایہ) یا (پیداوار میں) حصہ لینے سے منع فرمایا ہے"۔ سنن نسائی میں اسید بن ظہیر سے روایت ہے **«نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، إِذًا نُكْرِيهَا بِشَيْءٍ مِنْ الْحَبِّ، قَالَ: لا، قَالَ: وَكُنَّا نُكْرِيهَا بِالتِّبْنِ، فَقَالَ: لا، وَكُنَّا نُكْرِيهَا عَلَى الرَّبِيعِ، قَالَ: لا، ازْرَعْهَا أَوْ امْنَحْهَا أَخَاكَ»** "رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرائے (اجرت) پر دینے سے منع فرمایا۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ اگر ہم اس کو اناج کے بدلے دے دیں فرمایا: نہیں، ہم نے کہا: ہم تو بُس (خشک گھاس یا جانوروں کا چارہ) کے بدلے دیتے تھے فرمایا: نہیں، ہم تو زمین کی اجرت دوسری زمین کی آباد کاری کی صورت میں لیتے تھے (یعنی ایک حصے کی مزارعت کی اجرت دوسرے حصے کی آباد کاری ہوتی تھی)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، اسے خود کاشت کرو یا اپنے بھائی کو دے دو"۔ اس میں "الربیع" کا جو لفظ ہے اس کا مطلب چھوٹا دریا یعنی وادی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم زمین کا یہ کرایہ مقرر کرتے تھے کہ دریا والے حصے کو بھی آباد کرو"۔ یہ روایت بھی ہے کہ عبد اللہ بن عمرؓ کی ملاقات رافعؓ بن خدیج سے ہوئی تو ان سے پوچھا تو ابن خدیج نے جواب دیا کہ: میں نے اپنے دونوں چچوں سے سنا ہے جو بدر کی جنگ میں شامل تھے، فرماتے تھے کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ»** "رسول اللہ ﷺ نے زمین کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے"۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ ابنِ عمرؓ نے زمین کا کرایہ لینا بند کر دیا۔ یہ تمام احادیث انتہائی

صریح اور واضح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کاشت کے لیے اجرت پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ ان احادیث میں اگرچہ نہی صرف ترک کے طلب پر دلالت کرتی ہے تاہم قرینہ اس طلب کے جازم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جہاں تک مزارعت کے حرام ہونے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابو داؤد نے جابرؓ سے نقل کی ہے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے **"جو شخص مزارعت کو نہیں چھوڑتا تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کرتا ہے"** ابنِ حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے جبکہ منذری نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ اس طرح جب رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایے پر دینے سے منع فرمایا تو پوچھا گیا کہ کچھ اناج لے کر دے سکتے ہیں فرمایا: نہیں، پھر پوچھا گیا کہ جانوروں کے لیے چارہ لے کر دے سکتے ہیں، فرمایا: نہیں، اس کے بعد تاکید سے فرمایا کہ خود کاشت کرو یا اپنے کسی بھائی کو دے دو۔ یہ بہت واضح ہے اور اس میں نہی پر اصرار کیا گیا ہے جو کہ تاکید کے لیے ہے۔ اس حدیث میں واضح طور پر جزم موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں زمین کسی بھی طریقے سے کرایے پر دینے سے منع فرمایا اور انہوں نے کچھ حالات کو اس (اطلاق) سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کی اور ایک حالت رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دی تاکہ آپ ﷺ ان کو اجازت دے دیں، انہوں نے یہ کہا: کچھ اناج لے لیں کرایہ کے طور پر؟ رسول اللہ ﷺ نے انہیں منع فرمایا۔ پھر دوسری صورت کی اجازت مانگی کہ چارہ وغیرہ کرایہ کے طور پر لے لیں، آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ پھر تیسری حالت جو کہ پہلے دونوں حالتوں سے بالکل مختلف تھی، اسکی اجازت طلب کی یعنی عن الربیع (دوسری زمین کی آبادکاری کے بدلے)، آپ ﷺ نے اس صورت سے بھی منع فرمایا اور اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ فرمایا **«ازْرَعْهَا أَوْ امْنَحْهَا أَخَاكَ» " خود کاشت کرو یا اپنے ایک بھائی کو کاشت کرنے کے لیے دے دو"**۔ یعنی صرف یہی صورت ہے، یوں آپ ﷺ کی طرف مختلف حالات اور صورتوں میں بار بار انکار کرنا نہی جازم ہے۔ اور نہی جازم کے ساتھ ساتھ دو حالتوں میں محصور ہے، یہ محصور ہونا بھی جزم پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں کہ **«ازْرَعْهَا أَوْ امْنَحْهَا أَخَاكَ»** صرف **"أو"** ' دو اشیاء کے درمیان کبھی جمع کرنے کے لئے آتا ہے۔

جیسے جالس الکتاب اَو لقسعر اَ'' لکھاری اور شعر اَ کی مجلس اختیار کرو''اور کبھی حصہ یعنی دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کے لئے آتا ہے، یعنی دونوں کو کرنا ممکن نہیں۔ مذکورہ حدیث میں یہ صرف حصہ کے لئے ہیں کیونکہ وہ دونوں نام بیک وقت نہیں ہوسکتے کہ خود بھی کاشت کرے اور بھائی کو بھی دے دے بلکہ ایک ہی ہو سکتا یعنی خود کاشت کرے یا بھائی کو دے دے۔ حدیث کے اندر نہی کی تکرار اور حصہ دونوں اس بات کا قرینہ ہیں کہ زمین کو کسی بھی طریقے سے کاشت کے لئے کرائے پر دینے کی نہی، نہی جازم ہے۔ ایک اور حدیث بھی اس نہی کے جازم ہونے کی تائید کرتی ہے۔ جو کہ ابو داؤد نے رافع سے روایت کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا: **«أَنَّهُ زَرَعَ أَرْضًا فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ وَهُوَ يَسْقِيهَا، فَسَأَلَهُ: لِمَنْ الزَّرْعُ وَلِمَنْ الأَرْضُ؟ فَقَالَ: زَرْعِي بِبَذْرِي وَعَمَلِي، لِي الشَّطْرُ وَلِبَنِي فُلاَنٍ الشَّطْرُ، فَقَالَ: أَرْبَيْتُمَا، فَرُدَّ الأَرْضَ عَلَى أَهْلِهَا وَخُذْ نَفَقَتَكَ»** ''**اس نے ایک زمین کاشت کی اور اس کو پانی دے رہا تھا کہ نبی ﷺ کا گزر وہاں سے ہوا اور آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کسی کی ہے؟ جواب دیا کہ کھیتی میری ہے کیونکہ بیج اور کام میرا ہے، پیداوار کا آدھا میرا اور آدھا فلاں شخص کا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں نے سود کا لین دین کیا ہے زمین اس کو واپس کرو اور اپنا خرچ لے لو**''۔ نبی ﷺ نے اس معاملے کو سود قرار دیا اور سود قطعی نص سے حرام ہے۔ آپ ﷺ کا رافع سے یہ کہنا کہ زمین واپس کرو اور اپنا خرچ لے لو یعنی کھیتی کے ساتھ زمین واپس کرو معاملے کو فسخ کرنے کا مطالبہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہی جازم ہے اور یہ کام حرام ہے۔ یہ تین احادیث یعنی جابرؓ کی وہ حدیث جس میں المخابرہ اور الضراعۃ پر وعید ہے، نسائی کی حدیث جس میں تکرار اور حصہ ہے اور رافع کی مذکورہ حدیث جس میں زمین کرایہ پر دینے کو سود کا معاملہ قرار دے کر فسخ کیا گیا ہے، اس بات کا قرینہ ہیں کہ نہی جازم ہے اور زمین کو کسی بھی طرح کرائے پر دینا حرام ہے۔ ان احادیث کی منطوق اور مفہوم میں زمین کو کرائے پر دینے کی حرمت میں کوئی ادنی شک بھی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض آئمہ کے نزدیک زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور ہم اسی وجہ سے آگے آئمہ کے ان دلائل کو بیان کریں گے جن پر وہ اعتماد کر کے زمین کو کرایہ پر دینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ ہم صرف تنقید نہیں کریں گے بلکہ یہ ثابت کریں گے کہ زمین کو کرایہ پر دینا بالکل جائز

نہیں۔ جو لوگ زمین کو کرایہ پر دینے کو جائز سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ زمین ایک ایسی عین (اصل) ہے جس کے اصل کو برقرار رکھتے ہوئے منفعت کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے گھر کی طرح زمین کو بھی نقد اجرت پر دیا جاسکتا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ زمین اگرچہ ایسی عین ہے کہ مکان کی طرح اس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی منفعت کو حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن زمین کو اجرت پر دینے کے حرام ہونے کے بارے میں صریح نص موجود ہے۔ اس وجہ سے اگرچہ زمین پر کرایہ کی تعریف منطبق ہوتی ہے لیکن نص نے اس کو حرام قرار دے دیا تو حرام ہو گیا۔ اجارہ (کرایہ) کی دلیل عام ہے جس میں ہر قسم کا کرایہ شامل ہے لیکن زمین کو اجارہ پر دینے کی حرمت کی دلیل نے اس کو خاص کر دیا ہے اور اس تخصیص سے زمین کا اجارہ مستثنیٰ ہو گیا اور حرام ہو گیا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا** "**اور زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ**" (البقرہ: 168)۔ یہ آیت عام ہے اور اس میں ہر چیز داخل ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيْرِ** " **تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت**" (المائدہ:3)، اس آیت میں جو خاص حکم ہے اس نے پہلے عام حکم کی تخصیص کر دی اور ان چند چیزوں کو دوسری عام اشیاء سے مستثنیٰ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کو اجارہ پر دینے کی ان کی دلیل درست نہیں۔ جو لوگ زمین کو اجرت پر دینے کو جائز قرار دیتے ہیں وہ ایک اور دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ حنظلہ بن قیس نے رافع بن خدیج سے روایت کی ہے کہ «**حَدَّثَنِي عَمَّايَ أَنَّهُمْ كَانُوا يُكْرُونَ الأَرْضَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بِمَا يَنْبُتُ عَلَى الأَرْبِعَاءِ أَوْ شَيْءٍ يَسْتَثْنِيهِ صَاحِبُ الأَرْضِ، فَنَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقُلْتُ لِرَافِعٍ: فَكَيْفَ هِيَ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ؟ فَقَالَ رَافِعٌ: لَيْسَ بِهَا بَأْسٌ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ**»"میرے دونوں چچاؤں نے مجھے بتایا کہ وہ نبی ﷺ کے زمانے میں زمین کرایہ پر دیتے تھے کہ فصل کا کچھ حصہ ملے یا زمین والا کسی چیز کو اپنے لئے خاص کرتا تھا۔ (یعنی یہ چیز میری ہے باقی تمہاری) نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ میں (حنظلہ) نے رافع سے کہا اگر کرایہ درہم یا دینار کی شکل میں لیا جائے تو کیسا ہے۔ رافع نے جواب دیا کہ دینار اور درہم لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ بخاری کی اس حدیث میں واضح ہے کہ «**لَيْسَ بِهَا**

بَأْسٌ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ» **"اور دینار اور درہم کے بدلے ہو تو زمین کو کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں"**۔ یہ رافع کا قول ہے اس کی تائید مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حنظلہ بن قیس الانصاری سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ **«سَأَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ، فَقَالَ: لا بَأْسَ بِهِ، إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُونَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ وَأَشْيَاءَ مِنْ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هَذَا وَيَسْلَمُ هَذَا، وَيَسْلَمُ هَذَا وَيَهْلِكُ هَذَا، فَلَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلا هَذَا، فَلِذَلِكَ زُجِرَ عَنْهُ، فَأَمَّا شَيْءٌ مَعْلُومٌ مَضْمُونٌ فَلا بَأْسَ بِهِ»"** **اور نبی ﷺ کے زمانے میں لوگ نہر کے کنارے خود رو گھاس اور نہر کے ابتدائی حصے کے بدلے زمین اجرت پر دیتے تھے تو کبھی یہ چیز مل جاتی یا ضائع ہو جاتی۔ لوگوں کے لئے کرائے کے طور پر اس کے علاوہ کوئی اور چیز دستیاب نہیں تھی اس لئے اس چیز سے منع کیا گیا۔ ہاں اگر چیز معلوم اور محفوظ (قابل اعتماد) ہو تو کوئی حرج نہیں"**۔ یہ پورا کا پورا رافع کا قول ہے، رسول ﷺ کا فرمان نہیں۔ یہ رافعؓ کی رائے ہے جو اس صورت کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور رافعؓ کا قول یا اس کی رائے کوئی شرعی دلیل نہیں۔ خاص طور پر جب یہ صریح نص کے خلاف ہو۔ رافعؓ نے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے زمین کو کرائے پر دینے سے منع کرنے پر یہ سمجھا کیونکہ اس وقت کرائے کے طور پر پیداوار کا کچھ حصہ لیا جاتا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ سونا یا چاندی لے کر کرائے پر دینا جائز ہے۔ رافعؓ کی اس فہم کی دلیل بخاری کی یہ روایت بھی ہے کہ حنظلہ بن قیس الانصاری نے رافع بن خدیجؓ سے سنا، **«كُنَّا أَكْثَرَ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مُزْدَرَعًا، كُنَّا نُكْرِي الأَرْضَ بِالنَّاحِيَةِ مِنْهَا مُسَمًّى لِسَيِّدِ الأَرْضِ، قَالَ: فَمِمَّا يُصَابُ ذَلِكَ وَتَسْلَمُ الأَرْضُ، وَمِمَّا يُصَابُ الأَرْضُ وَيَسْلَمُ ذَلِكَ، فَنُهِينَا، وَأَمَّا الذَّهَبُ وَالْوَرِقُ فَلَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ»"** **"ہم مدینے کے بڑے مزارعین میں سے تھے۔ ہم زمین اس شرط پر کرائے پر دیتے تھے کہ زمین کا یہ (خاص) حصہ مالک کا ہوتا ہے (یعنی اس حصے کی پیداوار زمین کے مالک کی ہو گی) کبھی اس حصے کی پیداوار اچھی ہوتی اور دوسرے حصے کی خراب اور کبھی دوسرے حصے کی اچھی اور اس خاص حصے کی خراب اس لئے ہمیں اس کام سے روک دیا گیا۔ لیکن ان دونوں میں سونا چاندی (دینار، درہم) نہیں تھے"**۔ اس کو بخاری نے نقل کیا۔ اس حدیث کے آخر میں رافع کہتا ہے **«وَأَمَّا الذَّهَبُ وَالْوَرِقُ فَلَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ»"**

اس زمانے میں سونا چاندی نہیں تھے"۔ اسی طرح مسلم کی گزشتہ روایت میں بھی ہے کہ جو چیز معلوم اور قابل اعتماد ہو تو کوئی حرج نہیں۔ یہ سب کا سب رافع کا اپنا فہم اور رائے ہے اور اس کو شرعی دلیل نہیں کہا جا سکتا خاص کر جب اس کے خلاف دلیل موجود ہو۔

زمین کو اجارہ پر دینے کو جو لوگ جائز قرار دیتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجارہ سے منع کرنے کے جو دلائل ہیں وہ صرف اس اجارہ سے منع کرتے ہیں جو اس وقت رائج تھا۔ یعنی آدمی اس شرط پر زمین اجارہ پر لیتا تھا کہ فصل کا آدھا حصہ زمین کے مالک کو دے گا یا زمین کا ایک حصہ اپنے لئے کاشت کرے گا جبکہ دوسرا حصہ مالک کے لئے کاشت کرے گا یا اجارہ کھانے کی کسی چیز یا پیداوار کے کچھ حصے کی صورت میں لے گا۔ اس قسم کے اجارہ سے مذکورہ احادیث میں منع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اقسام جائز ہیں، یعنی سونا چاندی لے کر اجارے پر دینا جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے ان احادیث میں نہی صرف اس وقت کے مروجہ طریقے سے نہیں بلکہ عام ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ فَلْيُزْرِعْهَا أَخَاهُ، وَلا يُكَارِيهَا بِثُلُثٍ وَلا بِرُبُعٍ وَلا بِطَعَامٍ مُسَمًّى»** " جس کے پاس زمین ہو تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو کاشت کے لئے دے دے۔ پیداوار کے تیسرے حصے، چوتھے حصے، یا کھانے کی کسی چیز کے لئے کرائے پر نہ دے"۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْمُخَابَرَةِ»**" رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے" اس کو مسلم نے جابرؓ سے روایت کیا ہے اور **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيَمْنَحْهَا، فَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ»** " جس کے پاس زمین ہو تو اس کو کاشت کرے یا کسی کو دے دے۔ ایسا نہیں کرتا تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"۔ اس کو بخاری نے جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُؤْخَذَ لِلأَرْضِ أَجْرٌ أَوْ حَظٌّ»** " رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کاشت پر اجرت یا کچھ حصے پر دینے سے منع فرمایا"۔ اس کو مسلم نے جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ یہ تمام احادیث اس نہی کے حوالے سے عام ہیں اس لئے جب ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے مزارعت کے مختلف اقسام کے حوالے سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس خاص قسم کے

بارے میں جواب دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جواب میں اضافہ کر کے اس کو ایک عام حکم بنا دیا۔ چنانچہ سنن نسائی میں اسید بن اظہر کی یہ روایت کہ **«نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، إِذًا نُكْرِيهَا بِشَيْءٍ مِنَ الْحَبِّ، قَالَ: لا، قَالَ: وَكُنَّا نُكْرِيهَا بِالتِّبْنِ، فَقَالَ: لا، وَكُنَّا نُكْرِيهَا عَلَى الرَّبِيعِ، قَالَ: لا، ازْرَعْهَا أَوْ امْنَحْهَا أَخَاكَ»** **"رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔ تو ہم نے کہا کیا کچھ اناج کے بدلے کرائے پر دے سکتے ہیں فرمایا نہیں۔ ہم نے کہا کیا چارہ اسباہ کے بدلے دے سکتے ہیں فرمایا نہیں۔ ہم نے کہا کہ وادی کی طرف والے حصے کو آباد کرنے کی شرط پر دے سکتے ہیں فرمایا نہیں بلکہ خود کاشت کرو یا اپنے کسی بھائی کو دے دو"**۔ اسی طرح ظہیر بن رافع سے روایت ہے کہ **«دَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَا تَصْنَعُونَ بِمَحَاقِلِكُمْ؟ قُلْتُ: نُؤَاجِرُهَا عَلَى الرُّبُعِ، أو عَلَى الأَوْسُقِ مِنَ التَّمْرِ وَالشَّعِيرِ، قَالَ: لا تَفْعَلُوا، ازْرَعُوهَا أَوْ أَمْسِكُوهَا»** **" رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلوایا اور فرمایا تم لوگ اپنے کھیتوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا ہم پیداور کی ایک چوتھائی یا چند وسق کھجور یا جو کے لئے کرائے پر دیتے ہیں۔ فرمایا ایسا نہ کرو، خود کاشت کرو یا اپنے پاس رکھو"**۔ اس کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ مذکورہ دونوں حدیثوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مروجہ طریقوں سے منع کرنے کے بعد حدیث کے نص کو عام کیا اور فرمایا خود کاشت کرو یا اپنے بھائی کو دے دو یا خود کاشت کرو یا اپنی زمین اپنے پاس رکھو۔ اس لیے یہ حدیث عام ہیں صرف ان کے رائج الوقت طریقوں سے منع نہیں کرتی بلکہ مطلقاً اجارہ اور کرائے سے منع کرتی ہے اس لئے یہ اجارے اور کرائے کی ہر قسم سے منع کرتی ہیں۔ یہ مکمل طور پر سود کے معاملے کی طرح حرام ہے۔ سود میں صرف وہ طریقے منع نہیں کئے گئے ہیں جو اس وقت رائج تھے بلکہ دلائل عام ہیں اور ہر قسم کا سود اس میں شامل ہے چاہے وہ اس وقت تھا یا نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح زمین کے اجارہ کا معاملہ بھی ہے اس کی ہر شکل ممنوع ہے چاہے وہ اس وقت تھی یا نہیں تھی۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اجارہ کی وہ شکلیں منع ہیں جو اس وقت رائج تھی اور احادیث صرف ان شکلوں کے ساتھ خاص ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ اجارہ کی ہر شکل ممنوع ہے۔ زمین کو کرائے پر دینے کو جائز کہنے والے ابو داؤد اور نسائی کی اس

حدیث سے استدلال کرتے ہیں ،نسائی کے الفاظ یہ ہیں **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ، وَقَالَ: إِنَّمَا يَزْرَعُ ثَلاثَةٌ: رَجُلٌ لَهُ أَرْضٌ فَهُوَ يَزْرَعُهَا، أَوْ رَجُلٌ مُنِحَ أَرْضًا فَهُوَ يَزْرَعُ مَا مُنِحَ، أَوْ رَجُلٌ اسْتَكْرَى أَرْضًا بِذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ»** **"رسول اللہ ﷺ نے زمین کو ٹھیکے اور کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔ کہتے ہیں کہ زمین کو تین طریقوں سے کاشت کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ زمیندار خود کاشت کرے دوسرا یہ کہ کسی کو دے دے جبکہ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سونے چاندی کے بدلے زمین کرائے پر لے لے"** ۔ دوسری یہ حدیث پیش کرتے ہیں جو الحافظ کہتے ہیں کہ ہمیں عبید اللہ بن سعد بن ابراہیم نے خبر دی ہے کہ ان کو ان کے چچا یاماموں نے بتایا کہ مجھے میرے باپ نے بتایا کہ محمد بن عکرمہ نے محمد بن عبد الرحمن ابن لبیبۃ سے اور اس نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے کہ **«كَانَ أَصْحَابُ الْمَزَارِعِ يُكْرُونَ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَزَارِعَهُمْ بِمَا يَكُونُ عَلَى السَّاقِي مِنْ الزَّرْعِ، فَجَاءُوا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَاخْتَصَمُوا فِي بَعْضِ ذَلِكَ، فَنَهَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُكْرُوا بِذَلِكَ وَقَالَ: أَكْرُوا بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ»** **"رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں زمیندار زمینوں کو کرائے پر دیتے تھے اور پانی دینے والے کو فصل کا کوئی حصہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ جھگڑا کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو زمین اس طرح کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔ پھر فرمایا اگر سونا چاندی کے بدلے کرائے پر دے دو"**۔ نسائی نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ **«وَقَدْ رَوَى هَذَا الْحَدِيثَ سُلَيْمَانُ عَنْ رَافِعٍ فَقَالَ عَنْ رَجُلٍ مِنْ عُمُومَتِهِ»** اس حدیث کو سلیمان نے رافع سے اور انہوں نے اپنی کسی چچا سے نقل کیا ہے۔ ایک اور حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو کہ ابو داؤد کی روایت ہے کہتے ہیں کہ ہمیں بتایا عثمان بن ابی شیبہ اور ان کو بتایا یزید بن ہارون نے اور ان کو خبر دی ابراہیم بن سعد نے محمد بن عکرمہ بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام نے محمد بن عبد الرحمان بن ابی لبیبہ سے اور انہوں نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے سعد سے وہ (سعد) کہتے ہیں کہ **«كُنَّا نُكْرِي الأَرْضَ بِمَا عَلَى السَّوَاقِي مِنْ الزَّرْعِ وَمَا سَعِدَ بِالْمَاءِ مِنْهَا، فَنَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ وَأَمَرَنَا أَنْ نُكْرِيَهَا بِذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ»** **"ہم زمین کو کرائے پر دیتے تھے پیداوار کے کچھ**

حصے اور کچھ خودرو گھاس وغیرہ کے بدلے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کام سے منع فرمایا اور فرمایا کہ سونا چاندی کے بدلے دے دو"۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مذکورہ تین احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سونا چاندی کے بدلے زمین کو اجارے پر دینا جائز ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان تین احادیث سے استدلال کر کے سونے چاندی کے بدلے زمین کو اجرت پر دینے کو جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی حدیث کو نسائی جو حدیث کے راوی ہیں نے واضح انداز میں بیان کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین اجارے پر دینے سے منع فرمایا۔ اس کے آگے بقیہ حدیث نہیں بلکہ سعید بن المسیب کا کلام ہے۔ سنن نسائی میں اس حدیث کے آخر میں واضح طور پر موجود ہے کہ اسرائیل نے طارق سے اس حدیث کی وضاحت کی اور اس کے پہلے حصہ کو حدیث جبکہ آخری حصہ کو سعید بن مسیب کا قول قرار دیا۔

رہی بات دوسری اور تیسری حدیث کی تو ان دونوں سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ احادیث محمد بن عبد الرحمن بن لبیبہ یا ابی لبیبہ سے روایت کی گئی ہیں اور ابن حبان نے انھیں ناقابلِ اعتماد کہا ہے۔ اور ابن حجر نے بھی التقریب میں ان کو ضعیف اور زیادہ تر مرسل روایت کرنے والا کہا ہے۔ اور ذھبی نے بھی میزان الاعتدال میں یحییٰ کے حوالے سے کہا ہے کہ اس شخص کی حدیثیں صحیح نہیں اور الدار قطنی نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ کئی اور نے کہا کہ یہ قوی نہیں اور التذیفل علی التھذیب میں (ابن حاتم نے کہا: ہمیں حماد نے بتایا کہ میں نے امام مالک سے اس حدیث کے راوی محمد بن عبد الرحمن جو کہ سعید بن مسیب سے روایت کرتے ہیں کے بارے میں پوچھا، فرمایا قابل اعتماد نہیں۔ جن لوگوں نے اس حدیث کی حسن قرار دیا ہے جیسے البانی، ان کی یہ بات باریک بینی پر مبنی نہیں کیونکہ انہوں نے صرف شواہد پر اعتماد کیا ہے۔ اس حدیث کو حسن نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کا متن دوسرے صحیح حدیث کے بر خلاف ہے۔ اس کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو سونا چاندی کے بدلے زمین کرائے پر دینے کی اجازت فرمائی جبکہ بخاری میں رافع کی روایت میں ہے کہ (سونا چاندی اس وقت نہیں تھے) یعنی اس وقت سونا چاندی کے بدلے زمین کرائے پر دینے کا رواج

نہیں تھا۔ کیونکہ سوناچاندی تو تھے اس کے باوجود اس معاملے میں سوناچاندی کا رواج نہیں تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ ان کو سونے چاندی کے بدلے زمین اجرت پر دینے کا حکم دیتے تو یہ سلسلہ چلتا اور رواج بنتا اور کوئی روایت ملتی۔ ایسی کوئی روایت نہیں بلکہ یہ روایات ہیں کہ اس معاملے میں سوناچاندی کے استعمال کا رواج بالکل نہیں تھا۔

اسی لیے دونوں احادیث کے آخر حصے کو شواہد کی وجہ سے حسن قرار نہیں دیا جاسکتا (اور کہا کہ سونا چاندی کے بدلے کرائے پر) (ہمیں حکم دیا کہ ہم سوناچاندی کے بدلے کرائے پر لین دین) بلکہ یہ دونوں اجزاء ضعیف ہیں اوران کو دلیل کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ جو لوگ زمین کے اجارے کو جائز قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کے جائز ہونے کی دلیل تعامل (لین دینا) ہے جو اس وقت رائج تھا اور اس طرح اجماع صحابہؓ ہے۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پھر ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمان غنیؓ، علیؓ اور معاویہ کے ابتدائی دور تک زمین مزارعت کے لئے کرائے پر دیتے تھے۔ ابن العربی المالکی نے اس کے جائز ہونے کے بارے میں اجماع صحابہؓ ہونے کی روایت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا اجارہ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو لوگوں کا تعامل شرعی دلیل نہیں بلکہ شرعی دلیل قرآن و حدیث کی نص ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابن عمرؓ کے بارے میں جو روایت وہ بیان کرتے ہیں وہ دلیل نہیں کیونکہ ابن عمرؓ زمین کرائے پر دیتے تھے جب حدیث سن لی تو اس کام سے رک گئے۔ یہ بات دو راویوں سے ثابت ہے کہ انہوں نے حدیث میں منع کرنے کے بارے میں معلوم ہونے پر یہ کام چھوڑ دیا۔ رافع کی روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ نے زمین کو کرائے پر دینا چھوڑ دیا تھا۔ اور خود ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ جب تک انھوں نے رافع بن خدیجؓ سے حدیث نہیں سنی مزارعت میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، یعنی حدیث سننے کے بعد اس میں حرج سمجھنے لگے اور مزارعت زمین کو اجارے پر دینے کو ہی کہتے ہیں۔ یوں تعامل (لین دین) اور ابن عمرؓ کے فعل کی بات تو ختم ہوگئی۔ رہی بات اجماع صحابہ کی تو یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اجارے کے جواز پر اجماع صحابہ ہے، یہ غلط ہے کیونکہ صحابہ کا اجماع تو صرف مساقات (پانی دینے) کے بارے میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کے ساتھ مساقات کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ اجماع اس بارے میں ہے، زمین کو اجارے پر دینے کے بارے میں نہیں۔ ابن عربی جو خود اس اجماع کے راویوں میں

سے ایک ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا۔ اس لئے صحابہ نے اس کے جائز ہونے پر اجماع کیا، مزارعت کے بارے میں نہیں۔ اس لئے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں، یہ سرے سے اجارے کے جواز کی دلیل ہی نہیں۔ اجارے کو جائز کہنے والے یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ سونا چاندی کے بدلے اجارہ پر دینے کے بارے میں صحابہ کا اجماع ہے، الفتح میں اس کو نقل کیا گیا ہے۔ ابن المنذر نے کہا ہے کہ صحابہ نے سونے چاندی کے بدلے زمین کو اجارے پر دینے کے جائز ہونے کے بارے میں اجماع کیا۔ اس لئے سونا چاندی کے بدلے زمین کو اجارہ پر دینا جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن احادیث میں زمین کو اجارہ پر دینے سے منع کیا گیا ہے، یہ منع (نہی) مطلق (عام) ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کے پاس زمین ہو تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے ورنہ رہنے دے"۔ اس کو مسلم نے جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا، أَوْ لِيُحْرِثْهَا أَخَاهُ، وَإِلاَّ فَلْيَدَعْهَا»** **"جس کے پاس زمین ہو تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے اگر نہیں کرتا تو اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے"**۔ اس حدیث کو مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ فرمانا کہ **«فَإِنْ أَبَى فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ»** **"اگر ایسا نہیں کرتا تو اپنے پاس رہنے دے"**، اس بات کی دلیل ہے کہ سونا چاندی کے بدلے اجارے کے لئے دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ حدیث نے حکم کو دو چیزوں (صورتوں) میں مقید کر دیا، کسی تیسری صورت کی اجازت نہیں دی کہ **«ازْرَعْهَا أَوْ امْنَحْهَا أَخَاكَ»** **"خود کاشت کرو یا اپنے بھائی کو دے دو"**۔ اور کوئی صورت نہیں، جبکہ مذکورہ اجماع میں تیسری صورت کو جائز قرار دیا گیا ہے (یعنی سونا چاندی کے بدلے دینا)، یوں یہاں تعارض (ٹکراؤ) ہو گیا۔ اب یہ دیکھا جائے گا کہ ترجیح کس کو دی جائے۔ مذکورہ احادیث سند کے لحاظ سے اجماع والی روایت سے مضبوط ہیں اور اجماع تو ہوتا ہی ایک ایسی چیز یا کام کے بارے میں جو موجود ہو اور اس کے جائز یا ناجائز ہونے پر اجماع کیا جائے جو چیز موجود ہی نہیں اس کا اجماع ہوتا ہی نہیں۔ اس زمانے میں سونا چاندی کے بدلے زمین اجارے پر دینے کا رواج ہی نہیں تھا۔ تو اجماع کس چیز پر؟ بخاری میں رافع کی روایت میں ہے کہ **«فَأَمَّا الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ فَلَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ»** **"سونا**

چاندی کا تو رواج ہی نہیں تھا" اور حنظلہ بن قیس کی روایت میں ہے کہ «سَأَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَقَالَ: لا بَأْسَ بِهِ، إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُونَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ وَأَشْيَاءَ مِنْ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هَذَا وَيَسْلَمُ هَذَا، وَيَسْلَمُ هَذَا وَيَهْلِكُ هَذَا، فَلَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلاَّ هَذَا؛ فَلِذَلِكَ زُجِرَ عَنْهُ، فَأَمَّا شَيْءٌ مَعْلُومٌ مَضْمُونٌ فَلا بَأْسَ بِهِ»" میں رافع بن خدیج سے سونا چاندی کے بدلے زمین کو کرائے پر دینے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں کیونکہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہر کے کنارے اگنے والی گھاس اور چھوٹی نہروں کے ابتدائی حصے (جہاں سے نہر شروع ہوتی ہے) کی زمین اجارہ پر دیتے تھے یا کھیتی کا کچھ حصہ لے کر۔ یہ چیز کبھی ہاتھ لگتی تھی کبھی ضائع ہو جاتی تھی اور اس وقت کرائے کے طور پر دینے کے لئے لوگوں کے پاس کچھ اور ہوتا نہیں تھا اس لئے اس سے منع کیا گیا۔ ہاں جو چیز معلوم ہے اور قابل اعتماد ہے تو دینے میں کوئی حرج نہیں"۔ اس حدیث میں لفظ الماذیانات آیا ہے جس کا مطلب ہے وہ گھاس وغیرہ جو نہر کے پاس یا پانی کے بہنے کی جگہ اگی ہے۔ یہ لفظ اقبال الجداول ہے جس کا معنی ہے وہ جگہ جہاں سے چھوٹی نہریں شروع ہوتی ہیں۔ ان دونوں احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کے اس زمانے میں سونا چاندی کے بدلے زمین اجارہ پر دینے کا رواج بالکل نہیں تھا تو پھر کس طرح اس کے جائز ہونے پر اجماع ہو گیا؟ اجماع صحابہ در حقیقت کسی دلیل کا انکشاف ہوتا ہے، ان کی اپنی رائے نہیں ہوتی یعنی کسی ایک مسئلے اور اس کے دلائل پر بحث کے لئے جمع ہوتے تھے بحث تحقیق کے بعد ایک حکم پر متفق ہوتے تھے اس بات پر اجماع کرتے تھے کہ اس فعل کا حکم یہ ہے، یعنی انہوں نے اس فعل کے بارے میں رسول ﷺ سے کچھ سنا ہے، دیکھا یا سکوت کو دیکھا ہے تو اس کے حکم کے بارے میں بتا دیا لیکن دلیل کا ذکر نہیں کیا گیا، اس کو اجماع کہتے ہیں۔ یہ اجماع صرف کسی ایسی چیز کے بارے میں ہو سکتا ہے جس کا وجود ہو کیونکہ شرعی احکامات پیش آئے ہوئے واقعات اور حوادث کے مطابق نازل ہوئے کسی نظریاتی مفروضے کی بنیاد پر نہیں۔ اس لئے اجماع صحابہ لازمی طور پر ایسے کام کے بارے میں ہو سکتا ہے جو کام رائج ہو چونکہ سونا چاندی کے بدلے اجارہ پر دینے کا رواج تھا ہی نہیں جیسا کہ احادیث میں ہے تو پھر اس پر اجماع کہاں سے آ گیا۔ اس وجہ سے عمرؓ نے بر سر

منبر لوگوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے فرمایا کہ **«مَنْ أَحْيَا أَرْضاً مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلاثِ سِنِينَ»** **"جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے اور تین سال کے بعد حد بندی کرنے والے کا کوئی حق نہیں"**۔ اس کو ابو یوسف نے الخراج میں سالم بن عبد اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے اس میں عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ حد بندی کرنے والے کو تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔ اگر اس زمین کو سونا چاندی کے بدلے اجارہ پر دینا جائز ہوتا تو آپؓ تین سال کے بعد ان سے واپس نہیں لیتے۔ آپؓ نے بات کی اور اس پر تمام صحابہؓ کی موجودگی میں عمل بھی کر کے دکھایا، کسی نے مخالفت نہیں کی اس طرح اس پر اجماع ہو گیا۔ زمین کو اجارہ پر دینے کو جائز کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے جواز کی دلیل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ «إِنَّ اللهَ لَمْ يَنْهَ عَنِ المُزَارَعَةِ، وَلَكِنَّهُ قَالَ: أَنْ يَمْنَحَ أَحَدَكُمْ أَخَاهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَأْخُذَ شَيْئاً مَعْلُوماً» " اور اللہ تعالیٰ نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا کہ اپنے بھائی کو دے دو یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ کوئی معلوم چیز اس سے لے"۔ متفق علیہ ابن ماجہ نے بھی اس خبر کو ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب لوگ زمین کو کرائے پر دینے کے بارے میں بہت باتیں کرنے لگے اور ابن عباسؓ نے یہ باتیں سن لی تو فرمایا سبحان اللہ، رسول ﷺ نے تو یہ فرمایا تھا کہ **«أَلا مَنَحَهَا أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، وَلَمْ يَنْهَ عَنْ كِرَائِهَا»** **"تم اس زمین کو اپنے بھائی کو کیوں نہیں دیتے ہو، کرائے پر دینے سے منع تو نہیں کیا تھا"**۔ ایک اور روایت میں ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے مزارعت کو حرام نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھائی کا حکم دیا اور فرمایا **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا، أَوْ لِيَمْنَحْهَا أَخَاهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ»** **" جس کے پاس زمین ہو تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے اگر دینا نہیں چاہتا تو اپنے ہی پاس رکھے"**۔ اسے ترمذی نے ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس طرح ثابت کی روایت بھی **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ الْمُزَارَعَةِ، وَأَمَرَ بِالْمُؤَاجَرَةِ، وَقَالَ: لا بَأْسَ بِهَا»** **"رسول ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا اور اجرت پر دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں"**۔ اس کو مسلم نے ثابت بن الضحاک کے حوالے سے نقل کیا

ہے۔ یہ دلائل اجارہ کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابن عباسؓ کی حدیث ان کی تمام روایات میں ان کے فہم کے بارے میں ہے یعنی انہوں نے رسول ﷺ کے قول سے کیا سمجھا، یہ ساری روایت رسول ﷺ کی حدیث نہیں۔ ابن عباسؓ یہ کہتے ہیں کہ اجارہ کے حرام ہونے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے کیا سمجھ لیا چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ منع نہیں فرمایا... لیکن فرمایا... تو صرف یہ فرمایا... سب سے واضح ان کی آخری روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے قول سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مزارعت سے منع نہیں فرمایا بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا ہے ان تمام روایات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے رسول ﷺ کی حدیث میں یہ قول ہے کہ اجرت پر دینے کا حکم دے دیا یہ اس دوسری حدیث سے ٹکرا رہا ہے جس میں ارشاد ہے کہ رسول ﷺ نے زمین کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔ اس کو مسلم نے رافع کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ایک اور حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر اجرت یا پیداوار کا کچھ حصہ لینے سے منع فرمایا۔ اس کو جابرؓ سے مسلم نے روایت کی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اجرت لینے کا حکم دیا، عام حکم ہے اور ہر قسم کے اجرت اس میں داخل ہے۔ جبکہ دوسری طرف اجرت لینے سے منع فرمایا ہے یا کرایہ لینے سے منع فرمایا ہے یہ بھی عام ہے۔ یعنی اجرت لینے کا حکم بھی عام ہے اور اجرت لینے سے منع کرنے کا حکم بھی عام ہے۔ اگر دوسرا کسی دوسرے پہلو سے خاص ہوتا تو جمع ممکن تھا لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ کسی صورت میں ان دونوں حدیث کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ کس حدیث کو کس پر ترجیح دی جائے۔ چنانچہ نہی (منع کرنے والی) حدیث کو امر (حکم کرنے والی حدیث) پر ترجیح دی جائے گی کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ **«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لا يَرِيبُكَ» "جو چیز تمہیں شک میں ڈال دے اس کو چھوڑو اور جو شک میں نہ ڈالے اس کو اختیار کرو"**۔ اس کو ترمذی نے روایت کی ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس طرح ان کی جانب سے اس حدیث سے استدلال بھی غلط ہے۔ زمین کو اجارہ پر دینے کو جائز قرار دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین کو اجارہ پر دینے کے جواز کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ ہمیں بتایا مدد نے اور بشر المعنی نے عبد الرحمن بن اسحٰق سے انہوں نے ابو عبیدہ بن محمد بن

عمار سے انہوں نے الولید بن ابی الولید سے انہوں نے عروہ بن الزبیرؓ سے کہ زید بن ثابتؓ نے کہا:" اللہ رافع بن خدیج کی مغفرت کرے میں ان سے زیادہ اس حدیث کا علم رکھتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو آدمی آئے ان دونوں نے ایک معاہدہ کیا پھر لڑ پڑے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «إِنْ كَانَ هَذَا شَأْنَكُمْ فَلا تُكْرُوا الْمَزَارِعَ» اگر یہی تمہارا حال ہے تو کرنے کے لئے مزارعت کرو ہی نہیں"۔ یعنی زید بن ثابتؓ نے یہ کہا کہ میں اس (یعنی زمین کے اجارے) کے بارے میں رافع سے زیادہ جانتا ہوں کہ نبی ﷺ نے سن لیا کہ دو آدمی جھگڑ رہے ہیں تو فرمایا **«إِنْ كَانَ هَذَا شَأْنَكُمْ فَلا تُكْرُوا الْمَزَارِعَ» "اگر یہ حالت ہے تو مزارعت کرو ہی نہیں"**۔ بخاری نے عمر بن دینار سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے کہا اگر آپ مزارعت چھوڑ دو تو کیا ہی اچھا ہو تا کیونکہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا ان سب سے زیادہ علم رکھنے والا (یعنی ابن عباسؓ) نے مجھے بتایا ہے کہ نبی ﷺ نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا بلکہ یوں فرمایا کہ **«أَنْ يَمْنَحَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَأْخُذَ عَلَيْهَا خَرَاجاً مَعْلُوماً» "اور تم میں سے کوئی شخص زمین اپنے بھائی کو دے دے یہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اس سے کہ وہ اس پر ایک مقررہ خراج لے"**۔ خراج سے لغت میں مراد کرایہ ہے۔ یعنی اجرت لے کر دینے سے مفت اپنے بھائی کو دینا زیادہ بہتر ہے۔ یہ دونوں احادیث اجارہ کے جواز کی دلیل ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زیدؓ کی حدیث سرے سے اس کے جواز پر دلالت ہی نہیں کرتی بلکہ حدیث کی منطق تو اجارہ کے ممنوع ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کے مفہوم کی جو شرط ہے، یعنی اگر تمہارا یہ حال ہے، ان احادیث کی وجہ سے معطل ہے جن میں مطلقاً مزارعت کو منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح غالبت (کثرت) کی وجہ سے بھی معطل ہے یعنی اجارے کا جو رواج اس زمانے میں تھا اسی سے غالباً جھگڑا اور اختلافات ہوتے رہتے تھے۔ کیونکہ زمین کا ایک حصہ سرسبز اور ہرا بھرا ہوتا تھا جبکہ دوسرا حصہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ تو یہ جھگڑا وغیرہ عام بات تھی۔ یہ بالکل ایک آیت کی طرح ہے جس میں بھی شرط کا مفہوم معطل ہے۔ **وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا "تمہاری لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو"**(النور: 33) اس

میں بھی شرط کا مفہوم معطل ہے کیونکہ وہ زیادہ تر ان کو مجبور ہی کرتے تھے۔ اس طرح زنا کی حرمت کے دوسرے عام نصوص میں بھی یہ شرط معطل ہے (یعنی ان کو کسی بھی صورت میں زنا پر مجبور نہ کرو)۔ دوسری حدیث جو کہ عمر بن دینار کی روایت ہے اس کا بھی ہر گز مطلب یہ نہیں کہ بھائی کو دینا بھی جائز ہے اور اجرت لینا بھی جائز ہے، لیکن بھائی کو دینا افضل ہے۔ اس حدیث کا یہ معنی نہیں، بلکہ وہ تو اجرت لینے کو حرام قرار دیتی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ کہ اپنے بھائی کو دینا بہتر ہے، اس کا مقررہ اجرت لینے سے ہے اور یہ جملہ خیر یہ ہے، جو طلب کے معنی میں ہے۔ گویا کہ یوں فرمایا کہ اپنے بھائی کو دے دو اس پر کوئی خراج مت لو۔ اس حدیث میں بغیر بدلے کے مفت میں عطا کرنے کا مطالبہ ہے اور اجرت لینے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اس نہی (منع) کی نوعیت کو جاننے کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے اور دوسری احادیث کی قرائن سے اس طلبِ ترک (رک جانے) کا جازم ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اجرت نہ لو کا حکم مطلق ہے بالکل اس قول کی طرح کہ **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيُزْرِعْهَا أَخَاهُ، وَلا يُكَارِيهَا بِثُلُثٍ وَلا بِرُبُعٍ وَلا بِطَعَامٍ مُسَمًّى»** **"جن کے پاس زمین ہو تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے پیداوار کے تیسرے یا چوتھے حصے یا کھانے پینے کی کسی چیز کے بدلے نہ دے"** اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيَمْنَحْهَا، فَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ»** **" جن کے پاس زمین ہو تو کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے، ایسا نہیں کرتا تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"**۔ اور رافع کی روایت میں ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ»** **"نبی ﷺ نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے"** متفق علیہ ہے۔ صحیح مسلم میں جابرؓ سے روایت ہے کہ **«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُؤْخَذَ لِلأَرْضِ أَجْرٌ أَوْ حَظٌّ»** **"رسول اللہ ﷺ نے زمین (مزاعت) کی اجرت یا کوئی حصہ لینے سے منع فرمایا"**۔ پھر یہ روایت کہ عبداللہ بن عمرؓ نے رافع بن خدیج سے ملاقات کی اور ان سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ كِرَاءِ الأَرْضِ»** **"میرے دونوں چچاؤں نے، جو کہ بدری ہیں، بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا"** اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

جو لوگ زمین کو اجارے پر دینے کو جائز سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اجارے کے جائز ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو شیخین نے ابن عمرؓ سے نقل کی ہے، جس میں ہے **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَامَلَ أَهْلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ»** **"رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ اس زمین سے نکلنے والے پھل یا فصل کے کچھ حصے پر معاہدہ کیا"**۔ ابو جعفر نے کہا **«عَامَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَهْلَ خَيْبَرَ بِالشَّطْرِ، ثُمَّ أَبُو بَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٌّ، ثُمَّ أَهْلُوهُمْ، إِلَى اليَوْمِ يُعْطُونَ الثُّلُثَ وَالرُّبُعَ»** **"رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ پیداوار کے ایک حصے پر معاہدہ کیا پھر ابو بکرؓ نے پھر عمرؓ نے اس کے بعد عثمانؓ و علیؓ نے بھی، اس کے بعد آج تک وہ تیسرا اور چوتھا حصہ دیتے ہیں"**۔ اس کو ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح اور مشہور بات ہے۔ بخاری نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَامَلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ، فَكَانَ يُعْطِي أَزْوَاجَهُ مِائَةَ وَسْقٍ ثَمَانُونَ وَسْقَ تَمْرٍ وَعِشْرُونَ وَسْقَ شَعِيرٍ، فَقَسَمَ عُمَرُ خَيْبَرَ، فَخَيَّرَ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ أَنْ يُقْطِعَ لَهُنَّ مِنْ الْمَاءِ وَالأَرْضِ أَوْ يُمْضِيَ لَهُنَّ؟ فَمِنْهُنَّ مَنْ اخْتَارَ الأَرْضَ، وَمِنْهُنَّ مَنْ اخْتَارَ الْوَسْقَ، وَكَانَتْ عَائِشَةُ اخْتَارَتْ الأَرْضَ»** **"اور رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے جو ان کی زمین میں سے پھل اور کھیتی ہو گی، اس کے نصف پر معاملہ فرمایا اور آپ ﷺ اس میں سے اپنی بیویوں کو سو وسق (پیمانہ) دیتے جس میں سے اسی وسق (ایک خاص مقدار) کھجور اور بیس وسق جو ہوتا تھا۔ پھر عمر بن الخطابؓ نے خیبر کی زمین کو تقسیم کیا اور نبی ﷺ کی ازواج کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو زمین اور پانی لے لیں یا پہلے کی طرح فصل ہی لے لیں۔ کسی نے زمین لی اور کسی نے فصل (پیداوار) لے لی عائشہؓ نے زمین لے لی"**۔ یہ حدیث پیداوار کے کچھ حصے کے بدلے زمین اجارہ پر دینے کی دلیل ہے اور یوں ہر قسم کے اجارے کے جائز ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خیبر کی زمین پر درخت ہی درخت تھے جن کو پانی دیا جاتا تھا۔ اور درختوں کے درمیان تھوڑی بہت زمین تھی جس کو کاشت کیا جاتا تھا۔ اس کی تائید ان بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ روایت" اور نبی ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ کھجور اور درختوں کے پھل کے آدھے حصے کی شرط پر

معاہدہ کیا" اس کو الدارا قطنی نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ابن عباسؓ کی حدیث میں زمین اور کھجور کے درخت کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے خیبر میں رسول ﷺ نے اجارے کا جو معاہدہ کیا وہ درحقیقت مساقات (درختوں کو پانی دینا) کا معاہدہ تھا، نہ کہ مزارعت کا۔ یعنی درختوں والی زمین کے لئے اجرت دینا، نہ کہ خالی زمین کے لئے اجرت دینا۔ بلکہ ایسے درختوں کو پانی دینے کی اجرت دینا جس کے ساتھ کچھ زمین بھی ہو اور اس کو مساقات کہا جاتا ہے۔ مساقات کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ معلوم مقدار میں پھل کے بدلے درختوں کو اجرت دے کر پانی دینے اور دیکھ بھال کے لئے لینا دینا جائز ہے۔ وہ زمین درختوں کے ضمن میں آئے گی جس زمین پر درخت ہیں بشرطیکہ جتنی زمین پر درخت ہیں وہ خالی زمین سے بڑی ہو یعنی زیادہ ہو تاکہ یہ اجرت پر لینا درختوں کا ہو زمین کا نہ ہو، اسی کو مساقات کہتے ہیں اور یہ جائز ہے۔ جو چیز ممنوع ہے، وہ زمین کو اجرت پر دینا ہے، درختوں کو پانی دینے کی اجرت دینا نہیں۔ بخاری کی مذکورہ حدیث پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین پر درخت تھے، جتنی زمین پر درخت تھے وہ خالی زمین سے بڑی تھی اور اس کے ساتھ پانی بھی تھا جو ان درختوں کو سیراب کرنے کے لئے تھا اور یوں یہ مساقات تھا۔ حدیث پر غور کیجئے آپ ﷺ اپنی ازواج کو اس میں سے سو وسق دیتے تھے، اسی وسق کھجور، اور بیس وسق جو۔ اسی طرح ان کے لئے زمین اور پانی میں حصہ مقرر تھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خیبر کی زمین پر بہت درخت تھے، اس کا اجارہ مساقات تھا، مزارعت یا زمین کا اجارہ نہیں۔

اس لیے اس حدیث سے زمین کے اجارہ کے لئے استدلال کرنا بالکل صحیح نہیں۔ یوں زمین کے اجارے کی حرمت بالکل ظاہر اور واضح ہو گئی اور اس دفعہ کے دلائل بھی۔

جہاں تک مساقات کی بات ہے، وہ یہ ہے کہ درختوں کو ان کے پھل کے ایک حصے کے بدلے پانی دینے کے لئے دینا یا درختوں اور انکے درمیان تھوڑی بہت خالی زمین کو، جو کہ درختوں کے تابع ہو، کو پانی دینے کے لئے پھل اور فصل کے کچھ حصے کی شرط پر دینا۔ اس کی دلیل ایک تو یہ ہے کہ شرعاً مساقات اسی کو کہتے ہیں، اور مساقات کے جواز پر کئی احادیث بھی ہیں۔ جیسا کہ بخاری میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے **«قَالَتْ**

الأَنْصَارُ لِلنَّبِيِّ ﷺ : اقْسِمْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ إِخْوَانِنَا النَّخِيلَ، قَالَ: لا، فَقَالُوا: تَكْفُونَا الْمَئُونَةَ وَنَشْرَكُكُمْ فِي الثَّمَرَةِ، قَالُوا: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا»"انصار نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ ان کھجور کے درختوں کو ہمارے اور ہمارے بھائیوں (مہاجرین) کے درمیان تقسیم کیجئے۔ فرمایا نہیں، انصار نے کہا پھر ان درختوں کو پانی دو، پھل میں تم ہمارے ساتھ شریک بنو گے۔ مہاجرین نے کہا ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے" ۔ بخاری نے نافع سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے ان کو بتایا کہ «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَامَلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ، فَكَانَ يُعْطِي أَزْوَاجَهُ مِائَةَ وَسْقٍ ثَمَانُونَ وَسْقَ تَمْرٍ وَعِشْرُونَ وَسْقَ شَعِيرٍ، فَقَسَمَ عُمَرُ خَيْبَرَ فَخَيَّرَ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ أَنْ يُقْطِعَ لَهُنَّ مِنْ الْمَاءِ وَالأَرْضِ أَوْ يُمْضِيَ لَهُنَّ؟ فَمِنْهُنَّ مَنْ اخْتَارَ الأَرْضَ، وَمِنْهُنَّ مَنْ اخْتَارَ الْوَسْقَ، وَكَانَتْ عَائِشَةُ اخْتَارَتْ الأَرْضَ»" نبی ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ کچھ پھل اور فصل کے بدلے معاہدہ کیا اور اس میں سے اپنی ازواج کو اسی وسق کھجور اور بیس وسق جو دیتے تھے۔ پھر عمر بن خطابؓ نے خیبر کو تقسیم کیا اور ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ زمین اور پانی لیں اور چاہیں تو پہلے کی طرح پھل اور فصل لیں۔ بعض نے زمین اور پانی لیا جبکہ بعض نے پھل اور فصل، عائشہؓ نے زمین اور پانی لیا"۔ مسلم، ابو داؤد اور نسائی نے روایت کی ہے کہ «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَفَعَ إِلَى يَهُودِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا عَلَى أَنْ يَعْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَلِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَطْرُ ثَمَرِهَا» "رسول ﷺ نے خیبر کے یہود کو خبر کی کہ کھجور (درخت) اور زمین اس شرط پر دی ہے کہ اپنے خرچ پر اس کام کو کرو اور آدھا پھل ہمارا ہو گا"۔ اس طرح احمد اور ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَفَعَ خَيْبَرَ أَرْضَهَا وَنَخْلَهَا مُقَاسَمَةً عَلَى النِّصْفِ» "رسول ﷺ نے خیبر کی زمین اور درخت نصف پھل دینے کی شرط پر یہود کو دے دیئے "۔ یہ ساری احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مساقات صرف درختوں کو پھل کے کچھ حصے کے بدلے اجارے پر دینے کو کہتے ہیں جیسا کہ ابو ہریرہؓ کی حدیث میں انصار کے فعل سے ظاہر ہے، یا مساقات درختوں اور زمین کے کچھ حصے کو پھل یا کچھ پیداوار کے بدلے اجارے پر دینا ہے۔ جیسا کہ نافع کی حدیث میں عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ «عَامَلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ» "اہل خیبر کے ساتھ

پھل اور فصل کے کچھ حصے کے بدلے معاہدہ کیا"۔اس طرح مسلم، ابو داؤد اور نسائی کی حدیث سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ «نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا» لفظ خیبر کے کھجور کے درخت اور زمین ہے۔ ابن عباسؓ کی حدیث میں بھی «أَرْضَهَا وَنَخْلَهَا» زمین اور کھجور کے درخت کا لفظ ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ اجارہ ہیں اور یہ اجارہ یا تو صرف درختوں کا ہوتا ہے یا درختوں کے ساتھ تھوڑی بہت زمین کا یعنی درخت زمین سے زیادہ ہونے چاہیے۔ جیسا کہ نافع کی حدیث میں جو عبد اللہ بن عمرؓ نے روایت کی ہے **«مِائَةَ وَسْقٍ ثَمَانُونَ وَسْقَ تَمْرٍ وَعِشْرُونَ وَسْقَ شَعِيرٍ» سو وسق اسی وسق کھجور بیس وسق جو**۔ ان تمام حدیثوں سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مساقات درختوں کو پھل کی مقررہ مقدار کے بدلے اجارے پر دینا یا درختوں اور تھوڑی بہت زمین کو پھل اور پیداوار کے مخصوص حصے کے بدلے اجارے پر دینے کو کہتے ہیں۔ یہ ساری احادیث مساقات کے جائز ہونے کے دلائل ہیں۔

دفعہ نمبر136: ہر زمیندار کو زمین سے فائدہ اٹھانے (کاشت کرنے) پر مجبور کیا جائے گا۔ زمین سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو تو بیت المال سے ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کی جائے گی۔ ہر وہ شخص جو زمین سے تین سال تک کوئی فائدہ اٹھائے بغیر اسے بیکار چھوڑ رکھے تو زمین اس سے لے کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔

اس کی دلیل یہ ہے جو ابو یوسف نے الخراج میں سالم بن عبد اللہ سے روایت کیا کہ عمر بن خطابؓ نے کھڑے ہو کر منبر پر فرمایا تھا کہ" جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے حد بندی کرنے والے کا تین سال کے بعد کوئی حق نہیں"۔ عمر بن خطابؓ نے صحابہ کرام کی دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں نے یہ سنا اور اس پر عمل بھی کیا اور کسی نے آپؓ کی مخالفت نہیں کی، یوں اس پر اجماع ثابت ہو گیا۔ یہ انتہائی واضح ہے کہ جو شخص کسی بنجر زمین کو آباد کرے یا پتھر رکھے (حد بندی کرے)، یعنی اس پر قبضہ کرے تو وہ زمین کا مالک بن جاتا ہے۔ اس

کے بعد اگر تین سال تک وہ اس کو کاشت نہ کرے یا کسی طرح فائدہ نہ اٹھائے وہ اس شخص سے واپس لے لی جائے گی۔ ملکیت کے لحاظ سے بنجر زمین کو آباد کرنا یا پتھر رکھ کر اس پر قبضہ کرنا ایک ہی بات ہے۔ اس طرح دونوں صورتوں میں اگر وہ تین سال تک اس زمین سے فائدہ نہ اٹھائے تو واپس لی جائے گی۔ عمر بن خطابؓ کے اس قول کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ ملکیت کا حق صرف آباد کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ حد بندی کرنے والا تین سال تک زمین کو استعمال نہ کرے تو واپس لی جائے گی، یعنی حد بندی سے ملکیت نہیں بنتی۔ زمین کو واپس لینے کا تعلق حد بندی سے اس طرح نہیں کیا جائے گا کیونکہ عمر بن خطاب کا یہ قول الإيجاز بالحذف کے باب میں سے ہے (یعنی مختصر یہ ہے) جو کہ زبان فصاحت وبلاغت ہے۔ اس جملے میں گویا عمر بن خطابؓ نے یوں کہا: جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے لیکن (بیکار چھوڑنے کی صورت میں) تین سال کے بعد اس کو کوئی حق نہیں اور جس نے پتھر رکھ کر کسی بنجر زمین پر قبضہ کیا تو وہ بھی اس کی ہے لیکن (بیکار چھوڑنے کی صورت میں تین سال کے بعد اس کو کوئی حق نہیں)۔ عمر بن خطابؓ کا یہ قول اگرچہ صرف اس بنجر زمین کے حوالے سے نص ہے جس کو آباد کرنے کی وجہ سے یا پتھر رکھنے کی وجہ سے یعنی حد بنی کے ذریعے قبضہ کر کے مالک بنا گیا اگر اس زمین کو تین سال بیکار چھوڑے گا تو اس شخص سے یہ زمین واپس لی جائے گی۔ لیکن دوسرے بہت سے نصوص ہیں جو آباد کاری اور حد بندی کے علاوہ ہیں۔ یوں یہ حکم صرف بنجر زمین کے بارے میں ہی نہیں بلکہ آباد (زیر کاشت) زمین کے بارے میں بھی ہے۔ جیسا کہ یحییٰ بن آدم نے عمرو بن شعیب سے نقل کیا ہے کہ **«أَقْطَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ نَاساً مِنْ مُزْيَنَةِ أَوْ جُهَيْنَةِ أَرْضاً فَعَطَّلُوهَا، فَجَاءَ قَوْمٌ فَأَحْيَوْهَا، فَقَالَ عُمَرُ: لَوْ كَانَتْ قَطِيعَةً مِنِّي أَوْ مِنْ أَبِي بَكْرٍ لَرَدَدْتُهَا، وَلَكِنْ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ»** **"رسول اللہ ﷺ نے مزینہ یا جہینہ (قبیلے) کے کچھ لوگوں کو زمین کاٹ کر دی۔ انہوں نے اس کو بیکار ہی چھوڑ دیا تو کچھ لوگوں نے آکر اس کو آباد کر دیا۔ عمرؓ نے فرمایا اگر یہ زمین میں نے یا ابو بکرؓ نے دی ہوتی تو میں تمہیں واپس دلاتا لیکن یہ تو رسول ﷺ نے دی تھی"۔**

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کاٹ کر دینے کے بعد تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر یہ زمین ابو بکرؓ نے دی ہوتی تو ابھی تین سال ہوئے ہوتے۔ اگر میں نے (عمرؓ) نے دی ہوتی تب بھی تین سال نہیں ہوئے

ہوتے۔ اگر تین سال سے کم کا عرصہ گزر چکا ہوتا تو عمر اس زمین کو ان لوگوں کو واپس دلاتا جن کو کاٹ کر دی گئی تھی۔ لیکن یہ زمین رسول ﷺ کی جانب سے دی گئی تھی جس کا مطلب ہے کہ تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب تمہیں زمین واپس نہیں دی جاسکتی ہے بلکہ یہ زمین انہی لوگوں کے پاس رہے گی جنہوں نے اس کو آباد کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عمرؓ کے خلیفہ بننے کے سال دو سال کے بعد کا ہے۔ کیونکہ ابو بکرؓ کی خلافت دو سال تھی یوں یہ زمین تین سال سے زیادہ عرصے تک بیکار (غیر آباد) تھی۔ اس لئے عمرؓ نے ان لوگوں کو زمین واپس نہیں دی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ واقعہ (ریاست کی جانب سے) زمین لینے کا ہے نہ کہ بنجر زمین کا جب کوئی آباد کی گئی ہو یا پتھر رکھ کر بنجر زمین پر قبضہ کیا گیا ہو۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابو عبید نے الاموال میں بلال بن الحارث مزنی سے نقل کیا ہے **«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَقْطَعَهُ العَقِيقَ أَجْمَعَ، قَالَ: فَلَمَّا كَانَ زَمَانُ عُمَرَ قَالَ لِبِلَالٍ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمْ يُقْطِعْكَ لِتَحْجُرَهُ عَلَى النَّاسِ، إِنَّمَا أَقْطَعَكَ لِتَعْمَلَ، فَخُذْ مِنْهَا مَا قَدِرْتَ عَلَى عِمَارَتِهِ وَرُدَّ البَاقِيَ»** **"رسول اللہ ﷺ نے پورا عقیق (مدینہ میں ایک علاقہ) ان کو دیا۔ جب عمرؓ کا زمانہ آگیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول ﷺ نے یہ زمین اس لئے تمہیں نہیں دی تھی کہ تو پتھر رکھ کر (حد بندی کرے) لوگوں کی پہنچ سے اس کو دور رکھے۔ بلکہ اس کو آباد (کاشت) کرنے کے لئے دی تھی۔ اس زمین میں سے جس قدر تم آباد کر سکتے ہو کرو باقی حصہ (بیت المال کو) واپس کر دو"**۔ اس واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے زمین سے فائدہ نہ اٹھانا اس کو واپس لینے کا سبب ہے جیسا کہ عمرؓ نے سمجھا اور اس پر عمل بھی کیا۔ عمرؓ کے پہلے قول کے مطابق زمین کو آباد کرنے کی مہلت تین سال ہے۔

یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ حکم صرف اس زمین کا ہے جو ریاست کی جانب سے دی گئی ہو۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا کوئی واقعہ ہے کہ جس کی بنیاد پر نص کو اس کے ساتھ خاص کیا جاسکے، بلکہ یہ نص عام ہے۔ ہر قسم کی زمین اس میں شامل ہے، زمین کو واپس لینے کی وجہ اس کو بیکار چھوڑنا ہے۔ اس لئے جو زمین بھی بیکار چھوڑی جائے گی وہ واپس لی جائے گی۔ اس کی تائید عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ **«من عطَّل أرضا ثلاث سنين لم يعمرها فجاء غيره فعمرها فهي له»** **" جس نے تین**

سال تک زمین کو آباد کیے بغیر بیکار چھوڑ دی پھر کوئی اور شخص آکر اس کو آباد کرتا ہے تو وہ زمین آباد کرنے والے کی ہوگی"، اس کو یحیٰ بن آدم نے الخراج اور ابن زنجویہ نے الاوال میں عمرو بن شعیب سے نقل کیا ہے۔ عمرؓ کا یہ کہنا کہ زمین ایک مطلق لفظ ہے جس میں ہر قسم کی مملوکہ زمین داخل ہے چاہے کسی نے بنجر زمین کو آباد کرنے سے یا حد بندی سے مالک بن گیا ہو یا پھر وہ آباد زمین ہو ریاست کی جانب سے دی گئی ہو یا میراث، خریدنے یا ھبہ وغیرہ سے اس کا مالک بن گیا ہو، سب کا یہی حکم ہے کہ تین سال تک بیکار چھوڑ دیا تو واپس لی جائے گی۔ اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ زمین کسی بھی شخص کی ملکیت ہے چاہے ملکیت کا سبب کچھ بھی ہو اس نے بنجر زمین کو آباد کیا ہو، بنجر زمین پر قبضہ کیا ہو، ریاست کی جانب سے اس کو دی گئی ہو یا اس نے خریدی ہو، اگر مسلسل تین سال تک زمین سے فائدہ نہیں اٹھائے گا تو وہ زمین اس شخص سے واپس لی جائے گی۔ جیسا کہ عمرو بن شعیب کے واقعے میں عمرؓ کے فعل سے ثابت ہے اور آپؓ کے اس قول سے بھی ثابت ہے کہ جس نے زمین کو بیکار چھوڑ دیا اور بلالؓ کا وقعہ بھی اس کی مثال ہے۔ صحابہؓ میں سے کسی نے اس کو برا نہیں سمجھا۔ حالانکہ ان لوگوں سے جبراً اور بلا معاوضہ زمین واپس لی گئی اور واپس لینے والا خلیفہ تھا۔ صحابہؓ کی آنکھوں کے سامنے یہ ہوا، کسی نے مخالفت نہیں کی اس لئے یہ اس معاملے میں اجماع صحابہؓ ہے کیونکہ اجماع سکوتی (خاموش اجماع) اسی کو کہتے ہیں کہ صحابہ کے سامنے کوئی ایک صحابیؓ کوئی ایسا کام کرے جسے عام طور پر برا سمجھا جاتا ہے لیکن کسی صحابیؓ نے اس کو برا نہیں سمجھا اور اس کی مخالفت نہیں کی جس کا مطلب ہے کہ اس کام کی کوئی شرعی دلیل ہے۔ یہ اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ زمین چاہے بنجر ہو یا آباد اگر تین سال تک مسلسل بیکار رکھی جائے تو ریاست جبراً بغیر معاوضے کے وہ زمین واپس لے گی۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ حکم ہر قسم کی زمین کا ہے جو کوئی شخص اس کو آباد کرنے کی وجہ سے مالک بن گیا ہو یا حد بندی کی وجہ سے یا ریاست نے دی ہو یا میراث میں پائی ہو یا پھر خریدی ہو یا کوئی اور وجہ ہو، بہر حال اگر تین سال تک مسلسل معطل (بیکار) رہ گئی تو ریاست جبراً بغیر کسی معاوضے کے واپس لے لے گی۔

مسلسل تین سال بیکار رہنے کی شرط اس لئے ہے کہ نص سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ نص میں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے زمین کو تین سال تک بیکار چھوڑا، بیکار چھوڑنے کا تعلق تین سال سے ہے جس سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ عمرؓ کے دوسرے قول سے یہ مزید واضح ہو جاتا ہے کہ تین سال کے بعد حد بندی کرنے والے کو کوئی حق نہیں، یہاں حق نہ ہونے کو تین سال سے جوڑ دیا ہے۔ اگر اس میں مسلسل کی شرط نہ ہوتی تو تین سال کے بعد واپس نہیں لیا جاتا۔ رہی بات کسانوں کو بیت المال سے ہر ممکن مدد فراہم کرنے کی، اس کی دلیل بھی عمرؓ کا وہ فعل ہے جو عراق کی فتح کے بعد آپؓ نے وہاں کے کاشتکاروں کے ساتھ کیا۔ عراق جب فتح کیا گیا تو آپؓ نے وہاں کی زمین دوسرے مال غنائم کی طرح مجاہدین میں تقسیم نہیں کی بلکہ ان کاشتکاروں کے پاس رہنے دی اور بیت المال سے ان کو مال عطا کیا تا کہ وہ زراعت کو بہتر کر سکیں حالانکہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور کاشتکار بحیثیت کاشتکار (یعنی) زمینوں کے مالک ہونے کے بیت المال کی مدد کے مستحق بھی نہیں تھے وہ فقراء نہیں تھے۔ یہ دونوں معاملات ایسے ہیں کہ جن کی مخالفت ہوتی ہے کیونکہ یہ مال غنیمت اور بیت المال کے احکام کے خلاف ہیں، یعنی غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی زمین کو تقسیم نہ کرنا اور انہی لوگوں کے پاس رہنے دینا جن کی زمینیں تھیں۔ یہی وجہ ہے بعض صحابہؓ نے اس کی مخالفت کی اور عمرؓ اور ان صحابہؓ کے درمیان بحث بھی ہوئی۔ دوسری بات یعنی بیت المال سے ان کسانوں کو مالی مدد فراہم کرنا تھا کہ وہ زراعت کو بہتر طریقے سے کریں۔ اس کی صحابہؓ نے مخالفت نہیں کی یوں اس پر اجماع سکوتی ہو گیا کہ زراعت کی ترقی کے لئے کسانوں کو بیت المال سے مالی مدد دی جائے گی۔ یہ تمام بحث اس دفعہ کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 137: تین طرح کی اشیاء عوام کی ملکیت ہوتی ہیں

ا) ہر وہ چیز جو اجتماعی ضرورت ہو جیسے شہر کے میدان۔

ب) ختم نہ ہونے والی معدنیات جیسے تیل کے کنوئیں۔

ج)وہ اشیاء جو طبعی طور پر افراد کے قبضے میں نہیں ہوتی جیسے نہریں۔

اس دفعہ کی بھی وہ دلیل ہے جو دفعہ نمبر 129 کی ہے ۔ فقرہ (ج) کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی جانب سے عام رستوں کی ملکیت میں لوگوں کی شراکت کو برقرار رکھنا، آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ **"اور جو شخص منی میں پہلے پہنچ کر اپنا اونٹ باندھ لے وہ اس کا ہے"** (یعنی جس نے پہلے جگہ لی وہ جگہ اس کی ہے)۔ اس کو ترمذی نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اپنے صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔ منیٰ حجاز مقدس میں ایک جگہ کا نام ہے مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ سب کی ملکیت ہے جو پہلے پہنچا اور سواری کا جانور باندھ کر بیٹھ گیا وہ اس کا حق ہے کوئی اس کو ہٹا نہیں سکتا۔ فقرہ (ب) کی دلیل وہ روایت ہے جو عمرو بن یحیٰ بن قیس المزنی نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابیض بن حمال سے روایت کی ہے کہ **«اسْتَقْطَعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَعْدِنَ المِلْحِ بِمَأْرِبَ فَأَقْطَعَنِيهُ، فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ، إِنَّهُ بِمَنْزِلَةِ الْمَاءِ الْعَدِّ -يعني أنه لا ينقطع- فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: فَلاَ إِذَنْ»** **"میں نے رسول ﷺ سے مارب معدنی نمک کا پہاڑ مانگا تو رسول ﷺ نے مجھے دے دیا۔ لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ یہ (پہاڑی) ایسی معدنیات ہیں جو ختم نہیں ہوتیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا پھر نہیں"** (یعنی پھر تمہیں نہیں دی جاسکتی)۔ اس کو نسائی نے نقل کیا ہے اور اس العد کے لفظ کا مطلب ہے ختم نہ ہونے والی معدنیات، اور اس کو پانی سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی پانی کی طرح ختم نہیں ہوتی۔ یہاں مراد نمک نہیں بلکہ (اس میں موجود) معدنیات ہے۔ کیونکہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس میں معدنیات ہیں تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ نمک کا تو پہلے سے ہی علم تھا اور آپ ﷺ نے کاٹ کر دیا تھا۔ پھر آپ ﷺ کی جانب سے منع کرنا اس وجہ سے ہے کہ معلوم ہو گیا کہ اس میں نہ ختم ہونے والی معدنیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابو عبید کہتے ہیں کہ **«فَلَمَّا تَبَيَّنَ لِلنَبِيِّ ﷺ أَنَّهُ مَاءٌ عَدٌّ ارْتَجَعَهُ مِنْهُ، لأَنَّ سُنَّةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي الكَلأِ وَالنَّارِ وَالْمَاءِ أَنَّ النَّاسَ جَمِيعاً فِيهِ شُرَكَاءُ، فَكَرِهَ أَنْ يَجْعَلَهُ لِرَجُلٍ يَحُوزُهُ دُونَ سِواهُ»** **" جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس میں معدنیات**

ہیں ان سے واپس لے لی کیونکہ چراگاہیں، پانی اور آگ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ سب لوگ اس میں شریک ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ پسند نہیں کیا کہ ایسی مشترکہ چیز کو کسی ایک شخص کو دے دی جائے جس پر وہ قبضہ کرے اور دوسرے اس چیز سے محروم رہ جائیں"۔ اس اصول کی بنیاد پر ہر قسم کی معدنیات جو غیر منقطع ہوتی ہیں وہ عام ملکیت ہیں اور اگر معدنیات محدود مقدار میں ہوں تو وہ عام ملکیت نہیں ہوتیں۔

فقرہ (ا) کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے جو ابی فراش نے ایک صحابی سے نقل کیا ہے کہ **«الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ: الْمَاءِ وَالْكَلإِ وَالنَّارِ» "تین چیزوں میں سب مسلمان شریک ہیں۔ پانی، چراگاہیں، اور آگ"** (کوئی بھی ایندھن)، اس کو احمد نے نقل کیا ہے، اور مزید ارشاد ہے۔ **«ثَلاثٌ لا يُمْنَعْنَ: الْمَاءُ وَالْكَلأُ وَالنَّارُ» "تین چیزوں سے روکا نہیں جاسکتا، پانی، چراگاہیں، اور آگ"** اس کو ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث معلل (اس میں علت کا بیان) ہے یعنی ان چیزوں کی عوامی ملکیت ہونے کی علت (وجہ) ان کا جماعت کی ضرورت ہونا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر اور طائف میں پانی کو افراد کی ملکیت میں دے کر اس کو مباح کر دیا، وہ لوگ عملاً اس پانی کے مالک بن گئے اور اس سے صرف اپنے کھیتوں اور باغوں کو سیر اب کیا۔ اگر پانی میں شرکت مطلق ہوتی یعنی ہر قسم کے پانی میں تو رسول اللہ ﷺ افراد کو اس کے مالک بننے کی اجازت نہ دیتے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول **«الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ: الْمَاءِ ...» "مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں پانی..."**، یا اس قول میں کہ **«ثَلاثٌ لا يُمْنَعْنَ: الْمَاءُ ...» " تین چیزون سے کسی کو منع نہیں کیا جاسکتا پانی..."** اور آپ ﷺ کی جانب سے پانی کو افراد کی ملکیت میں دینا ان تمام باتوں سے پانی، چراگاہیں اور آگ میں شرکت کی علت معلوم ہو جاتی ہے اور وہ علت ہے اجتماعی ضرورت یعنی ہر وہ چیز جس میں یہ علت پائی جائے گی یعنی سب کی ضرورت ہونا اور وہ چیز مشترک ہو گی۔ جیسا کے شہر کے میدان، جنگلات، چراگاہیں، یہ سب عوامی ملکیت ہیں

یہ عوامی ملکیت کے دلائل ہیں۔ ان تینوں چیزوں کے عوض عوامی ملکیت ہونا، عوامی ملکیت کے دلائل کی چھان بین سے معلوم ہوتی ہے اور یہی اس دفعہ دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 138: کارخانہ بحیثیت کارخانہ فرد کی ملکیت ہے، تاہم کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس میں بننے والے مواد (پیداوار) کا ہے۔ اگر یہ مواد فرد کی املاک میں سے ہو تو کارخانہ بھی انفرادی ملکیت میں داخل ہو گا۔ جیسے کپڑے کے کارخانے (گارمنٹس فیکٹری) اور اگر کارخانے میں تیار ہونے والا مواد عوامی ملکیت کی اشیاء میں سے ہو گا تو کارخانہ بھی عوامی ملکیت سمجھا جائے گا جیسے لوہے کے کارخانے (Steel Mill)۔

اس دفعہ کی دو شقیں ہیں۔

پہلی شق: اصلاً کارخانہ فرد کی املاک میں سے ہے۔

دوسری شق: کارخانے کا بھی وہی حکم ہے جو اس میں بننے والی مواد کا ہے۔

پہلی شق کی دلیل یہ ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اصْطَنَعَ خَاتَمًا»** **"نبی ﷺ نے انگوٹھی بنوائی"**، اس کو بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا **«أَنَّهُ ﷺ اسْتَصْنَعَ المِنْبَرَ»** **"آپ ﷺ نے منبر بنوایا"**، اس کو بخاری نے سہل بن سعد الساعدی سے نقل کیا ہے۔ یہ چیزیں آپ ﷺ نے ان افراد سے بنوائیں جو اپنی ذاتی کارخانوں کے مالک تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگوں کے مختلف چیزوں کے بنانے کے کارخانے تھے اور آپ ﷺ ان کے بارے میں خاموش رہتے تھے۔ کچھ لوگ اسلحہ بناتے تھے جیسے جناب خباب رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے تلواریں بناتے تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی اس کام کو جاری رکھا۔ سیرت ابن ہشام میں عاص بن وائل السھمی کے ساتھ ان کا ایک قصہ بھی لکھا ہے جبکہ عاص ابن وائل نے جناب خباب رضی اللہ عنہ سے تلواریں خریدی، پھر خبابؓ قیمت مانگنے کے لئے اس کے پاس گئے تو اس نے استہزاً

(تکبر سے یا مذاق کرتے ہوئے) کہا کہ جنت میں دے دوں گا۔ ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کارخانے یا فیکٹری کے انفرادی ملکیت ہونے کو برقرار رکھا خواہ وہ کارخانہ اسلحے کا ہو، معدن (دھات) کا ہو، لکڑی (کارپنٹری) کا ہو یا کوئی اور ہو، کارخانے کی انفرادی ملکیت ہونے کے بارے میں کوئی نہی مروی نہیں اور کوئی ایسی نص بھی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ کارخانہ عوامی ملکیت میں داخل ہے نہ ہی ایسی کوئی نص ہے کہ کارخانہ ریاست کی ملکیت ہوتا ہے اس لئے عام ہی رہے گی اور تمام کارخانے انفرادی ملکیت میں داخل ہوں گے۔ یہ تو تھیں پہلے شق کے دلائل، جبکہ دوسرے شق کی دلیل یہ قاعدہ ہے کہ کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس کی پیداوار کا ہے، یہ قاعدہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے اخذ کیا گیا ہے کہ **«لَعَنَ اللهُ شَارِبَ الخَمْرِ وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا» " اللہ تعالیٰ نے شراب پینے والے، اس کو نچوڑنے والے، اور جس کے لئے نچوڑا جارہا ہے (سب پر) لعنت کی ہے"**۔ یہ اس حدیث کا ٹکڑا ہے جو ابو داؤد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے جس کو ابن السکن نے صحیح قرار دیا ہے۔ پوری حدیث اس طرح ہے **«لَعَنَ اللَّهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ» " اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کو خریدنے والے پر، اس کو نچوڑنے والے پر، جس کے لئے نچوڑا جارہا ہے، اس کو اٹھانے والے پر اور جس کے لئے اٹھا کر لے جارہا ہے"**۔ اس میں نچوڑنے سے جو منع کیا گیا ہے وہ مطلق نچوڑنے سے نہیں بلکہ شراب نچوڑنے سے ہے کیونکہ نچوڑنا (جوس نکالنا) حرام نہیں بلکہ شراب کے لئے نچوڑنا حرام ہے۔ نچوڑنا اور نچوڑوانا شراب کے حرام ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ اب نچوڑنے یا نچوڑوانے کا وہی حکم ہو گیا جو اس چیز کا ہے جس کو نچوڑا جارہا ہے۔ نچوڑنے کے حرام ہونے کی وجہ سے نچوڑنے کا آلہ بھی حرام ہو گیا۔ یعنی کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس کی پیداوار کا ہے۔ یہ حدیث اس قاعدے کے لئے دلیل ہے کیونکہ پیداوار کے حرام ہونے کی وجہ سے کارخانہ بھی حرام قرار دیا گیا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل

بالکل نہیں کہ کارخانہ فرد کی ملکیت ہے بلکہ یہ صرف اس بات کی دلیل ہے کہ کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس کے پیداوار کا ہے۔ یہ ہوئی اس دفع کی دوسری شق کی دلیل۔

اس اساس پر کارخانوں کو دیکھا جائے گا کہ اگر ان میں بننے والا مواد عوامی ملکیت میں داخل نہیں تو کارخانے انفرادی ملکیت ہونگے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تلواریں بنانے کے کارخانوں، کپڑا بننے کے کارخانوں (گارنمنٹس فیکٹریز) اور جوتے بنانے کے کارخانوں کو انفرادی ملکیت میں ہی برقرار رکھا۔ اگر کارخانے کی پیداوار عوامی ملکیت کے تحت آتی ہو جیسے تیل نکالنے کے کارخانے (Oil Refinery) اور لوہے کے کارخانے تو یہ عوامی ملکیت ہونگے انفرادی ملکیت میں داخل نہیں ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب شراب کے کارخانے بنانے سے منع فرمایا تو کارخانے کا وہی حکم بیان کیا جو اس کی پیداوار کا ہے۔ یہ اس دفع کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 139: ریاست کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انفرادی ملکیت کی چیز کو عوامی ملکیت کی طرف منتقل کرے کیونکہ عوامی ملکیت میں ہونا مال کی طبیعت اور فطرت اور اسکی صفت میں پائیدار طور پر ہوتا ہے، ریاست کی رائے سے نہیں۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ متفق علیہ حدیث ہے جس کو ابو بکرؓ نے روایت کیا ہے **«إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا...»** **" بے شک تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں ایسے ہی حرام ہیں جیسا اس دن (عرفہ) کی اس شہر مکہ اور اس مہینے (ذوالحج) کی حرمت ہے"**۔ یہ ایک عام خطاب ہے اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اس لئے کسی بھی شخص سے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کا مال چھیننا حرام ہے سوائے شرعی سبب کے اور ریاست کے لئے بھی بغیر شرعی سبب کے کسی شہری کا مال لینا حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے لیے یہ حرام

ہے کہ کسی فرد کے مال کو قومی مفاد کے بہانے سے ریاست کی یا عوامی ملکیت میں دے کیونکہ حدیث نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ مفاد کسی چیز کو حلال نہیں کرتا بلکہ حلال کے لئے شرعی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رعایا کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر ایسا کر سکتا ہے، کیونکہ خلیفہ کا کام لوگوں کے امور کی دیکھ بھال شرعی احکامات کے مطابق کرنا ہے نہ کہ مفادات کو پیش نظر رکھ کر اپنی رائے کے مطابق جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو اس کو حلال کرنے کا خلیفہ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو یہ بہت بڑا ظلم ہو گا اور اس کا احتساب کیا جائے گا اور وہ مال واپس مالک کو دیا جائے گا۔ اس وجہ سے جس چیز کو قومیانہ (نیشنلائز) کہا جاتا ہے، شرع میں وہ کوئی چیز نہیں کیونکہ اگر مال طبعی طور پر اور صفتی طور پر عام ملکیت ہو تو ریاست کا فرض ہے کہ اس کو عوامی ملکیت میں دے۔ ریاست کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ ریاست اس کو قومیائے کیونکہ یہ اس مال کی طبعیت اور صفت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اس کو انفرادی ملکیت میں دینا بھی ریاست کے لئے حرام ہے۔ اگر مال طبعی اور صفت کے لحاظ سے انفرادی ملکیت کا ہے تو ریاست کے لئے حرام ہے کہ اس کو قومیائے یا اس کی نجکاری (پرائیوٹائز) کرے۔ اگر ریاست ایسا کرے گی تو اس کا احتساب ہو گا اور وہ مال اصل مالک کو واپس دیا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے معدنیات کے پہاڑ کو ابیض بن حمال کو دینے کے بعد دوبارہ واپس لیا جب معلوم ہوا کہ یہ نہ ختم ہونے والی معدنیات ہیں۔

دفعہ نمبر 140: امت کے افراد میں سے ہر فرد کو اسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے جو عوامی ملکیت میں داخل ہے۔ ریاست کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی خاص شخص کو عوامی ملکیت سے فائدہ اٹھانے یا اس کا مالک بننے کی اجازت دے۔ اور باقی رعایا کو اس سے محروم رکھے۔

اس دفعہ میں امت کے لفظ سے مراد دارلاسلام کے تمام رعایا ہیں۔ یعنی ریاست کا ہر شہری چاہے مسلمان ہو یا ذمی، ریاست پر لازمی ہے کہ وہ دائمی طور پر اپنے تمام شہریوں کی دیکھ بھال کرے ان کی بنیادی

ضروریات کو پورا کرے اور یہ سب کچھ اسلام کے احکام کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ تمام رعایا اسلام کے تابع ہیں۔ ان بنیادی ضروریات میں سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص عوامی ملکیت کی ان چیزوں سے فائدہ اٹھائے جو اجتماعی ضرورت کے لئے ہیں اس میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔

یہ نہیں کہا جائے گا کہ مذکورہ حدیث **«الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلاَثٍ»** **"تین چیزوں میں مسلمان شریک ہیں"** کا مطلب یہ ہے کہ عوامی ملکیت کی چیزیں صرف مسلمانوں کے لئے ہیں، بلکہ یہ حدیث اور دوسری حدیث **«النَّاسُ شُرَكَاءُ...»** لوگ شریک ہیں، دونوں بریدہ کی اس حدیث کی تخصیص کرتی ہیں جس کو مسلم نے روایت کی ہے **«ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ»** **"پھر ان کو اپنا دار (ملک) چھوڑ کر دارالمہاجرین (دارلاسلام) کی طرف آنے کی دعوت دو۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ اگر ایسا کریں گے تو ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور ان کے بھی وہ فرائض ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں"**۔ دارالمہاجرین سے مراد دارالاسلام ہے، یہ ان لوگوں کے شہری حقوق کے بارے میں نص ہے۔ دنیا کے سارے مسلمان اس میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان جو دارالاسلام کے شہری ہیں یا وہ غیر مسلم جو دارالاسلام میں بحیثیت شہری کے رہتے ہیں، کیونکہ بریدہ کی حدیث میں شہریت کے حقوق سے فائدہ اٹھانا دارلاسلام منتقل ہونے سے مشروط ہے یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام میں موجود مسلمان اور دارالاسلام میں رہنے والا ذمی جس کے پاس شہریت ہے دونوں پر یہ دفعہ منطبق (لاگو) ہوتی ہے۔

یوں دار الاسلام کے ہر شہری کو عوامی ملکیت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے کسی شہری کو مسلمان ہو یا غیر مسلم اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمان شہریوں کا عوامی ملکیت سے فائدہ اٹھانا واضح ہے۔ جبکہ اہل ذمہ کے بارے میں بہت سے نصوص اور رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو سب انہیں پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کو بھی عوامی ملکیت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ چنانچہ وہ بھی بازاروں میں چلتے پھرتے

تھے اور خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور بازار عوامی ملکیت میں سے ہیں۔ احمد نے کعب بن مالک سے روایت کی ہے کہ **«... فَبَيْنَا أَنَا أَطُوفُ السُّوقَ إِذَا رَجُلٌ نَصْرَانِيٌّ جَاءَ بِطَعَامٍ يَبِيعُهُ يَقُولُ: مَنْ يَدُلُّ عَلَى كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ؟...»** **"میں بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک نصرانی شخص کھانے کی کوئی چیز لے کر آیا جو بیچنا چاہتا تھا اور کہہ رہا تھا کعب بن مالک کے بارے میں کون مجھے بتائے گا کہ وہ کہاں ہے"**۔ یہ قصہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان اور اہل ذمہ دونوں بازاروں میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے اور اپنی ضروریات پورا کرتے تھے۔ دونوں مل کر پانی، ایندھن اور چراہ گاہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا **«ثَلاثٌ لا يُمْنَعْنَ: الْمَاءُ وَالْكَلأُ وَالنَّارُ»** **"تین چیزوں سے کسی کو نہیں روکا جائے گا، پانی چراگاہ اور آگ (ایندھن)"**۔ صحابہؓ نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ شام کے نصاریٰ مسلمانوں کے شانہ بشانہ نہروں سے پانی پیتے تھے۔ اسی طرح عراق اور بحرین کے جو لوگ مجوسیت میں ہی رہے اور مصر کے قبطی بھی دریائے نیل سے پانی پیتے تھے اور سب مل کر جنگلات سے جلانے کی لکڑی کاٹتے تھے۔ عام نہروں سے اپنے کھیتوں کو پانی دیتے تھے۔ اسی طرح ذمی بجلی وغیرہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ یہ حدیث میں موجود ایندھن میں داخل ہیں۔

ذمی کو بنجر زمین کو آباد کرنے کا حق حاصل ہے۔ احمد اور ترمذی نے صحیح اسناد کے ساتھ جابرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ **«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ»** **"جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے"**۔ اور بخاری نے عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ أَعْمَرَ أَرْضًا لَيْسَتْ لأَحَدٍ فَهُوَ أَحَقُّ»** **"جس نے اس زمین کو آباد کیا جو کسی کی نہ ہو تو وہ اسی کی ہے"**۔ اسی طرح ابو داؤد طیالسی نے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«العِبَادُ عِبَادُ اللهِ، وَالْبِلادُ بِلادُ اللهِ، فَمَنْ أَحْيَا مِنْ مَوَاتِ الأَرْضِ شَيْئاً فَهُوَ لَهُ، وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ»** **"تمام انسان اللہ کے بندے اور ساری زمین اللہ کی ہے۔ جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے، کسی ظالم کا اس میں کوئی حق نہیں"**۔

یہ تمام دلائل عام ہیں اور رعایا کے تمام افراد اس میں داخل ہیں، مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اسی طرح ریاست کے تمام شہریوں کو، مسلمان ہو یا اہل ذمہ میں سے، مواصلاتی راستوں، خشکی، سمندری، اور فضائی راستوں کے استعمال کا حق ہے۔ زمینی راستوں کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اہل ذمہ ان راستوں کو استعمال کرتے تھے۔ ترمذی نے عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ **« كَانَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ثَوْبَانِ قِطْرِيَّانِ غَلِيظَانِ، فَكَانَ إِذَا قَعَدَ فَعَرِقَ ثَقُلاَ عَلَيْهِ، فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ لِفُلاَنٍ الْيَهُودِيِّ، فَقُلْتُ: لَوْ بَعَثْتَ إِلَيْهِ فَاشْتَرَيْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ إِلَى الْمَيْسَرَةِ...»** **"رسول اللہ ﷺ کے استعمال میں دو موٹے بھاری کپڑے تھے۔ جب بیٹھتے تھے وہ آپ ﷺ پر بوجھ بنتے تھے۔ شام سے کسی یہودی کے لئے پتلا کپڑا آگیا تو آپ ﷺ نے کہا کہ کسی کو بھیج کر وہ ہلکا کپڑا خرید و تا کہ آسانی ہو"**۔ اس طرح سمندری راستوں کا استعمال اہل ذمہ مسلمانوں کے ساتھ صحابہ کے زمانے میں کیا کرتے تھے اور آج فضائی راستوں کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔ ان کو عوامی ڈاک اور دوسرے عام ذرائع مواصلات کو بھی اس پر قیاس کر کے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ دوسری شق یعنی ریاست کی جانب سے عوامی ملکیت کی چیزوں کو بعض افراد کی ملکیت میں نہ دینا اور کچھ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دینا، اس کی دلیل ابیض بن جمال کی وہ حدیث ہے کہ اس نے رسول ﷺ سے مارب کا معدنی نمک مانگا جو ان کو دے دیا لیکن جب رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر نمک (کی پہاڑی) مانگی تو آپ ﷺ نے دے دی جب وہ چلا گیا تو مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو کیا دیا؟ آپ ﷺ نے تو اس کو نہ ختم ہونے والا پانی دے دیا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے واپس لے لیا"۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث جو ترمذی نے عائشہؓ سے روایت کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اس کو ابنِ خزیمہ نے بھی اپنے صحیح میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مِنًى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ»** **"منیٰ میں سے جو پہلے جگہ پکڑ لے وہ اسکی ہے"** اور صعب بن جثامہ کی وہ حدیث جو بخاری نے روایت کی ہے کہ **«لا حِمَى إِلاَّ للهِ وَلِرَسُولِهِ»** **" اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کوئی محفوظ (ممنوع) قرار نہیں دے سکتا"۔**

یہ بات انتہائی واضح ہے کہ اکثر سرمایہ داروں کی ذخیرہ اندوزی، کمپنیوں کی مالداری اور افراد کا بے تحاشہ سرمایہ سب کی وجہ عوامی ملکیت کی اشیاء، جیسے گیس، پٹرول، معدنیات، ذرائع مواصلات اور ٹرانسپورٹ اور پانی کو افراد کی ملکیت میں دینا ہے۔

دفعہ نمبر 141: ریاست کے لئے جائز ہے کہ وہ بنجر زمین یا عوامی ملکیت میں داخل کسی بھی چیز کو رعایا کے مفادات کی خاطر محفوظ کرے (اس کے استعمال کو ممنوع قرار دے)

اس کی دلیل نبی ﷺ کی یہ حدیث ہے **«لا حِمَى إِلاَّ للهِ وَلِرَسُولِهِ» ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کوئی محفوظ (ممنوع) قرار نہیں دے سکتا''**۔ اس کو بخاری نے الصعب بن جثامہ سے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں لفظ الحمی، سے مراد عوامی ملکیت کی کسی چیز کو مخصوص کر کے اس کے عام استعمال کو روکنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور اس کو حرام قرار دیا۔ کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ ایسا کرے، خلیفہ کو بھی نہیں کہ وہ اپنے (ذات کے) لئے خاص کرے، کیونکہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو کوئی حلال نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ریاست عوامی ملکیت کی کسی چیز کو رعایا کے چند لوگوں کے استعمال میں دے کر باقی کو اس سے محروم نہیں کر سکتی۔ ہاں خلیفہ خود بنجر زمین کا یا عوامی ملکیت کی کسی چیز کو صرف مسلمانوں کے مفادات کے لئے مخصوص کر کے اس کے استعمال کو ممنوع قرار دے سکتا ہے، اپنی ذات کے لئے ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی دلیل ابن عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ ''نبی ﷺ نے ایک نشیبی ہری بھری زمین کو مسلمانوں کے گھوڑوں کے لئے مخصوص کر دیا''۔ اس حدیث میں لفظ الانتفاع کہا گیا ہے کہ نشیبی ہونے کی وجہ سے وہاں پانی زیادہ آتا ہے اور ہریالی زیادہ ہوتی ہے۔ اور ابو عبید نے عامر بن عبد اللہ ابن الزبیر سے روایت کی ہے کہ ان کے والد نے ان کو بتایا کہ ایک (عربی دیہاتی) عمرؓ کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین یہ ہمارا ملک ہے ہم جاہلیت میں اس کے لئے لڑتے رہتے تھے اور جب اسلام آیا تو ہم اس پر اسلام لے آئے۔ آپؓ اس کو محفوظ (مخصوص) کیوں نہیں کرتے ہیں؟ عمرؓ نے سر جھکایا سانس لیا اور اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

جب بھی کوئی بات آپؐ کو ناپسند ہوتی تو آپؐ مونچھوں پر ہاتھ مارتے اور سانس لیتے۔ جب دیہاتی نے یہ دیکھا تو اپنا سوال دہرانے لگا۔ تو عمرؓ نے جواب دیا ہر مال اللہ کا ہے اور تمام بندے اللہ کے ہیں۔ اللہ کی قسم اگر جس چیز پر میں اللہ کے راستے میں سواری کرتا ہوں، یہ نہیں ہوتے (یعنی گھوڑے) تو میں ایک انچ زمین بھی محفوظ نہیں کرتا۔ یہ صریح اور واضح ہے کہ ریاست عوامی ملکیت کی کسی چیز جیسے چراگاہ وغیرہ کو مسلمانوں کے مفادات کے لئے محفوظ اور مخصوص کر سکتی ہے۔ رسول ﷺ کے بعد صحابہؓ نے ایسا کیا اور ہر خلیفہ ایسا کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 142: مال کو خزانہ (جمع کر کے رکھنا) بنانے سے روکا جائے گا۔ اگرچہ اس پر زکوۃ دی جاتی ہو۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ "اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجیے"** (التوبہ: 34)۔ یہ آیت ہر حال میں مال کو خزانہ بنا کر رکھنے کو حرام قرار دے رہی ہے۔ اگرچہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور ہم بھی اس کے مخاطب ہیں جیسا کہ آیت کی ابتداء سے معلوم ہوتا ہے ارشاد یوں ہے **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ "اے ایمان والو! اکثر علما اور عابد، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں"** (التوبہ: 34) اور اس بات کے کئی دلائل ہیں کہ سونا چاندی کو خزانہ (جمع کر کے رکھنے کی) کرنے کی حرمت عام ہے چاہے اس پر زکوۃ ادا کی جائے یا نہیں دونوں صورتوں میں حرام ہے۔

پہلی دلیل: یہ آیت عام ہے اور آیت کی نص منطوق اور مفہوم دونوں لحاظ سے اس بات کی دلیل ہے کہ سونا چاندی کو خزانہ کی صورت میں جمع کرنا قطعی منع ہے۔ یہ کہنا کہ زکوۃ ادا کرنے کے بعد خزانہ کرنا مباح

ہے، گویا ایک قطعی طور پر دلالت کرنے والی آیت کے حکم کو ترک کرنا ہے۔ ایسا صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسری دلیل ہو جو اس حکم کو تبدیل کرنے یا اس کو منسوخ کر دے مگر کوئی ایسی صحیح نص کہیں بھی نہیں جو ان کے معنی کو تبدیل کرے اور اس کا احتمال بھی نہیں کیونکہ یہ نص (آیت) قطعی الدلالہ ہے۔ اب صرف ایک صورت ہے جس سے اس کا حکم تبدیل ہو اور وہ ہے نسخ اور اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہیں چنانچہ اس کا حکم برقرار ہے اور وہ حکم ہے کہ مال کو خزانہ بنا کر رکھنا ہر صورت میں حرام ہے چاہے اس کی زکوۃ بھی ادا کی جاتی ہو۔

دوسری دلیل: احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ ابو امامہ سے روایت کی ہے کہ **«تُوُفِّيَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ، فَوُجِدَ فِي مِئْزَرِهِ دِينَارٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَيَّةٌ، قَالَ: ثُمَّ تُوُفِّيَ آخَرُ فَوُجِدَ فِي مِئْزَرِهِ دِينَارَانِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: كَيَّتَانِ» " اہلِ صفہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہو گیا تو اس کے پاجامہ (شلوار) کے اندر ایک دینار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک داغ۔ (ابو امامہ) کہتے ہیں کہ پھر اہل صفہ میں سے ایک اور آدمی کا انتقال ہو گیا پاجامہ میں دو دینار ملے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو داغ"۔**

الطبری نے بھی ابو امامہ الباہلی کے حوالے سے اس قسم کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ اس سے سونا چاندی کو خزانہ بنا کر رکھنے کی حرمت واضح ہو جاتی ہے۔ چاہے ایک یا دو دینار ہی کیوں نہ ہو اگر وہ خزانہ کی نیت سے رکھا گیا ہو یعنی کسی خاص ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نہ رکھا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں اس لئے کہا کہ دونوں صدقات (زکواۃ وغیرہ) کے اوپر زندگی گزار رہے تھے اور ان کے پاس دینار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک داغ، اور دو داغ۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ فرمایا کہ **" جس دن ان کے خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی"**۔ یہ خزانہ کرنے کے متعلق حرام ہونے کی دلیل ہے خواہ وہ زکوۃ کے نصاب کو پہنچے یا نہ پہنچے اور چاہے اس کی زکوۃ دی جائے یا نہیں دی جائے خزانہ کرنا ہر حال میں حرام ہے۔

تیسری دلیل: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ **وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ہیں"** (التوبہ: 34)۔ عطف فاصلے اور جدائی کیلئے ہے یعنی مذکورہ آیت اور اس آیت میں کہ **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ "اور جو لوگ سونا چاندی خزانہ رکھتے ہیں"**۔ مطلب یہ کہ اس آیت میں دو حکم بیان کئے گئے ہیں ایک حکم مال کو خزانہ کر کے رکھنے کا حرام ہونا جبکہ دوسرا حکم اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کا حرام ہونا۔ اس آیت کی نص اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان دونوں کاموں پر دردناک عذاب کی وعید ہے۔ یعنی جو لوگ خزانہ کر کے رکھتے ہیں ان کے لئے بھی اور جو لوگ مال اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں ان کے لئے بھی دردناک عذاب ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص مال خزانہ تو نہیں کرتا لیکن اللہ کی راہ میں مال خرچ بھی نہیں کرتا اس کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔ اس طرح دوسرا شخص ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ تو کرتا ہے لیکن مال خزانہ کر کے رکھ بھی لیتا ہے اس کے لیے بھی دردناک عذاب ہے۔ القرطبی نے کہا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتا اگرچہ خزانہ بھی نہیں کرتا وہ اس عذاب کی وعید میں داخل ہے۔ اس آیت میں سبیل اللہ، اللہ کی راہ کا مطلب جہاد ہے کیونکہ یہ انفاق یعنی خرچ کرنے کے حکم سے جڑا ہوا ہے۔ سبیل اللہ کا لفظ جب بھی خرچ کرنے کے ساتھ آئے گا اس کا مطلب جہاد ہو گا۔ ہاں اگر کوئی قرینہ ایسا موجود ہو جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں مراد جہاد نہیں تو الگ بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں کے لفظ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر اللہ کی راہ میں اپنے خزانے سے خرچ کرتے ہیں تو ان کو عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہاں عطف تفسیری نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے یہ ہے کہ جو لوگ مال خزانہ کر کے رکھ دیتے ہیں اور جو لوگ مال اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے دونوں کو عذاب کی خبر دو۔ اس عطف کو عطف مغايرة (فاصلہ یا جدائی) کا عطف کہا جاتا ہے عطفاً تفسيرياً نہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ مال خزانہ کرنا الگ بات ہے اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا الگ بات ہے دونوں حرام ہیں اور اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مال کو خزانہ کی صورت میں جمع رکھنا ہر صورت میں حرام ہے اگرچہ اس پر زکوۃ دی جائے یا اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے۔

چوتھی دلیل: بخاری نے زید بن وہب سے روایت کرتے ہیں کہ میں الزیدہ (علاقہ) سے گزر رہا تھا کہ ابو ذرؓ سے میری ملاقات ہوئی میں نے کہا کہ تم اس جگہ کیوں آئے ہو۔ فرمایا میں شام میں تھا امیر معاویہ سے اس آیت پر میرا اختلاف ہو گیا **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجیے"**، معاویہ نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا ہمارے اور ان کے یعنی دونوں کے بارے میں ہے۔ اس بارے میں میرے اور ان کے درمیان اختلاف شدید ہو گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے عثمانؓ کو خط لکھ کر میری شکایت کی۔ عثمانؓ نے خط لکھ کر مجھے مدینہ بلایا تو میں مدینہ واپس آ گیا۔ لیکن لوگ اس قدر کثرت سے میرے پاس آنے لگے گویا کہ وہ مجھے پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے یہ بات عثمانؓ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا اگر تم چاہو تو کہیں ایک طرف ہو جاؤ (گوشہ نشینی اختیار کر لو) اس لئے میں اس جگہ آ گیا ہوں۔ اگر میرے اوپر ایک جستی (کالے) کو بھی امیر مقرر کیا جائے تو میں اس کی بات سن لوں گا اور اس کی اطاعت کروں گا۔

دیکھئے ابو ذرؓ اور امیر معاویہ کا اختلاف اس مسئلے پر تھا کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ آیت کے معنی کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر معاویہ یا عثمانؓ کے پاس کوئی صحیح حدیث ہوتی کہ جس چیز کی زکوۃ ادا کی جائے وہ خزانہ نہیں یعنی ابو ذرؓ کی رائے کی مخالفت میں کوئی دلیل ہوتی تو وہ پیش کر کے ابو ذرؓ کو خاموش کرتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی عمومیت اور اطلاق میں ابو ذرؓ اور معاویہ یا ابو ذرؓ اور عثمانؓ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا اور اس کے خلاف کوئی حدیث بھی ان کے پاس نہیں تھی۔

اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آیت عام ہے، ہر قسم کا سونا چاندی اس میں داخل ہے چاہے وہ خام شکل میں ہو یا صفائی کی گئی ہو، چاہے اس پر زکوۃ ادا کی گئی ہو یا نہیں اور چاہے وہ نصاب کو پہنچے یا نہیں ہر صورت میں خزانہ کرنا حرام ہے۔

جو لوگ زکوۃ دینے کی صورت میں خزانہ کرنے کو حلال قرار دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک بھی صحیح دلیل نہیں۔ دلیل کے طور پر جتنی بھی احادیث لائے ہیں وہ سب کی سب انتہائی ضعیف ہونے کی وجہ سے ساقط اور نا قابل اعتماد ہیں۔ ان کی اسناد گری ہوئی ہیں۔ حتی کہ بخاری نے بھی ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے وہ خزانہ جس پر زکوۃ دی گئی ہو۔

لیکن اس باب میں انہوں نے ایک بھی ایسی صحیح حدیث نہیں لائے جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ زکوۃ نکالنے کے بعد خزانہ کرنا جائز ہے۔ جتنی احادیث سے انہوں نے استدلال کیا ہے وہ سب کی سب مشکوک ہیں روایت کے لحاظ سے بھی اور ہدایت کے لحاظ سے بھی، یعنی سند اور متن دونوں لحاظ سے۔

اس طرح ام سلمہؓ کی وہ حدیث جس سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں کہ زکوۃ نکالنے کی صورت میں سوناچاندی ذخیرہ (خزانہ) کرنا جائز ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے عتاب کی روایت سے ثابت بن عجلان اور اس نے عطاء سے اور انہوں نے ام سلمہؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ **«كُنْتُ أَلْبَسُ أَوْضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَكَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ: مَا بَلَغَ أَنْ تُؤَدَّى زَكَاتُهُ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ»** **"اے اللہ کے رسول ﷺ کیا کنز (خزانہ کرنا) حرام ہے؟ فرمایا اگر اس کی زکوۃ ادا کی جائے پھر خزانہ نہیں"**۔ اس میں لفظ '' والأوضاح '' ہے جو ایک قسم کا زیور ہوتا ہے۔ القاموس المحیط (ڈکشنری) میں کہا گیا ہے کہ " الوضح " صبح کی یا چاند کی سفیدی کی حرکت کو کہتے ہیں۔ آگے کہتے ہیں کہ یہ چاندی کا زیور ہوتا ہے۔ اس کی جمع أوضاح ہے اس کو الخلخال (پائل یا گھنگرو) بولتے ہیں۔ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کے راوی ثابت بن عجلان کے بارے میں بہت سے لوگوں نے چہ مگوئیاں کی ہیں اور وہ حدیث میں اکیلے بھی ہیں۔ یعنی کسی اور راوی نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا ہے اس لئے الذہبی نے بھی اس شخص کی اس روایت کا انکار کیا ہے۔

اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان یا جائے تو یہ حدیث اس زیور کے بارے میں ہے جس کو خواتین پہنتی ہیں، پہننے کا زیور اگر نصاب کو پہنچے اور اس پر زکوۃ ادا کی جائے۔ تب اس کو کوئی خزانہ نہیں کہتا اس صورت میں یہ

حدیث آیت کے عموم کے لئے تخصیص ہو گی۔ یعنی پھر مطلب یہ ہو گا کہ کنز (خزانہ) کرنا حرام ہے۔ چاہے سونا چاندی خام یا کندن (صاف کیا ہوا) یا کسی اور صورت میں ہو سوائے زیور کے جس کو خزانہ کرنا اس وقت جائز ہے جب اس کی زکوۃ ادا کی جائے۔ تب یہ حدیث خزانے کی عمومیت سے زیور کو مستثنیٰ کر کے اس پر زکوۃ ادا کرنے کی دلیل ہو گی۔ پھر بھی خزانہ کرنے کے جواز کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اگر چہ زکوۃ ادا کی جائے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

پہلی وجہ: یہ حدیث ایک سوال کا جواب ہے اور ہر نص جو کسی سوال کے جواب میں آئے یا کسی متعین (خاص) موضوع پر آئے اس صورت میں نص اس سوال یا اس خاص موضوع تک محدود ہو گی ہر چیز کے لئے عام نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس کے الفاظ کا تعلق ایک خاص سوال سے ہے یا ایک خاص موضوع سے ہے وہ نص ان دونوں کے ساتھ خاص اور ان دونوں تک محدود ہو گی اس لئے یہ حدیث خاص ہو گی۔ زیور کے ساتھ یعنی زیور کی زکوۃ ادا کی جائے تو اس کا خزانہ کرنا جائز ہے ورنہ خزانہ کرنا حرام ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ شرعی قاعدہ ہے کہ لفظ کے عام ہونے کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ یہاں لفظ عام ہے اس لئے الأوضاح کے ساتھ خاص نہیں ہو گا۔ بلکہ ہر قسم کا زیور اس میں شامل ہو گا۔ وہاں یہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ مذکورہ قاعدہ سبب کے بارے میں خاص سوال کے جواب یا خاص موضوع کے لئے نہیں۔ یہ قاعدہ بالکل صحیح قاعدہ ہے یہ صرف سبب کے لیے ہے۔ کیونکہ اس لفظ کے مفہوم کا اعتبار ہو گا سبب کے خصوصی کا نہیں۔ اور سبب اور متعین موضوع میں بڑا فرق ہوتا ہے اس طرح سبب اور سوال کے جواب میں بھی فرق ہے۔ سبب یہ ہے کہ کوئی واقعہ پیش آئے پھر اس کے بارے میں شرعی حکم نازل ہو مثال کے طور پر اس آیت کے نزول کا سبب **وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ** ”**اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی اَمر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں**“(الاحزاب:36) اس آیت کا سبب نزول جیسا کہ مسند ابی عوانہ میں انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے غلام زیدؓ کے

لئے اپنی پھوپھی زاد (بہن) زینب کا رشتہ مانگا لیکن زینب اس رشتے سے خوش نہیں تھی انکار کرنا چاہتی تھی، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ یہ اس آیت کے نزول کا سبب ہے اب اس پر یہ قاعدہ پورا اترتا ہے۔ جہاں تک اس کے نزول کا سبب ہے۔ جابر بن عبداللہؓ بیمار تھے رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھا کہ اپنے مال کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟ یعنی مال کو کیا کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دیا۔ میراث کی آیت نازل ہوئی۔ یہ متفق علیہ ہے بخاری نے اس کو جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس طرح تمام اسباب نزول جن پر یہ قاعدہ چسپاں ہوتا ہے یہ سوال کے جواب یا متعین موضوع کے برعکس ہیں۔ کیونکہ متعین موضوع کی صورت میں اس موضوع کے بارے میں ہی کلام ہوگا اور وہی محل بحث ہوگا اور حکم بھی اسی موضوع کے ساتھ خاص ہوگا۔

یہی حال متعین سوال کا ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اس خاص سوال معلقاً (لٹکا ہوا) ہوں گے۔ جس طرح سوال تھا جواب بھی اس میں محصور ہوگا۔ اس کی مثال بخاری کی یہ روایت ہے۔ جو ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ «**بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَلَكْتُ، قَالَ: مَا لَكَ؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي وَأَنَا صَائِمٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا؟ قَالَ: لا، قَالَ: فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ؟ قَالَ: لا، فَقَالَ: فَهَلْ تَجِدُ إِطْعَامَ سِتِّينَ مِسْكِينًا؟ قَالَ: لا، قَالَ: فَمَكَثَ النَّبِيُّ ﷺ فَبَيْنَا نَحْنُ عَلَى ذَلِكَ أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيهَا تَمْرٌ وَالْعَرَقُ الْمِكْتَلُ، قَالَ: أَيْنَ السَّائِلُ؟ فَقَالَ: أَنَا، قَالَ: خُذْهَا فَتَصَدَّقْ بِهِ، فَقَالَ الرَّجُلُ: أَعَلَى أَفْقَرَ مِنِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَوَاللَّهِ مَا بَيْنَ لابَتَيْهَا، يُرِيدُ الْحَرَّتَيْنِ، أَهْلُ بَيْتٍ أَفْقَرُ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ ثُمَّ قَالَ: أَطْعِمْهُ أَهْلَكَ**»" ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ میں ہلاک ہوگیا۔ فرمایا کیا ہوا؟ کہا کہ میں نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے ہمبستری کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کوئی غلام ہے جس کو تم آزاد کرسکو؟۔ کہا نہیں۔ فرمایا کیا تم دو مہینے مسلسل

روزہ رکھ سکتے ہو۔ کہا نہیں۔ فرمایا۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو۔ کہا نہیں۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاموش بیٹھے رہے یہاں تک کہ آپ کے پاس ایک ٹوکری میں کھجور لائی گئیں۔ فرمایا وہ سوال پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس شخص نے کہا میں ہوں، فرمایا۔ یہ لو! اس کو صدقہ کرو، اس شخص نے کہا اپنے سے بھی زیادہ فقیر پر اے اللہ کے رسول ﷺ ؟ اللہ کی قسم ان دو محلوں میں میرے گھر والوں سے زیادہ فقیر کوئی نہیں۔ یہ سن کر نبی ﷺ اتنے ہنسے کہ آپ کے داڑھ (اندر کے دانت) مبارک نظر آئے۔ پھر فرمایا اپنے گھر والوں کو کھلاؤ"۔ رسول اللہ ﷺ کا اس شخص کو یہ جواب اس سوال کے ساتھ خاص ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول کے غلام آزاد کرو سوال پوچھنے والے دیہاتی کے سوال کے ساتھ معلق ہے۔ ایک اور مثال رسول ﷺ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ سے تازہ کھجور کو سوکھنے کے بعد بیچنے کے جائز ہونے کے بارے میں سوال کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ، فَقَالَ: فَلاَ إِذاً»** "کیا کھجور سوکھ کر (خشک ہو کر) کم ہو جاتی ہے؟ کہا جی ہاں۔ فرمایا پھر نہیں"۔ یعنی پھر تو جائز نہیں۔ اس حدیث کو ابو یعلٰی نے انہی الفاظ کے ساتھ سعد بن ابی وقاصؓ سے نقل کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا جواب اس پوچھے گئے سوال کے ساتھ خاص ہے۔ یعنی سوال یہ تھا کہ تازہ کھجور (طب) کو خشک کھجور (چھوارے) کے بدلے بیچنا جائز ہے۔ آپ ﷺ کی طرف سے یہ کہنا کہ پھر نہیں اس سوال کے ساتھ متعلق ہے، یہ حکم کے لئے سبب نہیں بلکہ صرف سوال کا جواب ہے۔ سوال کے جواب اور حکم کے سبب کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ عام لفظ اگر کسی سوال کے جواب میں آئے تو وہ حکم کے لئے سبب نہیں ہو گا۔ بلکہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا بیان ہو گا۔ اگر عام لفظ کسی پیش آنے والے معاملے کے لئے شرعی حکم کے طور پر آئے تو یہ شرعی حکم عام ہو گا اور یہ نئے پیش آنے والا امر (معاملہ) حکم شرعی کا سبب ہو گا۔ اس بحث سے سوال کے جواب اور سبب کے درمیان بہت بڑا فرق واضح ہو گیا۔ سبب وہ

چیز ہے کہ جس کا حکم عام ہے، یعنی یہ حکم اس کا بھی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کا بھی۔ جبکہ سوال کا جواب سوال کے ساتھ خاص ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا لفظ اس سوال سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح سمندر کے پانی کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا **«هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ الْحِلُّ مَيْتَتُهُ» "اس کا سمندری پانی پاک اور اس کا مردہ (مچھلی) حلال ہے"**۔ اس کو ترمذی نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ابو عیسیٰ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ یہ حدیث بھی اس چیز کے ساتھ خاص ہے جس کے بارے میں سوال پوچھا گیا، یعنی سمندر کا پانی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے سوال کرنے والے کے سوال سے زیادہ اسکی وضاحت کی پھر بھی سوال جس چیز کے بارے میں پوچھا گیا تھا (سمندر کا پانی)، جواب بھی اسی کے ساتھ خاص ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے بئر بضاعة (ایک کنواں) کے بارے میں پوچھا گیا، جواباً فرمایا **«إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ» "یقیناً پانی پاک ہے"**۔ اس کو ترمذی نے ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو حسن کہا ہے، احمد نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ جواب بھی سوال کے مطابق ہے، یعنی آپ ﷺ نے بئر بضاعة کے پانی کے بارے میں ہی جواب دیا، لیکن سوال کرنے والے کے سوال سے زیادہ جواب دیا پھر بھی جواب کا تعلق صرف اسی سوال سے ہے۔ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا تھا کہ سمندر کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے ان کو جواب وضو اور غسل سے زیادہ عام الفاظ سے دیا۔ "الإمام شرح الإلمام" (ایک کتاب کا نام) میں کہا ہے کہ جب آپ ﷺ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ (أفنتوضأ به؟) کیا ہم اس سے وضو کر سکتے ہیں؟ جواب میں صرف جی ہاں کیوں نہیں فرمایا؟ صرف ہاں کہنے کی صورت میں وہ فقط ضرورت کی حالت میں مقید ہو جاتا اور جی ہاں میں مختصر جواب دینے سے یہ لگتا کہ اس سے صرف وضو کرنا جائز ہے دوسرے ناپاکیوں اور نجاستوں کو پاک نہیں کیا جا سکتا۔ یوں رسول اللہ ﷺ کا جواب سمندر کے پانی کے بارے میں اور بئر بضاعة کے پانی کے بارے میں پوچھے گئے سوال تک ہی محدود

ہو گا اور دوسری اشیاء اس جواب میں داخل نہیں ہوں گی۔ہاں جواب آپ ﷺ نے زیادہ تفصیل سے دیا لیکن موضوع سے باہر نہیں نکلے جواب اور سوال کی مطابقت کی بات نہیں ہو رہی۔ جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کا جواب سائل کے سوال سے بالکل باہر نہیں۔ الشوکانی نے نیل الاوطار میں کہا کہ اس حدیث کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ سائل کے مختصر سوال کا تفصیلی جواب دینا (جائز) ہے جواب کو بھی سوال کی طرح مختصر کرنا ضروری نہیں۔ بخاری نے تو اس موضوع کے لئے ایک باب مقرر کیا ہے کہ سوال کا تفصیلی جواب دینا اور اس باب میں ابن عمرؓ کے حوالے سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ **«أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ؟ فَقَالَ: لا يَلْبَسُ الْقَمِيصَ وَلاَ الْعِمَامَةَ وَلاَ السَّرَاوِيلَ وَلاَ الْبُرْنُسَ وَلاَ ثَوْبًا مَسَّهُ الْوَرْسُ أَوْ الزَّعْفَرَانُ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسْ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَا تَحْتَ الْكَعْبَيْنِ»** " ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے **سوال کیا کہ (بطور) احرام کیا پہننا چاہیئے ؟ فرمایا: قمیض نہ پہنیں، عمامہ نہ باندھے، شلوار نہ پہنیں، ٹوپی نہ اوڑھے نہ ایسا کپڑا پہنے جس کو اس (ایک جڑی بوٹی) یا زعفران سے رنگا گیا ہو، اگر چپل نہ ملیں تو جوتوں کو اس قدر کاٹ کر پہنے کہ ٹخنہ نظر آئے۔**" گویا کہ سوال تو اختیاری حالت کا تھا لیکن اس کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اضطراری (ایمر جنسی) حالت کے بارے میں بھی بتا دیا، پھر بھی سوال سے نہیں ہٹے کیونکہ سفر میں ایمر جنسی حالت ہو سکتی ہے۔ (یہاں تک نیل الاوطار کا بیان تھا) یہ سب اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ جواب سوال کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس لئے کہا کہ سوال سے نہیں ہٹے۔ اگرچہ جواب سوال سے زیادہ اور تفصیلی تھا، پھر بھی جواب اصل جواب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ام سلمہؓ کی جانب سے الأوضاح (زیور) کے بارے میں پوچھے گئے سوال کا رسول اللہ ﷺ کی طرف جواب بھی اسی بالأوضاح تک محدود محصور ہے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں نہیں کیونکہ وہ سوال کا جواب ہے کسی حکم کا سبب نہیں۔ یوں مذکورہ حدیث

سے کیا گیا یہ استدلال کہ زکوۃ ادا کرنے کے بعد خزانہ کرنا جائزہ، ساقط ہو گیا، کیونکہ حدیث زیور کے ساتھ خاص ہے۔

دوسری وجہ: زکوۃ والی آیت عام ہے اور ہر قسم کا خزانہ اس میں داخل ہے اور ام سلمہؓ کی حدیث بالأوضاح کے ساتھ خاص ہے، تو حدیث آیت کی عموم کے لیے مخصوص بن گئی۔ مطلب یہ ہو گا کہ خزانہ کرنا ممنوع ہے مگر یہ زیورات کے علاوہ کے بارے میں ہے، جبکہ زیورات کی زکوۃ ادا کی جائے تو پھر خزانہ کرنا ممنوع نہیں۔ بہر حال حدیث کا عام ہو کر ہر خاص کو شامل ہونا کسی بھی طرح ممکن نہیں، کیونکہ اس کی سب سے آسان دلیل یہ ہے کہ اگر حدیث کو عام مان لیا جائے تو یہ آیت کے لئے ناسخ (منسوخ کرنے والی) ہو گی۔ اس صورت میں یہ ہو گا کہ آیت بھی عام ہے اور حدیث بھی عام ہے اور حدیث آیت کو منسوخ کرتی ہے۔ جبکہ حدیث خبر واحد ہے اور ظنی آیت قطعی ہے۔ حدیث بحیثیت حدیث قرآن کو منسوخ کر ہی نہیں سکتی اگرچہ حدیث متواتر بھی ہو کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے، اس کا لفظ اور معنی دونوں قطعی ہیں اور ہم اس کے الفاظ اور معنی دونوں سے عبادت کرتے ہیں۔ (نمازیں، وغیرہ پڑھتے ہیں) بر خلاف حدیث متواتر کے جو کہ اگرچہ قطعی الثبوت ہے لیکن وحی معنوی ہے، لفظی وحی نہیں اور ہم اس کے الفاظ کے ذریعے عبادت نہیں کرتے (تلاوت نہیں کرتے) اس لئے یہ قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی تو خبر واحد کیسے کرے گی؟ یوں اس حدیث سے استدلال کرنا بھی ساقط ہو گیا۔ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو کہ زکوۃ نکالنے کے بعد خزانہ کرنا جائز ہے کیونکہ حدیث کبھی بھی قرآن کو نسخ نہیں کرتی۔

جو لوگ زکوۃ نکالنے کے بعد سونا چاندی خزانہ کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خزانے کو حرام قرار دینے والی آیت ان آیات کے ذریعے منسوخ کی گئی جن میں زکوۃ دینے کا حکم ہے۔ ان آیات نے خزانے پر زکوۃ فرض کر کے ان کی حرمت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زکوۃ مسلمانوں پر ہجرت کے دوسرے سال فرض کی گئی جبکہ یہ آیت یعنی خزانے کو حرام قرار دینے والی آیت ہجرت کے نویں سال نازل کی گئی اور

نزول کے اعتبار سے پہلے آنے والی آیت بعد میں نازل ہونے والی آیت کو منسوخ نہیں کرتی، اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت کو منسوخ کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے لئے ناسخ ہے۔ اگر دلیل نہ ہو تو نسخ نہیں ہوتا۔ نسخ کہتے ہیں، پہلے نص سے معلوم ہونے والے حکم کو بعد میں آنے والی نص کے ذریعے باطل قرار دینے کو۔ پہلی نص کے حکم کو باطل قرار دینے کے لئے دوسری نص میں یہ شرط ضروری ہے کہ وہ پہلی نص کی ناسخ ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا»** **"میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ (اب) زیارت کیا کرو"**۔ اس کو مسلم نے بریدہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** **"اے مسلمانو! جب تم رسول ﷺ سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ ہاں اگر نہ پاؤ تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"** (المجادلۃ: 12)۔ اس آیت میں سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم ہے یعنی اگر صدقہ دینے کی طاقت ہو۔ اس کے بعد اگلی ہی آیت سے یہ آیت منسوخ کی گئی **ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ** **"کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ نکالنے سے ڈر گئے؟ پس جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی تمہیں معاف فرما دیا تو اب نمازوں کو قائم رکھو زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری کرتے رہو"** (المجادلہ: 13)۔ اس آیت کے ذریعے اس حکم کو یعنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے کے حکم کو اٹھایا جو پہلی آیت میں دیا گیا تھا۔ مذکورہ حدیث میں نسخ صراحتاً (واضح طور پر) ہے۔ جبکہ آیت میں نسخ اشارتاً ہے۔ دیکھئے یوں فرمایا! **ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ** **"کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ نکالنے سے ڈر گئے؟"** اس وجہ سے نسخ میں یہ ضروری ہے کہ نص میں صراحتاً یا دلالۃً ایسی بات ہو جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ یہ نص پہلی نص کے لئے ناسخ ہے۔ نسخ کیلئے

یہ کافی نہیں کہ دو نصوص کے درمیان ظاہری طور پر کوئی تناقض (ٹکراؤ) ہو، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات کے درمیان کوئی تناقض نہیں۔ بعض علماء نے قرآن کی بعض آیات کے درمیان تناقض کا جو ذکر کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیا ہے، یہ وہم کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ قرآنی آیات میں کہیں بھی تناقض نہیں، بلکہ تمام آیات انتہائی صریح ہیں۔ ان آیات کے معنی واضح ہیں اور ان میں نسخ کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ لہذا نسخ کے لئے لازمی ہے کہ بعد میں آنے والی نص میں صراحتاً یا دلالۃ کوئی ایسی بات ہو کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ اپنے سے پہلے والی نص کے لئے ناسخ ہے۔ زکوۃ کی آیات میں صراحتاً یا دلالۃً ایسی کوئی بات نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ خزانے والی آیت کے لئے ناسخ ہو، اس میں تو دور دور تک ایسی کوئی بات نہیں حتّٰی کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیات کے درمیان تناقض ہونے کی وجہ سے بعد میں آنے والی آیت پہلی آیت کو نسخ کرتی ہے۔ ان کے نزدیک بھی زکوۃ والی آیات خزانے والی آیات کو نسخ نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں تناقض کا کوئی شبہ تک نہیں۔ زکوۃ والی آیات میں زکوۃ ادا کرنے کا حکم ہے جبکہ خزانے کو حرام کرنے والی آیت میں صرف خزانہ نہ کرنے کا خطاب ہے۔ ان دونوں امور کے درمیان کوئی تناقض نہیں کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خزانہ بھی ہے اور زکوۃ بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خزانہ نہیں جبکہ زکوۃ دی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خزانہ ہے اور نہ ہی زکوۃ دی جارہی ہے۔ یوں ان دونوں آیتوں کے درمیان کسی بھی لحاظ سے کوئی بھی نسخ نہیں پھر کیسے نسخ کا دعوٰی کیا جا سکتا ہے؟ اس وجہ سے بھی کہ زکوۃ ہجرت کے دوسرے سال فرض کی گئی جبکہ خزانہ نہ کرنے والی آیت ہجرت کے نویں سال، یعنی زکوۃ کے فرضیت کے سات سال بعد نازل ہوئی۔ زکوٰۃ والی آیت میں صراحتاً یا دلالتاً ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ خزانے والی آیت کی ناسخ ہے اور اس سے بڑھ کر یہ بات کہ دونوں آیات کے درمیان کوئی تناقض نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ زکوٰۃ والی آیات نے خزانے والی آیت کو منسوخ کر دیا بالکل باطل اور مردود قول ہے۔

جو لوگ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد سونا چاندی خزانہ کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، وہ دلیل کے طور پر بخاری کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دیہاتی کی جانب سے اس

آیت کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر فرمایا کہ جس نے سونا چاندی خزانہ کیا اور اس کی زکوۃ نہیں دی تو اس کے لیے ہلاکت ہے۔ آپؓ کا یہ کہنا زکوۃ والی آیت کے نزول سے پہلے تھا۔ جب زکوۃ والی آیت نازل کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کو مال کی پاکیزگی کا ذریعہ بنایا۔ ابن عمرؓ کی اس خبر کو لغت قرآن کی تخصیص یا سنت کے ذریعے قرآن کو نسخ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن یہ اس نسخ کے بارے میں ایک صحیح خبر تو ہے جس سے قرآن کے ذریعے قرآن کا نسخ کہتے ہیں کیونکہ قرآن کی آیت کو منسوخ کیا گیا۔ زکوۃ قرآن کے ذریعے فرض کی گئی سنت کے ذریعے نہیں۔ اب اس خبر کو لینا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک صحیح خبر ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک آیت کے ذریعے دوسری آیت کو منسوخ کیا گیا ہے یوں خزانہ کرنے کی حرمت منسوخ سمجھی جائے گی جب اس کی زکوۃ ادا کر دی گئی ہو۔ اس کے جواب کے چار پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خبر واحد ہے جس میں یہ روایت ہے کہ آیت منسوخ کی گئی ہے تو اسی پر بھی وہ بات صادق آتی ہے جو ہر خبر واحد پر صادق آتی ہے کہ یہ ظنی ہے جبکہ جو کچھ آیت میں ہے وہ قطعی ہے اور ہمیشہ قطعی کو ظنی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یوں آیت کا منسوخ نہ ہونا مرجع ہے اور منسوخ ہونے کے دعوے کو چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری: آیت کے بارے میں ہر خبر واحد حدیث کی اس روایت کی طرح ہے جس میں کوئی ایسا حکم ہے جو قران کی آیت کو منسوخ قرار دیتی ہے۔ چونکہ حدیث آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی اگرچہ اس میں کوئی ایسا حکم ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آیت منسوخ ہے یا اس کی طرف اشارہ بھی ہو اس وجہ سے ابن عمرؓ کی خبر قرآن کی آیت ہونے کی خبر دے کر اس کو منسوخ نہیں کر سکتی۔

تیسری: ابن عمرؓ آیت کے منسوخ ہونے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے خبر نہیں دے رہے ہیں، یعنی یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آیت منسوخ ہو گئی، بلکہ فقط اپنی رائے دے رہے ہیں کہ منسوخ ہو گئی۔ کیونکہ دیہاتی نے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن ابن عمرؓ نے جواب کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمرؓ کی رائے تھی کہ زکوۃ والی آیت سے یہ آیت منسوخ ہو گئی یعنی ابن عمرؓ زکوۃ والی آیت کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ اس سے خزانہ نہ

کرنے کے حکم والی آیت منسوخ ہو گئی۔ یوں یہ حدیث نہیں بلکہ ابن عمرؓ کی رائے ہے، کوئی شرعی دلیل نہیں کیونکہ کسی صحابی کی رائے شرعی دلیل نہیں ہوتی۔ جب شرعی دلیل نہیں ہو سکتی تو قرآن کو منسوخ کرنے کی دلیل کیونکر ہو گی؟

چوتھی وجہ: زکوۃ ہجرت کے دوسرے سال سے فرض کی گئی جبکہ خزانے کی حرمت کی آیت ہجرت کے نویں سال نازل ہوئی پھر کس طرح سات سال پہلے نازل ہونے والی زکوۃ کی آیت نے سات سال بعد نازل ہونے والی آیت کو منسوخ کر دیا۔ اس لئے اس خبر کی حدیث (اس کے مفہوم) کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

یہ چار وجوہات بغیر کسی شک وشبہ کے اس حدیث سے استدلال کو ساقط کرنے اور اس آیت کو منسوخ کرنے کے دعوے کو باطل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یوں یہ حدیث اس قابل نہیں کہ زکوۃ نکالنے کے بعد خزانے کے جواز کے لئے اس سے استدلال کیا جائے۔

جو لوگ زکوۃ نکالنے کے بعد خزانہ کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔، وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان زکوۃ کے علاوہ کسی اور مالی عبادت کا مکلف نہیں۔ اس کے کئی دلائل ہیں: مثال کے طور پر ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«... فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنْ الإِسْلاَمِ ... إلى أن قال: وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الزَّكَاةَ، قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: لاَ، إِلا أَنْ تَطَوَّعَ»**"... **اس نے اسلام کے بارے میں سوال کیا...رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زکوۃ۔ تو اعرابی نے کہا' زکوۃ کے علاہ بھی کچھ ہے؟' فرمایا: نہیں البتہ نفلی صدقات ہیں**"۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«لَيْسَ فِي الْمَالِ حَقٌّ سِوَى الزَّكَاةِ»**" **زکوۃ کے علاوہ مال پر کوئی حق نہیں**"، اس حدیث کو ابن ماجہ نے فاطمہ بنت قیس کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے **«إِذَا أَدَّيْتَ زَكَاةَ مَالِكَ فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ»**"**جب تم نے اپنے مال کی زکوۃ ادا کر دی، تو اپنا فرض پورا کر دیا**"، اسے ترمذی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔ ان تمام احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے اوپر زکوۃ کے علاوہ کوئی مالی (فرض) عبادت نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ

فرمانا کہ «لَيْسَ عَلَيْكَ» تمہارے اوپر کچھ نہیں، یا «لَيْسَ فِي الْمَالِ حَقٌّ» تمہارے مال میں کوئی حق نہیں، یا «فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ» زکوۃ دی تو اپنا فرض ادا کر دیا، یہ سب عام ہیں اور مال کے حوالے سے جو واجبات ہیں سب اس میں شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال ذخیرہ کرنا اس وقت جائز ہے جب مسلمان مال کے حوالے سے اپنا فرض، یعنی زکوۃ ادا کرے۔

اس کا جواب یوں ہے کہ مال ذخیرہ کرنے کی حرمت زکوۃ سے ایک الگ چیز ہے۔ مذکورہ احادیث میں صرف یہ خبر دی گئی ہے کہ مال کے اوپر زکوۃ کے علاوہ کوئی اضافی حقوق نہیں۔ اس سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مال کے متعلق زکوۃ کے علاوہ کوئی اور احکامات نہیں۔ ذخیرہ کرنا مال کے احکام میں سے ہے، مال کے اوپر واجب حقوق میں سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کی ملکیت میں موجود مال پر، مال کی زکوۃ کے علاوہ، کوئی حق فرض نہیں کیا۔ لیکن مال کے لئے زکوۃ کے علاوہ دوسرے شرعی احکامات بھی دیئے ہیں، جیسا کہ سونا چاندی میں سود سے متعلق احکامات یا سونے چاندی کے تبادلے سے متعلق احکامات یا سونا چاندی ذخیرہ کرنے سے متعلق احکامات۔ یہ سب کے سب مالی احکامات ہیں۔ مال جمع کرنے کا حکم بھی دوسرے مالی احکامات کی طرح ایک حکم ہے اور یہ مال کے اوپر واجب حقوق میں سے نہیں ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ احادیث کا مال کے جمع کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ ان احادیث سے کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زکوۃ نکالنے کے بعد مال جمع کرنا جائز ہے۔ یوں ان احادیث سے استدلال بھی ساقط ہو گیا۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں ہے کہ آخری دونوں حدیثیں ضعیف ہیں اور حافظ نے التلخیص میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے، خاص کر ابنِ ماجہ کی حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف اور متن کے لحاظ سے پراگندہ ہے، ابنِ ماجہ نے اپنے سنن میں اس حدیث کو یوں روایت کیا ہے کہ ہمیں بتایا علی بن محمد نے اور انہیں بتایا یحییٰ بن آدم نے، جس نے شریک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے ابو حمزہ سے، انہوں نے شعبی سے، انہوں نے فاطمہ بنت قیس سے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: «لَيْسَ فِي الْمَالِ حَقٌّ سِوَى الزَّكَاةِ» "مال پر زکوۃ کے علاوہ کوئی حق نہیں"۔

لیکن ترمذی نے اسی حدیث کو اپنے سنن میں یوں روایت کیا ہے کہ ہمیں بتایا محمد بن احمد بن مدویہ نے، ان کو بتایا اسود بن عامر نے، انہوں نے نقل کیا شریک سے، انہوں نے ابو حمزہ سے انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے فاطمہ بنت قیس سے وہ کہتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا پھر رسول اللہ ﷺ سے زکوۃ کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا «**إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ**» **" زکوۃ کے علاوہ بھی مال پر حق ہے"۔**

اس حدیث میں ایک طرف زکوۃ کے علاوہ حق نہ ہونے کی بات ہے جبکہ دوسری طرف زکوۃ کے علاوہ حق ہونے کی بات ہے یوں یہ حدیث ضعیف ہے، اس کا ضعف شریک کی وجہ سے ہے اگرچہ وہ قابل اعتماد ہے لیکن ان کا حافظہ کمزور تھا، جبکہ ابو حمزہ میمون الاعور تو بالاتفاق ضعیف ہے۔ کیونکہ وہ اکثر دوسرے راویوں کی مخالفت کرتا پایا گیا ہے اور خود اس کا حافظہ بھی کمزور تھا۔ حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ہی ان دونوں راویوں نے اس حدیث کو ایک مرتبہ اثبات جبکہ دوسری مرتبہ نفی میں روایت کیا۔

یہ وہ تمام دلائل تھے جو زکوۃ ادا کرنے کے بعد مال جمع کرنے کو جائز کہنے والوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ یعنی یہ وہ تمام ممکنہ دلائل ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زکوۃ دینے کے بعد مال جمع کرنا جائز ہے لیکن ان سب کا جواب ہم نے دے دیا ہے۔ اب اس میں کہنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں۔ یہ بات زکوۃ نکالنے کے بعد مال جمع کرنے کی حرمت کی دلیل کے طور پر کافی ہے کہ مال جمع کرنے کو حرام قرار دینے والی آیت زکوۃ والی آیت کے نزول کے سات سال بعد نازل ہوئی۔ یہ آیت صریح ہے اور مال جمع کرنا زکوۃ نکالنے کے بعد بھی ہر صورت میں حرام ہے۔

اب ایک ہی مسئلہ رہ گیا اور وہ ہے اس آیت میں لفظ کنز، خزانہ سے مراد کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں خزانے کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب ہے مال کو بغیر ضرورت کے اوپر تلے جمع کرتے رہنا۔ لغت میں کنز، مال کو ایک دوسرے کے اوپر جمع کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں۔ مال مکنوز (مخزوں) کا مطلب ہے جمع کیا ہوا مال، والکنز کا مطلب ہے کسی چیز کو اوپر تلے زمین کے اندر یا

زمین کے اوپر جمع کر کے رکھنا۔ القاموس المحیط (لغت) میں کہا گیا ہے کہ الکنز (خزانہ) کا مطلب ہے دفن کیا ہوا مال یا سونا چاندی یا اور مال ہو سکتا ہے۔ امام ابو جعفر البطری نے کہا کہ الکنز (خزانہ) ہر وہ چیز ہے جس کو اوپر تلے جمع کیا جائے چاہے زمین کے اندر ہو یا زمین کے اوپر۔ یہ ہیں الکنز (خزانہ) کے لغوی معنی، قرآن کی تفسیر ہمیشہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہوتی ہے سوائے اس صورت میں کہ شرع اس کا کوئی شرعی معنی مقرر کر دے، تب اس شرعی معنی کو اختیار کیا جائے گا۔ الکنز (خزانے) کے لفظ کے لئے شرع نے کوئی معنی وضع نہیں کیے، لہذا اس کے لغوی معنی کو ہی لیا جائے گا۔ اور پھر کنز کے یہی معنی ہوں گے کہ بغیر کسی خاص ضرورت کے اوپر تلے مال کو جمع کرتے رہنا۔ اس خزانے پر اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی ہے جو کہ دردناک عذاب کی وعید ہے۔ مال کو حفاظت کے لئے دفن کرنا، یعنی اس کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے۔ اس کو ہی خزانہ کہا جاتا ہے اگر مال خرچ کرنے کی نیت سے رکھا گیا ہو تو اس کو خزانہ نہیں کہا جاتا۔ اس لئے اس آیت میں کنز یعنی خزانے کا جو لفظ ہے اس سے مراد وہ مال ہے جو خرچ کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ صرف حفاظت سے رکھا گیا ہو اور اس کو خرچ کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ یہ آیت ہر اس مال پر صادق آتی ہے جو بغیر ضرورت کے جمع کر کے رکھا گیا ہو، ہاں اگر مال آنے والی کسی ضرورت میں خرچ کرنے کے لئے جمع کر کے رکھا گیا ہو تو وہ اس مذموم خزانے میں داخل نہیں۔

دفعہ نمبر 143: مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ زکوٰۃ ان اموال پر لی جائے گی جن پر زکوٰۃ لینے کو شریعت نے متعین کر دیا ہے جیسا کہ نقدی، تجارتی مال، مویشی اور غلہ۔ جن اموال پر زکوۃ لینے کی کوئی شرعی دلیل نہیں، ان پر زکوۃ نہیں لی جائے گی۔ زکوٰۃ ہر صاحب نصاب شخص سے لی جائے گی خواہ وہ مکلف ہو جیسا کہ ایک عاقل بالغ مسلمان یا وہ غیر مکلف ہو جیسا کہ بچہ اور مجنون۔ زکوٰۃ کو بیت المال کی

ایک خاص باب (مد) میں رکھا جائے گا اور اس کو قرآن کریم میں وارد ان آٹھ اصناف میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد کے علاوہ کہیں اور خرچ نہیں کیا جائے گا۔

اس دفعہ میں پانچ باتیں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ زکوۃ مسلمانوں پر واجب ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ زکوۃ صرف ان اموال پر لی جائے گی جن اموال پر شرع نے زکوۃ فرض قرار دی ہے اور ان کے علاوہ دوسرے اموال پر زکوۃ نہیں لی جائے گی۔ تیسری بات، زکوۃ ہر صاحبِ نصاب شخص سے لی جائے گی۔ چوتھی بات، زکوۃ کو بیت المال کے ایک خاص باب (مد) میں رکھی جائے گی۔ پانچویں بات اس کو صرف ان مخصوص اشخاص پر خرچ کیا جائے گا جن کے بارے میں قرآن میں ذکر آیا ہے۔

پہلی بات یعنی زکوۃ کی فرضیت کی دلیل قرآن کریم سے ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیت: **وَاٰتُوا الزَّكَاةَ** " **اور زکوۃ ادا کرو**" (البقرہ:43)۔ اور فرمایا: **وَاَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكَاةَ** " **اور نماز ادا کرتے رہو زکوۃ دیتے رہو**" (الاحزاب:33)۔ یا یہ ارشاد کہ **رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكَاةِ** "**ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی**" (النور:37)۔ اسی طرح سنت میں بھی زکوۃ کی فرضیت کے دلائل وارد ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کیا تو ان سے فرمایا: «**أَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ**» "**ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک صدقہ (زکوۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں کو دیا جائے گا**"۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور اسی طرح یہ حدیث بھی ہے: «**بُنِيَ الإِسْلامُ عَلَى خَمْسٍ**» " **اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے...**"، ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے، اور اس حدیث میں ہے کہ «**وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ**» "**اور زکوۃ کا ادا کرنا**"۔ اسی طرح ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جسے کرنے سے میں جنت میں جاؤں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: «**اللهَ لا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً،**

وَتُقِيمُ الصَّلاةَ الْمَكْتُوبَةَ، وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ» "اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت بناؤ فرض نماز ادا کرو، فرض زکوۃ دیا کرو، رمضان کے روزے رکھو"۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور قیس سے روایت ہے کہ جریر بن عبد اللہؓ نے کہا **«بَايَعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلَى إِقَامِ الصَّلاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ» " میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر نماز قائم کرنے کی اور زکوۃ ادا کرنے کی اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے کی بیعت کی"** متفق علیہ۔ یہ تمام احادیث زکوۃ کی فرضیت کے دلائل ہیں۔ رہی یہ بات کہ زکوۃ صرف مسلمانوں سے لی جائے گی غیر مسلموں سے نہیں، تو اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا معاذؓ کو یہ فرمانا ہے **«وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ» "اور (یہ زکوۃ) ان کے فقیروں کو دی جائے گی"**۔ یعنی مسلمانوں ہی کے فقیروں کو۔

دوسری بات یعنی کہ زکوۃ صرف ان اموال پر لی جائے گی جن کا شریعت نے تعین کر دیا ہے اور ان کے علاوہ کسی مال پر نہیں لی جائے گی، اس کی دلیل یہ ہے کہ شارع نے ان اموال میں زکوۃ کی مقدار تحریر کر کے ان کی انواع کو بھی تحریر کر دیا ہے۔ جس مال کا شارع نے نصاب مقرر کر دیا، وہ مال اگر اس نصاب کو پہنچے تو اس مال پر زکوۃ لی جائے گی۔ اگر نصاب تک نہ پہنچے تو زکوۃ نہیں لی جائے گی، جیسا کہ جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا **«لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنْ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنْ الإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِنْ التَّمْرِ صَدَقَةٌ» "چاندی کے درہم پانچ اوقیہ (200 درہم) سے کم ہو تو اس میں کچھ بھی (زکوۃ) نہیں۔ پانچ سے کم اونٹوں (تین سے نو سال کی عمر کے) پر کچھ زکوۃ نہیں اور کھجور اگر پانچ وسق (ایک وسق 130.56 کلو گرام) سے کم ہو تو اس پر کچھ بھی زکوۃ نہیں"**۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

جس مال کا شرع نے نصاب ہی بیان نہیں کیا اس پر زکوۃ نہیں لی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ آیت مجمل ہے لیکن حدیث نے اس کو بیان (واضح) کر دیا ہے۔ زکوۃ والی حدیث مجمل کے لئے مبین (بیان کرنے والی) ہے، مخصص (خاص کرنے والی) نہیں۔ بیان اور تخصیص میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے نماز کی

آیت مجمل ہے **وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ**(البقرۃ: 43)**" نماز قائم کرو"**، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کو بیان (واضح) کیا۔ ہم نماز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے اس بیان کی وضاحت کے پابند ہیں۔ ہمارے لئے اس میں کوئی کمی بیشی کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح زکوۃ والی آیات بھی مجمل ہیں جیسا کہ **وَاٰتُوا الزَّكَاةَ "زکوۃ دیا کرو خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ "ان کے مال میں سے لو"**(التوبۃ:103) **اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ "بے شک زکوۃ..."**(التوبۃ:60)۔ پھر احادیث میں ان انواع (اقسام) کو بیان کیا گیا جن پر زکوۃ لی جائے گی۔ اور اس مقدار کو بھی بیان کیا گیا جو ان اموال پر لی جائے گی یوں نصاب کو بھی بیان کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کسی چیز پر زکوۃ نہیں لی جائے گی۔ جس چیز پر زکوۃ لینے کے لئے شرعی نصاب کے برابر مقدار نہیں اس پر زکوۃ لینا حرام ہے، اس لیے گھروں، گاڑیوں یا زیتون پر کوئی زکوۃ نہیں کیونکہ شارع نے ان چیزوں کا نصاب یا جب نصاب کو پہنچیں تو زکوۃ کی مقدار مقرر نہیں کی۔ اس لئے ان چیزوں پر زکوۃ نہیں، یوں زکوۃ لینا ان اموال تک محدود رہے گا جن کے بارے میں شرعی نص موجود ہو یعنی جن چیزوں پر زکوۃ لینے کے لئے صحیح شرعی نص موجود ہو جیسا کہ اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور کشمش۔

اونٹ اور بھیڑ بکریوں پر زکوۃ کی دلیل وہ روایت ہے جو زُھری نے سالم سے ان کے والد کے حوالے سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ **«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَدْ كَتَبَ الصَّدَقَةَ وَلَمْ يُخْرِجْهَا إِلَى عُمَّالِهِ حَتَّى تُوُفِّيَ، قَالَ: فَأَخْرَجَهَا أَبُو بَكْرٍ مِنْ بَعْدِهِ فَعَمِلَ بِهَا حَتَّى تُوُفِّيَ، ثُمَّ أَخْرَجَهَا عُمَرُ مِنْ بَعْدِهِ فَعَمِلَ بِهَا. قَالَ: فَلَقَدْ هَلَكَ عُمَرُ يَوْمَ هَلَكَ وَإِنَّ ذَلِكَ لَمَقْرُونٌ بِوَصِيَّتِهِ، قَالَ: فَكَانَ فِيهَا فِي الإِبِلِ فِي خَمْسِ شَاةٍ، حَتَى تَنْتَهِيَ إِلَى أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ، فَإِذَا بَلَغَتْ إِلَى خَمْسٍ وَعِشْرِينَ فَفِيهَا بِنْتُ مَخَاضٍ، إِلَى خَمْسٍ وَثَلاثِينَ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ بِنْتُ مَخَاضٍ فَابْنُ لَبُونٍ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى خَمْسٍ وَثَلاثِينَ فَفِيهَا بِنْتُ لَبُونٍ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِينَ، فَإِذَا زَادَتْ وَاحِدَةٌ فَفِيهَا حُقَّةٌ، إِلَى سِتِّينَ، فَإِذَا زَادَتْ فَفِيهَا جَذِعَةٌ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِينَ، فَإِذَا زَادَتْ فَفِيهَا ابْنَتَا لَبُونٍ، إِلَى تِسْعِينَ، فَإِذَا زَادَتْ فَفِيهَا حُقَّتَانِ، إِلَى عِشْرِينَ وَمَائَةٍ، فَإِذَا كَثُرَتْ الإِبِلُ فَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حُقَّةٌ، وَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ. وَفِي الغَنَمِ مِنْ أَرْبَعِينَ شَاةً شَاةٌ، إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ، فَإِذَا زَادَتْ شَاةٌ فَفِيهَا شَاتَانِ، إِلَى مِائَتَيْنِ، فَإِذَا**

زَادَتْ فَفِيهَا ثَلاثُ شِياهٍ، إِلَى ثَلاثُمَائَةٍ، فَإِذَا زَادَتْ بَعْدُ فَلَيْسَ فِيهَا شَيْءٌ حَتَّى تَبْلُغَ أَرْبَعُمَائَةٍ، فَإِذَا كَثُرَتْ الْغَنَمُ فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ»"رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ (مال مویشیوں کی زکوۃ) کا نصاب لکھ دیا تھا لیکن ابھی عمال (صوبائی حکمرانوں) کے پاس نہیں بھیجا تھا کہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ راوی کہتے ہیں کہ: آپ ﷺ کے بعد ابو بکرؓ نے اپنی زندگی میں اس پر عمل کیا۔ پھر ان کی وفات ہوگئی ان کے بعد عمرؓ اپنی زندگی میں اس کے مطابق زکوۃ وصول کرتے رہے یہاں تک کہ آپؓ کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت آپؓ نے اس کے بارے میں وصیت لکھ دی۔ راوی کہتا ہے کہ یہ نصاب یوں تھا۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری یعنی چونتیس تک ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری جب اونٹ پینتیس ہو جائیں تو ایک بنت مخاض (ایک سال سے زیادہ اور دو سال سے کم عمر والی اونٹنی) پھر جب اونٹ پینتیس ہو جائیں تو اگر بنت مخاض نہ تو بنت لبون (دو سال سے زیادہ تین سال سے کم عمر والا اونٹ)، اگر پینتیس سے زیادہ ہوں تو پینتالیس تک ایک بنت لبون ہو گا۔ اگر پینتالیس سے ایک بھی بڑھ جائے تو ساٹھ تک ایک حقہ (تین سے زیادہ چار سال سے کم اونٹنی) اگر اونٹ پچھتر سے بڑھ جائیں تو نوے تک زکوۃ دو بنت لبون ہو گی۔ اگر نوے سے زیادہ ہو جائیں تو دو حصہ ایک سو بیس تک اس کے بعد اگر اونٹ اور زیادہ ہو جائیں تو ہر پچاس پر حصہ اور ہر چالیس پر بنت لبون۔ بکریوں میں نصاب یوں ہے۔ چالیس بکریاں ہو تو ایک بکری زکوۃ وصول کی جائے گی۔ ایک سو بیس تک یہی بکری ہو گی اگر ایک سو بیس سے بڑھ جائیں تو دو سو پر دو بکریاں، اگر دو سو سے بڑھ جائیں تو تین سو تک تین بکریاں، چار سو تک یہی تین بکریاں ہوں گی۔ اگر چار سو ہو جائیں تو پھر ہر سو بکری پر ایک بکری زکوۃ وصول کی جائے گی"۔ اس کو احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ابو بکرؓ نے ان (عاملوں، اور حاکموں) کو لکھا کہ یہ فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس کو بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔ پھر اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کا یہ مذکورہ نصاب بیان کیا۔ اس حدیث میں اونٹ کے نصاب کے سلسلے میں لفظ بنت المخاض ہے۔ جس کا مطلب وہ اونٹنی ہے جو دوسرے سال میں داخل ہوئی ہے جب کہ ابن لبون وہ اونٹ ہے جو تیسرے سال میں داخل ہوا ہو اور اس کی ماں دوسرا بچہ دینے کی وجہ سے پھر لبن یعنی دودھ والی بن گئی ہو، اس کی مؤنث کو بنت لبون کہا جاتا ہے اور الحقة

(’حا‘ پر زیر اور قاف پر تشدید کے ساتھ) کی جمع حقاق ہے جو کہ وہ اونٹنی ہے جو تین سال مکمل کر کے چوتھے سال میں داخل ہوئی ہو۔ الجذعة وہ اونٹنی ہے جو چار سال مکمل کرنے کے بعد پانچویں میں داخل ہو چکی ہو۔ حدیث کی نص اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ اونٹوں کی تعداد جب پینتیس ہو جائے تو ان پر ایک بنت لبون ہے ابن لبون جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری نے اونٹنی (مادی) کے لفظ کا اضافہ کیا۔

گائے کی زکوۃ کی دلیل معاذ بن جبلؓ کی یہ روایت ہے **«بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ، فَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلاَثِينَ بَقَرَةً تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً...»** **"رسول اللہ ﷺ نے جب مجھے یمن بھیجا تو حکم دیا کہ میں ہر تیس گایوں پر ایک تبیع (ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی) لوں"**۔ نسائی اور ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کو حسن قرار دیا ہے جبکہ یحی بن الحکم سے روایت ہے کہ معاذؓ نے کہا **«بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أُصَدِّقُ أَهْلَ الْيَمَنِ وَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ مِنَ الْبَقَرِ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِينَ تَبِيعًا قَالَ هَارُونُ وَالتَّبِيعُ الْجَذَعُ أَوِ الْجَذَعَةُ، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً قَالَ فَعَرَضُوا عَلَيَّ أَنْ آخُذَ مِنَ الأَرْبَعِينَ قَالَ هَارُونُ مَا بَيْنَ الأَرْبَعِينَ أَوِ الْخَمْسِينَ وَبَيْنَ السِّتِّينَ وَالسَّبْعِينَ وَمَا بَيْنَ الثَّمَانِينَ وَالتِّسْعِينَ فَأَبَيْتُ ذَاكَ وَقُلْتُ لَهُمْ حَتَّى أَسْأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ فَقَدِمْتُ فَأَخْبَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلاثِينَ تَبِيعًا وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً وَمِنَ السِّتِّينَ تَبِيعَيْنِ... وَأَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ لا آخُذَ فِيمَا بَيْنَ ذَلِكَ...»** **"رسول اللہ ﷺ نے مجھے اہل یمن سے صدقہ (زکوۃ) وصول کرنے کا حکم دیا۔ مجھے حکم دیا کہ میں ہر تیس گایوں پر ایک تبیع (ایک سال کا بچھڑا) وصول کروں۔ ہارون کہتا ہے کہ تبیع جذع یا جذعہ (بچھڑا یا بچھڑی) ہے اور ہر چالیس پر مسنہ یعنی (دوسرے سال کا بچھڑا) وصول کروں، ہارون (راوی) کہتا ہے کہ معاذؓ سے پوچھا گیا کہ چالیس اور پچاس کے درمیان کیا ہو گا۔ معاذؓ نے جواب دینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھوں گا۔ پھر معاذؓ کہتے ہیں کہ میں آگیا اور رسول اللہ ﷺ کو خبر دی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ تیس پر ایک سال کا بچھڑا لوں، چالیس پر مسنہ دوسرے سال کا بچھڑا اور ساٹھ پر ایک سال کے دو بچھڑے اور ان کے درمیان کچھ بھی نہ لوں"**، اس کو احمد نے ایسے اسناد سے روایت کیا ہے جن کو الزین نے حسن قرار دیا ہے

اور احمد نے معاذؓ بن جبل سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گائے کے دو نصابوں کے درمیان کچھ لینے کا حکم نہیں دیا۔ اس حدیث میں تبیع اور تبیعہ کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے وہ بچھڑا جو ایک سال سے زیادہ عمر کا نہ ہو جبکہ مسنہ اس بچھڑے کو کہتے ہیں جو دوسرے سال میں داخل ہو گیا ہو۔

سونے اور چاندی کی زکوۃ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے جس کو علیؓ نے روایت کیا ہے **«إِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، يَعْنِي فِي الذَّهَبِ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عِشْرُونَ دِينَاراً، فَإِذَا كَانَ لَكَ عِشْرُونَ دِينَارًا وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ»** **"اگر تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر ایک سال بھی گزر جائے تو پانچ درہم (زکوۃ) ہے۔ جب تک تمہارے پاس بیس دینار (سونے کے) نہ ہوں تو کوئی زکوۃ نہیں، جب تمہارے پاس بیس دینار (سونے کے سکے) ہو جائیں اور ان پر سال بھی گزر جائے تو پھر نصف دینار (زکوۃ) ہے"**۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ درہم چھ دوانیق کو کہتے ہیں اور دونق دو قیراط ہوتا ہے اور قیراط دو طسوح کو کہتے ہیں اور طسوح دو دانوں کے برابر ہے اور دانہ درہم کے آٹھویں حصے کا چھٹا حصہ ہوتا ہے یعنی درہم کے اڑتالیسواں حصہ حبہ (دانہ) کہلاتا ہے۔ یہ اس شرعی درھم کا وزن ہے جس کا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ دینار مثقال ہے اور مثقال درہم اور اس کے تیسرے حصے کے برابر ہے اور حدیث میں مذکور شرعی دینار کا یہی وزن ہے (آج کے حساب سے یہ ایک دینار 4.025 گرام سونا ہے)۔

گندم، جو، کھجور اور کشمش پر زکوۃ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حاکم سے بیہقی اور طبرانی نے ابو موسیٰؓ اور معاذؓ سے نقل کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **«لاَ تَأْخُذَا الصَّدَقَةَ إِلاَّ مِنْ هِذِهِ الأَرْبَعَةِ: الشَّعِيرُ وَالْحِنْطَةُ وَالزَّبِيبُ وَالتَّمْرُ»** **" ان چار چیزوں یعنی جو، گندم، کشمش اور کھجور کے علاوہ کسی چیز پر زکوۃ مت لو"**۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ بیہقی نے بھی کہا ہے کہ اس کے راوی قابل اعتماد ہیں اور حدیث متصل ہے۔ اور دار قطنی نے بھی اپنے سنن میں عبداللہ بن عمرؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے **«إِنَّمَا**

سَنَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ الزَّكَاةَ فِي: الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِيبِ» "رسول اللہ ﷺ نے صرف گندم، جَو، کھجور اور کشمش پر زکوۃ مقرر کی ہے" اور شعبی سے بھی حکایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ یمن کو لکھا کہ **«إِنَّمَا الصَّدَقَةُ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِيبِ» "زکوۃ صرف گندم، جو، کھجور اور کشمش پر ہے"** اس کو بیہقی نے شعبی سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

مکئی پر زکوۃ کے متعلق جتنی بھی حدیثیں ہیں وہ ضعیف ہیں، مثال کے طور پر ابن ماجہ نے عمرو شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ **«إِنَّمَا سَنَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ الزَّكَاةَ فِي: الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ وَالزَّبِيبِ والذُّرَةِ» "رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ صرف گندم، جو، کھجور، کشمش اور مکئی پر مقرر کی ہے"** الحافظ نے **التلخیص** میں کہا ہے کہ ان دونوں کے اسناد یعنی ابن ماجہ اور دار قطنی کی بیان کردہ اسناد درست نہیں کیونکہ ان میں العرزمی راوی ہے جو کہ متروک ہے۔ اسی طرح بیہقی نے الحسن کے حوالے سے روایت کیا ہے **«لَمْ يَفْرِضْ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلاَّ فِي عَشَرَةِ أَشْيَاءِ: الإِبِلُ وَالْبَقَرُ وَالْغَنَمُ وَالذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ وَالْحِنْطَةُ وَالشَّعِيرُ وَالتَّمْرُ وَالزَّبِيبُ، قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ أَرَاهُ قَالَ وَالذُّرَةُ» "رسول اللہ ﷺ نے دس چیزوں کے علاوہ کسی چیز پر زکوۃ مقرر نہیں کی، وہ دس چیزیں یہ ہیں: اونٹ، گائے، بھیڑ بکریاں، سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور کشمش ابن عیینہ کہتے ہیں کہ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے مکئی بھی کہا تھا"**۔ الحافظ نے التلخیص میں کہا ہے کہ الحسن کی روایت عمرو بن عبید سے مرسل ہے اور یہ انتہائی ضعیف ہے۔ اور ابو حاتم نے تو کہا ہے کہ یہ متروک حدیث ہے۔ اسی طرح بیہقی نے ہی اپنی سنن الکبریٰ میں الحسن سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں بھی عمرو بن عبید ہے، اس روایت میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ صرف دس چیزوں پر مقرر کی ہے۔ اس میں "اسلت" (ایک قسم کا جَو) کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس روایت میں مکئی کا ذکر نہیں ہے۔ القاموس کے مطابق یہ ایک قسم کا جَو ہے۔ یہ دونوں روایتیں سند کے ضعیف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ یوں مکئی کی زکوٰۃ والی تمام احادیث ضعیف ہیں۔ یوں جن اصناف پر زکوۃ لی جائے گی وہ یہی چار یعنی گندم، جو، کھجور اور کشمش ہیں،

ان کے علاوہ کسی چیز پر زکوۃ نہیں لی جائے گی۔ جہاں تک جابرؓ کی اس روایت کی بات ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **«فِيمَا سَقَتْ الأَنْهَارُ وَالْغَيْمُ الْعُشُورُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ نِصْفُ الْعُشْرِ»" جس چیز کو دریا کے پانی سے سیر اب کیا جائے یا بارش کے ذریعے اس پر عشر ہے اور جس کو ڈھول (ٹیوب ویل وغیرہ) سے سیر اب کیا جائے اس پر نصف عشر ہے"** ۔ عمرؓ کی روایت بھی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا؛ **«فِيمَا سَقَتْ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ، وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ» " جس (فصل) کو کولہوں کے بیلوں کے ذریعے پانی دیا جائے اس پر نصف عشر ہے"**۔ اس حدیث میں "عشریا" کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے وہ فصل جو اپنے ہی پینے کو پیئے یعنی بغیر سیر اب کیے فصل تیار ہو جائے۔ اور ابو سعید کی یہ روایت کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **«لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ» " پانچ وسق (130.56 کلو گرام ایک وسق ہوتا ہے) سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوۃ نہیں"** متفق علیہ ہے۔ یہ ساری احادیث پھلوں اور اناج کی زکوۃ کے بارے میں مجمل نص ہیں اور دوسری احادیث میں اس اجمال کو بیان کیا گیا ہے یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ کس چیز پر زکوۃ لی جائے گی۔

خاص کر یہ بیان حصر (restriction) کے ساتھ ہے جیسا کہ حاکم، بیھقی اور الطبرانی کی حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ ان چار چیزوں کے علاوہ کسی چیز پر نہیں لی جائے گی۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے کہا ہے کہ اس کے راوی قابل اعتماد ہیں۔ اس طرح دار قطنی نے اپنے سنن میں جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف گندم، جو، کھجور اور کشمش پر زکوۃ مقرر کی، یقینا ان احادیث میں لفظ ''لا'' یا لفظ ''الا''، یعنی صرف اسی طرح ''انما'' سب کے سب حصر (تحدید) کے لیے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اناج اور پھلوں میں سے ان چار چیزوں پر ہی زکوۃ ہے یا جس چیز کو دریا کا پانی سیر اب کرے وغیرہ، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے پیدا ہونے والی ہر چیز پر زکوۃ ہے یہ سب مجمل ہیں دوسرے نصوص نے ان کے اجمال کو بیان کر دیا ہے اور زکوۃ کو مذکورہ چار اصناف تک محدود کر دیا ہے اور اس کی تائید میں بہت سی روایات بھی ہیں۔ مثال کے طور پر دار قطنی نے اپنے سنن میں عمرو بن شعیب سے ان کے باپ پھر دادا کے

حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَالْعُشْرُ فِي التَّمْرِ وَالزَّبِيبِ وَالْحِنْطَةِ وَالشَّعِيرِ»** **"عشر کھجور، کشمش، گندم اور جو پر ہے"** تمام دلائل کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اناج اور پھل کی زکوۃ صرف معین اصناف پر ہے جن کو احادیث میں چار بیان کیا گیا ہے اور وہ جو، گندم، کشمش اور کھجور ہیں۔ اس حوالے سے بہت احادیث ہیں جو کہ سب کی سب صحیح ہیں۔ جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اناج اور پھلوں میں سے صرف ان چار چیزوں پر زکوۃ ہے۔ رہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ **وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ** (الانعام؛141) **"اور اس میں جو حق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو"** تو یہاں مراد زکوٰۃ، نہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے جبکہ زکوٰۃ مدینہ میں فرض کی گئی۔ یہ وجہ ہے کہ اس میں آگے انار کا بھی ذکر ہے جس پر کوئی عشر نہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ کاٹنے کا مطلب جب بالی (خوشہ) اتار دیا جائے یا جب کھجور کے خوشے کو کاٹا جائے۔ النخعی اور ابو جعفر کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ اس میں کٹائی کی بات ہے اور آگے اس میں انار کا ذکر ہے جس پر کوئی زکوۃ نہیں۔ القاموس المحیط میں ہے کہ 'حصاد' یعنی کٹائی کا جو لفظ ہے وہ کھیتی یا گھاس وغیرہ کو درانتی سے کاٹنے کو کہتے ہیں۔ اگر بالفرض اس کو زکوۃ پر بھی محمول کیا جائے تو اس سے مراد اس فصل کی زکوۃ ہے جو درانتی سے کاٹی جاتی ہے کیونکہ انار تو اس طرح نہیں کاٹی جاتی۔ یوں یہ آیت مجمل ہے اور اس کا بیان ان احادیث میں ہے جن میں کٹائی والی فصل میں سے کس کس چیز پر زکوۃ ہے کا ذکر ہے اور وہ فصلیں گندم اور جو ہیں۔ اور دو چیزیں دوسری قسم کی اس میں شامل کر دی گئی ہیں یعنی کھجور اور کشمش۔ بہر حال جب یہ آیت مکی ہے اور زکوۃ مکہ میں فرض نہیں کی گئی تو یہ کافی دلیل ہے کہ یہ آیت زکوۃ کے بارے میں ہے ہی نہیں۔ اسی بات کے حوالے سے روایت ہے جو ابو سیارہ المتعی سے منسوب ہے وہ کہتے ہیں کہ:

«قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، إِنَّ لِي نَخْلاً، قَالَ: فَأَدِّ العُشُورَ، قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ، احْمِ لِي جَبَلَهَا، قَالَ: فَحَمَى لِي جَبَلَهَا» **"میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے، فرمایا اس کا عشر دیا کرو، وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اس پہاڑی کو (جس میں چھتہ ہے) میرے لیے محفوظ کر دیں، کہتے ہیں کہ میرے لیے اس پہاڑی کو محفوظ کر دیا گیا یعنی مجھے دے دی گئی"** اور اسی طرح عمرو بن شعیب کی یہ روایت جو انہوں نے اپنے باپ پھر دادا سے نقل کی ہے کہ "بنی

متعان کا ہلال نامی شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس شہد کا عشر لے کر آیا اور البہ نامی ایک وادی طلب کی رسول اللہ ﷺ نے وہ وادی ان کے لیے محفوظ کر دی، جب عمرو بن خطابؓ خلیفہ بنے تو سفیان بن وہب نے عمر بن خطابؓ کو خط لکھ کر اس وادی کے بارے میں پوچھا، عمرؓ نے جواب میں اس کو لکھا کہ اگر وہی عشر تمہیں دے جو رسول اللہ ﷺ کو دیتا تھا تو سلبہ وادی اسی کے پاس رہنے دو ورنہ وہ ایک مکھی کی بیٹ ہے جو چاہے کھالے، ان دونوں روایت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں کہ شہد پر زکوٰۃ ہے کیونکہ ابو سیارہ کی حدیث منقطع ہے اس کو سلیمان بن موسیٰ نے ابو سیارہ سے روایت کی ہے کہ حدیث منقطعی ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ ”سلیمان نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا اور صحیح بات یہ ہے کہ شہد پر کوئی زکوۃ نہیں“۔ عمرو بن شعیب کی حدیث کو اگرچہ ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے اور ابن عبد اللہ نے الاستذکار میں اس کو حسن بھی قرار دیا ہے تاہم اس حدیث سے بھی شہد پر زکوۃ کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ شہد رضاکارانہ طور پر (یعنی نفلی صدقہ کے طور پر) دیتے تھے جس کے بدلے میں وہ پہاڑی بھی ان کو دی گئی۔ عمر بن خطابؓ کے فعل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے عمرؓ پہاڑی ان کو دینے کی علت کو سمجھ گئے اور شہد کا مطالبہ کیا۔ اس بات کی تائید سعید بن ابی ذباب کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی قوم کا عامل مقرر کیا اور انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم شہد کا عشر بھی دیا کرو، اس کو البیہقی اور ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے جبکہ بخاری الأزدی وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود امام الشافعی فرماتے ہیں کہ ’سعد بن ابی ذباب جو کچھ بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا بلکہ یہ ان کی اپنی رائے تھی جو انہوں نے قائم کی۔

اس تمام بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہد پر کوئی زکوۃ نہیں حتیٰ کہ جن احادیث سے بعض لوگ شہد پر زکوۃ کے حوالے سے استدلال کرتے ہیں ان میں بھی شہد پر زکوۃ کے واجب ہونے کی کوئی بات نہیں۔

تمام نصوص اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جس چیز کی شرع نے نصاب مقرر نہیں کی ہے اس میں کوئی زکوۃ نہیں، کیونکہ نصوص نے زکوۃ کے نصاب کو بیان کر دیا اور کس مقدار میں زکوۃ لی جائے گی اس کو بھی بیان کر دیا۔ اس لیے انہیں چیزوں پر زکوۃ لی جائے گی۔ جس چیز کے بارے میں کوئی نص ہی نہیں تو ان پر پھر

کس بنیاد پر زکوۃ لی جائے اور مقدار کا بیان ہے ان میں کوئی علت بیان نہیں کی گئی ہے اس لیے ان پر کسی چیز کو قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جن نصوص میں زکوۃ کا حکم ہے ان میں ان اشیا کا بھی ذکر ہے جن پر زکوۃ لی جائے گی، نص کا بھی ذکر ہے، زکوۃ کی مقدار کا بھی ذکر ہے اور یہ سب کچھ حصہ یعنی تحدید کے طور پر ہے اور اسکے لیے حصہ اور تحدید والے حروف استعمال کیے گئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زکوۃ صرف ان چیزوں پر لی جائے گی جن کے بارے میں نص وار ہوا ہے ان کے علاوہ کسی چیز پر نہیں لی جائے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص میں اموال پر زکوۃ کا وجوب عمومیت کے ساتھ ہے جیسا کہ یہ آیت: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ** (التوبۃ:103) **"آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (زکوۃ) لیجئے"** یا یہ آیت کہ **وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ** (المعارج:24) **"اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے۔"** اس طرح یہ حدیث کہ **«أعلمهم أن الله افترض عليهم صدقة في أموالهم»"ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال پر سے زکوۃ کو ان کے اوپر فرض کیا ہے"**۔ ابن عباسؓ کے حوالے سے یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ان آیات اور احادیث میں مال کا لفظ ہے جس میں ہر قسم کا مال شامل ہے۔ یوں زکوۃ تمام اموال پر واجب ہے ہاں جس چیز کو شرع نے مستثنیٰ قرار دیا اس پر زکوۃ نہیں ہوگی۔ جب کہ شرع نے غلام اور گھوڑوں کے علاوہ کسی چیز کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا جیسا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **«لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ صَدَقَةٌ فِي عَبْدِهِ وَلا فِي فَرَسِهِ»** **"مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑوں پر زکوۃ نہیں"**۔ ابو ہریرہؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے۔ اس کا جواب یوں ہے کہ یہ نص مجمل ہے اور بیان (تفصیل) کی محتاج ہے، پھر سنت نے اسے مکمل طور بیان کر دیا۔ یہ بالکل سود کے معاملے کی طرح ہے کہ اس کی ممانعت بھی اجمالی تھی اور بعد میں سنت نے اس کی تفصیل بیان کر دی۔ اس لیے سود کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہر چیز میں سود حرام ہے کیونکہ اس کی نہی عام ہے، بلکہ سود ان سودی اموال میں منع ہے جن کا سنت نے ذکر کیا اور انہیں بیان کر دیا۔ کیونکہ سود کے متعلق نص بھی مجمل تھی اور سنت نے اس کی تفصیل بیان کر دی۔ اس لیے ان چیزوں میں

ہی سود ہوتا ہے جن کے بارے میں شرع نے بتادیا انکے علاوہ کسی چیز میں سود نہیں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ ہر چیز پر زکوۃ ہے کیونکہ زکوۃ کا حکم عام ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زکواۃ ان اموال پر واجب ہے جن کے بارے میں سنت نے بیان کر دیا ہے اور ان میں زکوۃ کے نصاب کو بھی بیان کر دیا ہے۔ پس سنت نے اموال کی ان اقسام کی نشاندہی کر دی ہے جن میں زکواۃ وصول کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکواۃ کے بارے میں مجمل حکم دیا اور یہ نہیں بتایا کہ کتنی مقدار میں اور کب یہ زکواۃ وصول کی جائے گی، پھر احادیث نے زکوۃ کی مقدار بتادی اور یہ بھی بیان کر دیا کہ وہ مقدار کیا ہے کہ جس پر زکوۃ لاگو ہو گی۔ اس کی بھی وضاحت کر دی کہ فصل میں صرف تیار ہونے کی صورت میں زکوۃ واجب ہو گی جبکہ سونا چاندی پر ایک معین وقت گزر جائے تب زکوۃ واجب ہو گی۔ احادیث میں موجود اس تفصیل کے مطابق زکوۃ وصول کی جائے گی۔ یوں جن اموال پر زکوۃ لینے کا حکم سنت میں دیا گیا ان کا نصاب مقرر کیا گیا ہے اور اس مقدار میں زکوۃ وصول کی جائے گی جو سنت نے مقرر کر دی اور ان اموال کے علاوہ کسی دوسرے اموال پر زکوۃ بالکل نہیں لی جائے گی۔ کیونکہ ان اموال پر زکوۃ لینے کا وقت معلوم نہیں، زکوۃ کی مقدار معلوم نہیں اور ان کا نصاب معلوم نہیں تو پھر کس طرح زکوۃ وصول کی جائے گی۔ جن اموال پر زکوۃ وصول کرنی ہے ان کے بارے میں واضح نصوص موجود ہیں۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کے پاس سونا چاندی ہے اور وہ اس میں سے اس کا حق ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن اس سونا چاندی کو آگ میں تپا کر جہنم کی آگ میں خوب گرم کر کے اس کی پیشانی، چہرے اور کمر کو داغ دیا جائے گا"۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا" **پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوۃ نہیں**" (ایک اوقیہ چالیس درہم کو کہتے ہیں)۔ اسکو مسلم نے جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے جبکہ علیؓ بن ابی طالب سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے "اگر تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر سال بھی گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوۃ ہے اور سونا جب تک بیس دینار نہ ہو تو کچھ بھی نہیں جب بیس دینار ہو جائے اور اس پر سال بھی گزر جائے تو نصف دینار زکوۃ ہے"۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے پاس

اونٹ، گائے یا بھیڑ بکریاں ہیں اور وہ ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن یہ اپنے جسم سے بڑے اور موٹے ہو کر آئیں گی اور اپنے سینگوں سے ماریں گی اور اپنے کھروں (پاؤں) سے اوندیں گی" ابو ہریرہؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "عشر گندم، جَو، کھجور اور کشمش پر ہے" ۔اس کو دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے ان کے والد پھر دادا کے حوالے سے روایت کی ہے۔ انہی راویوں سے یہ روایت بھی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندم، جَو، کھجور اور کشمش پر زکوۃ مقرر کی۔ معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے فرمایا: **«خُذْ الْحَبَّ مِنْ الْحَبِّ، وَالشَّاةَ مِنْ الْغَنَمِ، وَالْبَعِيرَ مِنْ الإِبِلِ، وَالْبَقَرَةَ مِنْ الْبَقَرِ»** "**اناج کی زکوۃ اناج ہی لے لو۔ چوپائیوں کی زکوٰۃ میں بکری لے لو، اونٹوں کی زکوۃ میں اونٹ ہی لے لو، گائے کی زکوۃ گائے ہی لے لو،**" اس کو ابو داؤد ابنِ ماجہ اور دا قطنی نے روایت کی ہے۔

یوں زکوٰۃ صرف ان اموال پر واجب ہے جن کے بارے میں نص نے بتایا ہے اور وضاحت کر دی ہے، ان اموال کے علاوہ بالکل زکوۃ نہیں۔ یہ دعویٰ کرنا کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ متعین اموال کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دیا، جیسا کہ غلام اور گھوڑے اور باقی اموال کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا، اور ان سب پر زکوۃ فرض ہے، یہ ایک باطل دعویٰ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ مخصوص اموال کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ ہر مال زکوۃ ہے سوائے غلام اور گھوڑے کے، بلکہ زکوۃ کا حکم مجمل طور پر دیا گیا اور پھر دوسرے نصوص نے اس اجمال کو مکمل طور پر بیان کر دیا۔ اس میں استثنیٰ قرار نہیں دیا بلکہ یہ خبر دی کہ ان میں زکوۃ نہیں روایت یوں ہے کہ بخاری نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام پر زکوۃ نہیں" جبکہ دوسری روایت یوں ہے ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے کی زکوۃ نہیں"۔ علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«قَدْ عَفَوْتُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيقِ، فَهَاتُوا صَدَقَةَ...»**۔ "**گھوڑے اور غلام کی زکوۃ میں نے تمہیں معاف کر دی۔ صدقہ دیا کرو**"۔ اس کو احمد اور اصحاب سنن نے نقل کیا ہے۔ الحافظ نے اس کے

اسناد کو حسن قرار دیا ہے۔ یہ بھی استثنا نہیں ہے بلکہ ایک چیز ہے، اس میں کسی مال کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نص بھی ہے کہ گدھے پر کیوں زکوۃ نہیں۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے گدھے کی زکوۃ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا گدھے پر زکوۃ ہے؟ فرمایا کہ میرے پاس اس کے بارے میں سوائے اس آیت کے کوئی حکم نہیں آیا 'جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا' متفق علیہ ہے۔

گھوڑے کے بارے میں بھی سوال کیا گیا جب کہ جو ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے، یہ استثناء نہیں بلکہ سوال کا جواب ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اموال میں سے غلام، گھوڑوں اور گدھوں کو مستثنیٰ قرار دے کر باقی تمام اموال پر زکوۃ کو فرض کر دیا۔ یہ تمام شرعی نصوص کے خلاف ہے کیونکہ کسی شرعی نص میں استثناء نہیں ہے۔ کیونکہ استثناء یا تو کسی حکم سے عام نص کے ذریعے ہو گا، یعنی اس نص اور اس جملے میں ہو گا۔ جس کے لیے کوئی حرف استثناء ہو جیسے جاء القوم إلا محمداً 'محمد کے سوا ساری قوم آگئی' یا یوں کہا جائے گا **كه وجبت الزكاة على كل شيء إلا على الخيل والرقيق** **'زکوۃ غلام اور گھوڑے کے علاوہ ہر چیز پر فرض کی گئی'**، یا نص عام ہو گی اور پھر دوسری نص آکر اس عام کو خاص کرے تب استثنیٰ ہو گا۔ ان میں سے کوئی بات نہیں، بلکہ بات یوں ہے کہ غلام، گھوڑے اور گدھے پر زکوۃ نہیں۔ زکوۃ کے نصوص مجمل ہیں پھر سنت کے ذریعے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ گھوڑے اور غلام والی حدیث ایک ایسے عام جملے کی صورت میں نہیں جس میں حرف استثناء کے ذریعے ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو بلکہ یہ ایک (مفرد) منفرد جملے کی شکل میں خبر ہے۔

تجارتی سامان پر زکوۃ کے واجب ہونے کی دلیل حدیث اور اجماع صحابہ ہے۔ ابو دؤد نے اپنے اسناد سے سمرۃ بن جندب سے روایت کیا ہے کہ **«أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنْ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ»** **"امابعد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جو مال بیچنے کے لیے تیار کریں اس کی زکوۃ بھی ادا کریں"** الحافظ نے بلوغ المرام میں کہا ہے کہ اس کو ابو داؤد نے روایت

کیا ہے اور اس کے اسناد ٹھیک ہیں عمرو بن حماس نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ عمرؓ نے مجھے حکم دیا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کروں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس چمڑے کے جیکٹ اور تھیلوں کے علاوہ کوئی مال نہیں تو عمرؓ نے فرمایا ان کو تیار کرو اور زکوٰۃ نکال دو۔ اس کو احمدؒ، شافعی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ یہ قصہ اور اس جیسے اور قصے مشہور ہیں اور کسی صحابی نے اس کا انکار نہیں کیا کیوں کہ یہ اجماع ہے چمڑے عین (اصل) پر زکوۃ واجب نہیں کیونکہ عام طور پر یہ اتنی بڑی مقدار میں کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتا تاہم اس کے مصنوعات جو بیچنے کے لیے تیار ہوں اس پر زکوۃ واجب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس صحابی کے پاس چمڑے (لیدر) کے مصنوعات تھے۔

تیسری بات: ہر مالک سے زکوۃ لی جائے گی، یعنی ہر اس مسلمان سے زکوۃ لی جائے گی جو صاحب نصاب ہو مرد ہو یا عورت، عاقل ہو یا مجنون، بچہ ہو یا بالغ مرد اور عورت سے، تو یہ نص کے عام ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے جبکہ بچے اور مجنون سے اس لیے زکوۃ وصول کی جائے گی کہ زکوۃ کا تعلق مال سے ہے اور مال کے اوپر یہ ایک ہی واجب حق ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری ہے کہ: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ** (التوبہ 103) **"اور جن کے مالوں میں مقرر حصہ ہے"**۔ اور حدیث ہے کہ **«فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ» "اور ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال کی زکوۃ کو ان پر فرض کیا ہے"** ابن عباسؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے۔ اور دیہاتی کے سوال کے جواب والی حدیث میں ہے کہ اس اعرابی نے اسلام کے بارے میں پوچھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کو زکوۃ کے بارے میں بتایا تو اس نے پوچھا کہ زکوۃ کے علاوہ بھی مال پر کوئی حق ہے تو فرمایا نہیں"۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ زکوۃ کی فرضیت مال کے اوپر بحیثیت مال کے ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کا مالک مکلف ہے یا غیر مکلف۔

اللہ تعالیٰ نے مال کے مالک مسلمان پر بحیثیت مال کے مالک، یعنی مالدار ہونے کے کئی حقوق فرض قرار دیئے، جیسے مال کے ذریعے جہاد کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، نفقہ۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور حقوق فرض قرار دیئے لیکن مسلمان کی ملکیت میں موجود اس مال پر سوائے زکوۃ کے اور کوئی حق فرض قرار نہیں دیا۔ مال کے حقوق کو زکوۃ تک ہی محدود رکھا اور کوئی مالی حق مقرر نہیں کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زکوۃ کی یہ

فرضیت مال پر بحیثیت مال کے ہے خواہ اس مال کا مالک مکلف ہو یا غیر مکلف۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ مال سے ہر صورت میں لی جائے گی خواہ اس کا مالک غیر مکلف، یعنی بچہ یا مجنون ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان پر بحیثیت مالدار مسلمان ہونے کے جو فرائض مقرر کیے یا جو حقوق اس کے ذمے مقرر کیے تو صرف بحیثیت مسلمان کے کیے خواہ مکلف ہو یا غیر مکلف جیسا کہ بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کا نفقہ یا کسی کو نقصان (مالی یا جانی) پہنچانے کا جرمانہ اور استعمال شدہ اشیاء کی قیمت وغیرہ۔ یہ سب حقوق بچے مجنون سب پر واجب ہیں کیونکہ ان کا تعلق مال سے ہے بالکل اسی طرح زکوۃ بھی مکلف اور غیر مکلف سب پر واجب ہے کیونکہ اس کا تعلق بھی مال سے ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيهِ، وَلا يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ»** **"جو کسی ایسے (یتیم کا والی ہو کفالت کرنے والا) بنے جس کے پاس مال ہو تو اس یتیم کے مال کو تجارت میں لگائے تاکہ زکوۃ اس کو کھا نہ جائے"** اس کو ترمذی اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ اور پھر دادا کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کے اسناد (راویوں) میں المثنی بن الصباح ہے جس کی شہرت اچھی نہیں تاہم یہی حدیث عمرو بن شعیب نے عمر بن خطابؓ کے موقوفاً روایت کی ہے۔ اس حدیث میں یتیم بچے کا ذکر ہے جو کہ غیر مکلف ہے اس وجہ سے مجنون کو بھی اس پر غیر مکلف ہونے کی وجہ سے قیاس کیا جائے گا۔

چوتھی بات: یعنی یہ بات کہ زکوۃ کو بیت المال میں ایک خاص باب (مد) میں رکھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ مال جس کا مسلمان مستحق ہے اور اس کا کوئی متعین مالک بھی نہیں وہ بیت المال کا حق ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مال کو مسلمانوں کے مفادات کی خاطر خرچ کرے۔ زکوٰۃ کے اگرچہ مسلمان مستحق ہیں لیکن اس کے مالک کا تعین شرعی نص کرے گی۔ شرع نے زکوٰۃ کے مصارف کو بیان کر کے اس کے مالک متعین کر دیئے اور ان مصارف کو بھی ان آٹھ میں محدود کر دیا۔ **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ** (التوبہ:60) **"صدقے صرف فقیروں کے لیے ہیں اور مسکینوں کے**

لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے دلوں کو جوڑ کر رکھنا مطلوب ہے اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور راہبر و مسافروں کے لیے"۔ چونکہ شرع نے زکوٰۃ کے مصارف متعین کر دیئے اس لیے اب یہ بیت المال کا حق نہیں، یعنی بیت المال کو یہ اختیار نہیں کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ زکوٰۃ کو انہی مصارف پر خرچ کیا جائے گا جو شرع نے مقرر کر دیے ہیں۔ بیت المال صرف اس کو محفوظ کرنے کی جگہ ہے کیونکہ زکوٰۃ خلیفہ کے حوالے کی جاتی ہے۔ انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔**«إِذَا أَدَّيْتُ الزَّكَاةَ إِلَى رَسُولِكَ فَقَدْ بَرِئْتُ مِنْهَا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: نَعَمْ، إِذَا أَدَّيْتَهَا إِلَى رَسُولِي فَقَدْ بَرِئْتَ مِنْهَا، فَلَكَ أَجْرُهَا، وَإِثْمُهَا عَلَى مَنْ بَدَّلَهَا» "جب میں زکوۃ تمہارے قاصد (پیغام لانے والے) کو دے دوں، تو کیا اللہ اور اس کے رسول کے سامنے بری الذمہ ہوں گا؟ فرمایا: جی ہاں جب تم نے زکوۃ میرے قاصد کو دے دی تو تمہیں اجر مل گیا اگر اس میں کوئی تبدیلی کرے تو گناہ تبدیلی کرنے والے پر ہو گا۔"** اس کو ابو داؤد اور عبد الرزاق نے روایت کیا ہے جبکہ المنذری نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ خلیفہ کو دی جائے گی کیونکہ وہی زکوۃ اکٹھا کرنے کے لیے اپنے والی اور عامل بھیجے گا۔ پھر زکوۃ خلیفہ کی رائے کے مطابق ان متعین مصارف پر خرچ کی جائے گی۔ اس لیے بیت المال صرف زکوٰۃ کی رکھنے کی جگہ ہے جہاں اس کو ایک خاص جگہ (اکاؤنٹ) میں رکھا جائے گا۔ زکوٰۃ بیت المال کے آمدن میں سے ہے کیونکہ اس کو خلیفہ کو ہی دیا جاتا ہے اور نہ دینے والوں کو اور دینے میں ٹال مٹول کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ لیکن خلیفہ کو یہ اختیار نہیں کہ جہاں چاہے زکوٰۃ کو خرچ کرے بلکہ اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے ان متعین مصارف پر ہی خرچ کر سکتا ہے۔

پانچویں بات: یہ بات کہ زکوٰۃ کو صفت اور عدد کے لحاظ سے مخصوص افراد پر خرچ کیا جائے گا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں حصہ اور تحدید کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے، آیت میں **"إنما"** کا لفظ ہے جو حرف تحصیر ہے اس لیے ان مخصوص اور محدود افراد کے علاوہ زکوٰۃ کہیں بھی خرچ کرنا جائز نہیں۔

«لا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ، وَلا لِذِي مِرَّةٍ سَوِيٍّ»"مالدار اور کمانے والے تندرست آدمی کے لیے زکوۃ حلال نہیں" اس کو ترمذی نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسی حدیث کو ابوہریرہؓ سے روایت کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ کے بارے میں فرمایا **«وَلا حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ، وَلا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ» "زکوۃ میں مالدار اور طاقتور کمانے والے کا کوئی حصہ نہیں"** اسے احمد، ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے، اس کے راوی قابل اعتماد ہیں۔ یہ تمام باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ زکوۃ ان مذکورہ آٹھ مصارف کے علاوہ کہیں بھی خرچ نہیں کی جائے گی۔

دفعہ نمبر144: ذمیوں سے جزیہ لیا جائے گا اور یہ ان کے بالغ مردوں سے ان کی استطاعت کے مطابق لیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں پر جزیہ عائد نہیں ہو گا۔

اس کی دلیل کتاب اور سنت دونوں میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ** (التوبہ 29) **"یہاں تک کہ وہ پست ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں"** اور سنت سے اس کی دلیل یہ ہے **«كَتَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَى مَجُوسِ هَجَرٍ يَدْعُوهُمْ إِلَى الإِسْلاَمِ، فَمَنْ أَسْلَمَ قُبِلَ مِنْهُ، وَإِلاَّ ضُرِبَتْ عَلَيْهِ الجِّزْيَةُ فِي أَنْ لاَ تُؤْكَلَ لَهُ ذَبِيحَةٌ وَلاَ تُنْكَحَ لَهُ امْرَأَةٌ»" (رسول اللہ ﷺ نے) ہجر کے مجوسیوں کو یہ لکھ کر بھیجا کہ جو اسلام لائے گا اس کا اسلام قبول کیا جائے گا ورنہ جزیہ نافذ کیا جائے گا ان کا ذبیحہ نہیں رکھا جائے گا اور کسی عورت کو ان کے نکاح میں نہیں دیا جائے گا"**۔ اسے ابو عبید نے الاموال میں جبکہ ابو یوسف نے الخراج میں نقل کیا ہے۔ جزیہ صرف طاقت رکھنے والے سے لیا جائے گا کیوں کہ آیت میں **عَنْ يَّدٍ** یعنی قدرت (استطاعت) کا ذکر ہے۔

جزیہ مردوں سے لیا جائے گا، عورتوں اور بچوں پر نہیں لیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے معاذؓ سے فرمایا **«خُذْ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِينَاراً»"ہر بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرو"** اس کو حاکم نے

روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے جبکہ بیہقی نے اسے اپنی سنن الکبریٰ میں عمرو بن شعیب سے ان کے والد اور پھر دادا کے حوالے سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ **«فَرَضَ الجِزْيَةَ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ مِنْ أَهْلِ اليَمَنِ دِينَاراً دِينَارا»** **"رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار جزیہ مقرر کر دیا"**۔ ان احادیث میں لفظ «حَالِمٍ» یا «مُحْتَلِمٍ» مذکر کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ جزیہ بالغ مردوں سے ہی لیا جائے گا عورتوں اور بچوں سے نہیں۔ عمر بن خطابؓ نے بھی اپنے گورنروں کو لکھا کہ جزیہ صرف بالغ مردوں سے وصول کرو۔ اسے ابو عبید نے الاموال میں اور بیہقی نے اسلم سے روایت کیا ہے کہ کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی جس کا مطلب ہے کہ اس پر اجماع ہے۔ بچوں پر قیاس کرتے ہوئے مجنون (پاگل) سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

دفعہ 145: خراجی زمین پر خراج اس زمین کے مطابق لیا جائے گا جبکہ عشری زمین پر زکوۃ اس کی عملی پیداوار پر لی جائے گی۔

اس کی دلیل وہ روایت ہے جو زُھری نے نقل کی ہے: **«قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِيمَنْ أَسْلَمَ مِنْ أَهْلِ البَحْرَيْنِ أَنَّهُ قَدْ أَحْرَزَ دَمَهُ وَمَالَهُ إِلاَّ أَرْضَهَ، فَإِنَّهَا فَيْءٌ لِلْمُسْلِمِينَ؛ لأَنَّهُمْ لَمْ يُسْلِمُوا وَهُمْ مُمْتَنِعُونَ»** **"اہل بحرین میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ انہوں نے اپنے خون اور مال کو تو محفوظ کر لیا لیکن زمین کو نہیں، ان کی زمین مسلمانوں کا مال ہی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ (ابتداً) مسلمان نہیں ہوئے بلکہ صلح کے بعد مسلمان ہوئے"**۔

اسے یحییٰ بن آدم نے کتاب الخراج میں بیان کیا ہے یعنی یہ لوگ مسلمانوں کی حفاظت میں ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے جو زمین طاقت کے زور پر فتح کی جائے وہ مسلمانوں کے لیے مالِ غنیمت ہو گی تاہم سیدنا عمرؓ نے اس زمین کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور اس کے فائدے کو زمین والوں کو دے دیا اور اس فائدے کے

بدلے میں ان سے زمین کی صلاحیت کے حساب سے خراج لیتے رہے اور کوئی خاص مقدار مقرر نہیں کی۔ چنانچہ عراق کے بعض علاقوں میں ایک جریب زمین پر ایک درہم اور قفیز مقرر کیا۔ جریب ایک پیمانہ ہے جس سے زمین کے رقبے کی پیائش کی جاتی ہے۔ جبکہ شام کے کچھ علاقوں پر اس سے مختلف مقدار میں خراج مقرر کیا یعنی ہر جگہ زمین کی قابلیت کو پیشِ نظر رکھا۔ یہ سب خراجی زمین کے حوالے سے تھا جبکہ عشری زمین وہ زمین ہے جس کے رہنے والے اس پر رہتے ہوئے خود ہی مسلمان ہوگئے اور جزیرۃ العرب کی زمین، تو ان کی پیداوار پر زکوۃ وصول کی جائے گی۔ اور وہ زکوۃ اس طرح ہو گی کہ اگر زمین کو بارش کا پانی مل رہا ہو تو پورا عشر ہو گا اور اگر کسی آلے کے ذریعے پانی دیا جارہا ہو تو پھر نصف عشر ہو گا۔

دفعہ نمبر146: مسلمانوں سے وہ ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کی شرع نے اجازت دی ہے اور جتنا بیت المال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ ٹیکس اس مال پر وصول کیا جائے گا جو صاحبِ مال کے پاس معروف طریقے سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد زائد ہو اور یہ ٹیکس ریاست کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی بھی ہو۔

اس دفعہ میں تین باتیں ہیں۔ پہلی بات ٹیکس کی وصولی ہے، دوسری بات یہ ٹیکس صاحبِ مال سے اپنی ضروریات کو عرف (جائز رواج) کے مطابق پورا کرنے کے بعد جو مال بچ جاتا ہے اس میں سے وصول کیا جائے گا۔ تیسری بات یہ کہ اتنی مقدار میں وصول کیا جائے گا کہ بیت المال کی ضرورت پوری ہو اس سے زیادہ ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

پہلی بات یعنی ٹیکس لینا، ٹیکس ایک مغربی اصطلاح ہے اور یہ وہ مال ہے جو صاحبِ اقتدار حکومتی معاملات چلانے کے لیے ریاست کے شہریوں سے لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ اسلامی ریاست اپنے معاملات چلانے کے لیے مسلمانوں پر ٹیکس لگائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شرع نے بیت المال کے ذرائع

آمدن کی تحدید اور تعین کر دیا ہے۔ اور اس آمدن سے ریاست کے معاملات چلانے کا حکم دیا ہے اور ریاستی معاملات چلانے کے لیے کوئی ٹیکس وغیرہ مقرر نہیں کیا ہے۔ نبی ﷺ بھی اسی آمدن کے ذریعے ریاستی معاملات چلاتے تھے اس کا کوئی ثبوت یا روایت نہیں کہ نبی ﷺ نے لوگوں پر کبھی کوئی ٹیکس لگایا ہو۔ بلکہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ ریاست کے حدود میں ریاست میں داخل ہونے والے سامان پر ٹیکس وصول کیا جارہا ہے تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ **«لا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ صَاحِبُ مَكْسٍ» "کسٹم لگانے والا جنت میں نہیں جائے گا"** اسے احمد نے نقل کیا ہے اور حاکم، زین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابو الخیر سے روایت ہے کہ میں نے رویفع بن ثابت سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِنَّ صَاحِبَ الْمَكْسِ فِي النَّارِ» "کسٹم لینے والا آگ میں ہو گا"**۔ ابو عبید نے اسے کتاب الاموال میں نقل کیا ہے، احمد نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور الزین نے اسے حسن قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ خارجی تجارت پر عشر لینے والا۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ مغربی اصطلاح ٹیکس (کے جو معنی ہیں وہ) حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک متفق علیہ حدیث ہے جو ابو بکرہ نے روایت کی ہے: **«إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا...» "بے شک تمہارا خون، تمہارے اموال اور تمہاری آبرو اس دن (یوم عرفہ) اس شہر (مکہ مکرمہ) اور اس مہینے (ذوالحجہ) کی طرح ایک دوسرے پر حرام ہیں"**۔ یہ حدیث عام ہے، ہر انسان بلکہ ریاست بھی اسی میں شامل ہے۔ ریاست کی جانب سے ٹیکس لینا مسلمانوں کی مرضی کے بغیر ان کے مال کو لینا ہے جو کہ حرام ہے۔ اب رہی یہ بات کہ بیت المال کے آمدن کے ذرائع محدود ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ریاستی معاملات کے لیے کافی نہ ہو اور کچھ ایسی ضرورت کے معاملات ہوں جن کو چلانے کے لیے بیت المال میں مال نہ ہو تو کیا اس صورت میں ٹیکس نافذ کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیت المال پر جو شرع نے فرض قرار دیا ہے (مال خرچ کرنا) اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ ہے کہ وہ بیت المال اور مسلمانوں دونوں پر فرض ہے یا پھر وہ صرف بیت المال پر فرض ہے اور مسلمانوں پر فرض نہیں۔

تو جس کام کے لیے مال خرچ کرنا صرف بیت المال کی ذمہ داری ہے مسلمانوں کی نہیں، اس کے لیے ٹیکس لگانا ریاست کے لیے جائز نہیں۔ اگر بیت المال میں مال موجود ہو تو وہ کام کیا جائے گا ورنہ اس کام کو مؤخر کر کے مال آنے کا انتظار کیا جائے گا اس کے لیے بالکل ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ کیونکہ اس کام کو شرع نے مسلمانوں پر فرض ہی نہیں کیا تو اس کے لیے ان پر ٹیکس لگانا بھی جائز نہیں۔ ورنہ اس حالت میں ٹیکس لگانا ظلم ہو گا جو کہ حرام ہے۔ اور یہ اللہ کی طرف سے کسی غیر واجب کام کو اپنی طرف سے واجب قرار دینے کے مترادف ہو گا، یہ گویا مباح کو حرام قرار دینا اور حرام کو مباح قرار دینا ہے جو کہ شرع میں اضافہ کرنا ہے۔ اور ایسا کرنے والا اگر اعتقاد کے ساتھ ایسا کرے تو کافر اور اگر بغیر اعتقاد کے ساتھ ایسا کرے تو نافرمان ہو گا۔ یوں ایسے کام کے لیے مسلمانوں پر ٹیکس لگانا ریاست کے لیے حرام ہے جو مسلمانوں پر فرض ہی نہیں جیسا زکوۃ اکٹھا کرنے والوں کو تنخواہ دینے کے لیے یا کسی کا دل جیتنے کے لیے یا غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے یا قرضداروں کا قرض چکانے کے لیے یا ایک سڑک کے ہوتے ہوئے دوسری سڑک بنوانے کے لیے یا بارش کے پانی کو محفوظ کرنے کے لیے ڈیم بنانے کے واسطے یا ضرورت کے ہسپتال کے ہوتے ہوئے دوسرا ہسپتال بنوانے کے لیے یا اس قسم کا کوئی بھی کام کرنے کے لیے جو انتہائی ضروری نہ ہو بلکہ اس کا کرنا فائدہ مند ہو ان کاموں کے لیے ریاست مسلمانوں پر ٹیکس نہیں لگا سکتی کیونکہ یہ کام مسلمانوں پر فرض نہیں یہ کام بیت المال کا ہے جب مال موجود ہو گا تو اس کا فرض ہو گا کہ وہ یہ کام انجام دے اگر مال نہیں ہو گا تو یہ فرض ساقط ہو گا، تب مال کا انتظار کیا جائے گا۔

ہاں وہ مصارف جن پر خرچ کرنا بیت المال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی فرض ہے اس کے لیے اگر بیت المال میں مال نہ ہو یا مال خرچ کرنے کی وجہ سے ختم ہو گیا تب ان فرائض کو ادا کرنے کے لیے مسلمانوں پر ٹیکس لگانا ریاست کے لیے جائز ہے۔ کیونکہ یہ نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر فرض تھا اور امام (خلیفہ) کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر والی (نگران) مقرر کیا ہے اس لیے خلیفہ ہی مسلمانوں سے مال لے کر ان کے فرض کو ادا کرے گا، جیسا کہ فقراء کے لیے لازمی نفقہ یا مسکینوں اور مسافروں کے لیے بنیادی خرچ مہیا کرنا۔ اور اگر ان لازمی امور کے لیے بیت المال کی زکوۃ کی آمدن میں کچھ نہ ہو اور زکوۃ کے علاوہ

کی آمدنی میں سے بھی کچھ نہ ہو تب مالدار مسلمانوں پر ٹیکس لگا کر اس فرض کو ادا کیا جائے گا۔ کیونکہ فقیر کو کھانا کھلانا تمام مسلمانوں پر فرض ہے ،کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَأَيُّمَا أَهْلُ عَرْصَةٍ أَصْبَحَ فِيهِمْ امْرُؤٌ جَائِعٌ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللَّهِ تَعَالَى»** **"کسی بستی میں کوئی شخص بھوکا سو جائے تو اللہ ان بستی والوں سے بَری الذمہ ہے"**۔ اسے احمد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور احمد شا کر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح فوج کے ضروری اخراجات کے لیے یا حالتِ جنگ میں بیت المال کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس سے فوج کی ضرورت کو پورا کیا جاسکے ،تب مسلمانوں پر اتنا ٹیکس لگایا جائے گا کہ جس سے یہ ضرورت پوری ہو، کیونکہ ارشاد باری ہے: **وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (التوبہ: 41) **"اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو"** اور ارشاد ہے **وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** **"اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ (نے بیٹھنے والوں سے بہت فضیلت دی ہے)"** (سورۃ الحجرات:15) ۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ»** **"مشرکین سے اپنے اموال اپنے ہاتھ اور زبان سے جہاد کرو"** اس کو احمد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔ نسائی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ اسی طرح بنیادی ضرورت کی چیز جس کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو پریشانی ہو رہی ہو جیسے راستے کا نہ ہونا یا ضرورت کے ہسپتال کا نہ ہونا وغیرہ تو ان کاموں کے لیے ریاست بیت المال میں مال نہ ہونے کی صورت میں مال دار مسلمانوں سے حسبِ ضرورت ٹیکس وصول کر سکتی ہے کیونکہ پریشانی کو دور کرنا مسلمانوں پر واجب ہے ،رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«لا ضَرَرَ وَلا ضِرَارَ»** **"نہ ضرر پہنچانا اور نہ قبول کرنا"**۔ اس کو احمد نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور الذھبی نے بھی ان کی حمایت کی ہے۔ اسی طرح سپاہیوں، قاضیوں اور اساتذہ کی تنخواہوں کے لیے بھی ریاست ٹیکس وصول کر سکتی ہے، کیونکہ یہ کام مسلمانوں پر فرض ہے۔ تعلیم بھی فرض ہے۔ قضاء (عدالت) اور جہاد یہ تینوں فرائض میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں نصوص موجود ہیں یہ

سارے کام بیت المال اور مسلمانوں دونوں پر فرض ہیں، ان کے انجام دہی کے لیے اگر بیت المال میں کافی مقدار میں مال موجود نہ ہو تو پھر ریاست مالدار مسلمانوں سے اس قدر ٹیکس وصول کرے گی کہ جس سے یہ ضروریات پوری ہوں۔ یہ تھی اس دفعہ کی پہلی دلیل۔

دوسری بات: **«أفضلُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى»** **"بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد بچے ہوئے مال سے دیا جائے"** حکیم بن حزام اور ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اس میں غنی سے مراد اتنا مال ہے جو اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنْ الْيَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ»** **"بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد بچے ہوئے مال سے دیا جائے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، (صدقے کی) ابتداء اپنے اہل و عیال سے کرو"** (متفق علیہ)۔ اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے جو جابرؓ سے منقول ہے **«ابْدَأْ بِنَفْسِكَ فَتَصَدَّقْ عَلَيْهَا فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ فَلأَهْلِكَ»** **" اپنے آپ سے ابتداء کرو پھر جو بچے اپنے اہل و عیال کو دو"**۔ اس حدیث میں ان لوگوں کو مؤخر کر دیا گیا جن کا نفقہ واجب ہے اور اپنے نفس کو اس پر مقدم کر دیا، یہی حال ٹیکس کا ہو گا کیونکہ وہ بھی نفقہ اور صدقہ کی طرح ہے۔ ارشاد باری ہے: **وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ** (البقرۃ:219) **"آپ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے حاجت سے زائد چیز"** اپنی حاجت سے زائد ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جس کو خرچ کرنے کی صورت میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں سے کوئی بھی مال خواہ زکوۃ ہو یا کوئی اور صدقہ معروف کے مطابق اس کی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد وصول کیا جائے گا، اسی طرح ٹیکس بھی اس مال سے وصول کیا جائے گا جو ضرورت کو پورا کرنے کے بعد بچا ہو یعنی جو اس کے کھانے پینے، لباس، گھر، ملازم، شادی کے اخراجات اور ضرورت کی سواری کے علاوہ ہو، رسول اللہ ﷺ کے قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ مالدار سے ٹیکس لیا جائے گا۔

تیسری بات: صرف اس کام کے لیے ٹیکس وصول کیا جائے گا جو مسلمانوں پر فرض ہے اور اتنی مقدار میں لیا جائے گا جو اس کام کے لیے کافی ہو، اس سے زیادہ لینا حرام ہے۔ علیؓ نے عمر بن خطابؓ کو تجویز دی کہ بیت المال میں کوئی چیز باقی نہیں رہنی چاہیے۔ آپؓ نے عمرؓ سے کہا: ہر سال جتنا مال آپ کے پاس آئے وہ سب کا سب تقسیم کر دیں اور کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھیں۔ اسے ابنِ سعد نے الواقدی سے نقل کیا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ علیؓ بیت المال میں موجود مال کو تقسیم کرتے یہاں تک کہ بیت المال بالکل خالی ہو جاتا اور آپؓ کے لیے بستر بچھا دیا جاتا اور آپؓ اس پر بیٹھا کرتے تھے۔ اس کو ابن عبد البر نے الاستذکار میں انس بن سیرین سے نقل کیا ہے۔ جبکہ یہ ٹیکس کے علاوہ بیت المال کی دوسری آمدن کے بارے میں ہے تو پھر ٹیکس کے مال کو کس طرح جمع کر کے رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی ٹیکس صرف وصول کیا جائے گا تاکہ اس سے ضرورت پوری ہو، ضرورت سے زیادہ نہیں جو بیت المال میں پڑا رہے یہ سب اس دفعہ میں موجود تین باتوں کے دلائل تھے۔

دفعہ نمبر 147: ہر وہ عمل (کام) جس کی انجام دہی کو شرع نے امت پر فرض قرار دیا ہے اگر بیت المال میں اتنا مال موجود نہ ہو جو اس فرض کام کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو تب یہ فرض امت کی طرف منتقل ہو گا۔ ایسی صورت میں ریاست کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ امت سے ٹیکس وصول کر کے اس ذمہ داری کو پورا کرے۔

جن امور کی انجام دہی کو شرع نے امت پر واجب قرار نہیں دیا ہے ان کے لیے ٹیکس وصول کرنا ریاست کے لیے جائز نہیں۔ چنانچہ ریاست کے لیے کورٹ فیس، دفتری فیس یا عدالتی فیس وغیرہ لینا جائز نہیں۔ اس کی دلیل وہی ہے جو سابقہ دفعہ یعنی 146 کی پہلی شق کی ہے کہ شرع نے عام آمدن متعین کر دیئے اور رسول اللہ ﷺ نے کوئی ٹیکس نہیں لگایا بلکہ کسٹم (ٹیکس / چنگی) سے منع فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کا ٹیکس ممنوع ہے۔ اس لیے شرع نے جس کام کو بیت المال پر واجب قرار دیا ہے تو اگر بیت المال میں مال موجود

ہو تو اس مال سے بیت المال وہ کام کرے گا اگر بیت المال میں مال نہ ہو تو بیت المال انتظار کرے گا اور جب مال آئے گا تو اس کام پر خرچ کرے گا۔ اگر وہ کام بیت المال کے ساتھ ساتھ امت پر بھی فرض ہو اور بیت المال میں مال موجود نہ ہو تب ریاست کے لیے جائز ہے کہ وہ امت سے اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ٹیکس وصول کرے اور اس واجب کام کو انجام دے۔ جس طرح امت پر بلاواسطہ (براہِ راست) ٹیکس لگانا جائز نہیں اسی طرح بلواسطہ ٹیکس بھی جائز نہیں۔ اس لیے کورٹ فیس، دفتر فیس، کسٹم ڈیوٹی یا این او سی (NOC) فیس یا اس قسم کی کوئی بھی فیس یا ٹیکس لینا جائز نہیں۔ جہاں تک ڈاک ٹیکس کی بات ہے تو یہ ٹیکس نہیں بلکہ یہ خطوط یا پارسل پہنچانے کا معاوضہ ہے اور یہ جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بلواسطہ ٹیکس جس کی شرع نے اجازت نہیں دی ہے بالکل بلاواسطہ ٹیکس کی طرح ہے اور اس کو وصول کرنا بالکل جائز نہیں۔

دفعہ نمبر148: ریاستی بجٹ کے دائمی ابواب (مدات) ہیں جن کو شرع نے متعین کیا ہے۔ جہاں تک بجٹ سیکشنز کا تعلق ہے یا ہر سیکشن میں کتنا مال ہوتا ہے یا ہونا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر سیکشن میں موجود مال سے متعلقہ امور کا تعلق خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر منحصر ہے۔

بجٹ کا لفظ ایک مغربی اصطلاح ہے اس کا مطلب ہے ریاست کی آمدن اور وہ ذرائع جن سے یہ آمدن حاصل ہوتی ہے اور اس کے کتنے شعبے ہیں اور کتنی مقدار میں مال آتا ہے اور ساتھ ہی کتنا مال خرچ ہوتا ہے یا کس شعبے کے لیے کتنا مال درکار ہے وغیرہ، یہ ہے بجٹ کی حقیقت۔ مسلمان ان چیزوں سے آشنا نہیں تھے وہ صرف بیت المال کو جانتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ بیت المال میں مال کہاں سے آتا ہے اور کہاں خرچ کیا جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ بیت المال میں مختلف ذرائع سے مال کا آنا اور مختلف مدات میں خرچ ہونا یہی بعینہ بجٹ ہے اگرچہ اس کو مسلمان بجٹ نہیں کہتے تھے۔ اس وجہ سے اس اصطلاح کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ

اس کا مطلب بس اتنا ہے کہ آمدن کے مختلف ذرائع اور خرچ کرنے کے مختلف شعبے ہیں۔ یوں ریاست کا بجٹ ہو گا اور بیت المال ہی اس بجٹ کو تیار کرنے کا ذمہ دار ہے۔

اب یہ بات کہ اس بجٹ کو کس طرح تیار کیا جائے گا اس کے شعبے کون کون سے ہوں گے اور کس شعبے میں کونسا مال رکھا جائے گا وغیرہ۔ اس سب کا فیصلہ شرع نے کر دیا ہے اور ان کے لیے احکامات مقرر کر دیئے ہیں۔ آمدن کے بارے میں بھی احکامات ہیں کہ وہ کن کن ذرائع سے حاصل ہو گی، جیسے خراج، فئی وغیرہ اور خرچ کہاں کرنا ہے اس کے بارے میں بھی احکامات آگئے اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ کہاں مال خرچ کرنا لازمی ہے اور کہاں خرچ کرنا غیر لازمی ہے۔ چونکہ آمدن اور اخراجات دونوں کے بارے میں شرع کے احکامات آگئے تو بجٹ کے آمدن اور خرچ دونوں کے شعبے دائمی ہو گئے کیونکہ یہ شرع کے احکامات کے ذریعے مقرر کیے گئے ہیں اور شرعی احکامات دائمی ہوتے ہیں اور تبدیل نہیں ہوتے۔ البتہ اسکے فروعی مسائل جیسے کس قسم کی زمین پر کتنا خراج مقرر کرنا چاہیے وغیرہ، تو یہ خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے۔ بیت المال کی آمدن اور اخراجات کے بارے میں تو شرعی احکامات آگئے اور بیت المال میں موجود اس مال کو جس کے بارے میں شرع نے کوئی معین مصرف (خرچ کرنے کی جگہ) مقرر نہیں کی اس کو خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ تینوں دلائل یعنی آمدن کے دلائل، اخراجات کے دلائل اور خلیفہ کی جانب سے معاملات کی دیکھ بھال کے دلائل ہی اس دفعہ کے دلائل ہیں۔ چونکہ خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے آمدن کے شعبے اور ہر شعبے میں کتنا مال رکھنا ہے اس کا فیصلہ کرے اور خرچ کرنے کے شعبے اور کس شعبے کو کتنا مال دینا ہے یہ بھی خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے اس لیے ریاست کے لیے سالانہ بجٹ بنانا ممنوع نہیں خواہ یہ آمدن سے متعلق ہو یا خرچ کرنے سے متعلق۔ جو چیز ممنوع ہے وہ یہ کہ بجٹ کی مدات کا تعین کیا جائے کیونکہ احکام شریعہ نے مستقل طور پر ان کا تعین کر دیا ہے۔

دفعہ نمبر149: بیت المال کی آمدن کے دائمی ذرائع یہ ہیں۔ تمام ترفئی، جزیہ، خراج، رِکاز کا خمس (پانچواں حصہ)، زکوۃ، ان اموال کو ہمیشہ وصول کیا جائے گا خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

اس دفعہ کے دلائل وہی ہیں جو بیت المال کی آمدن کے دلائل ہیں۔

فئی کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ** (الحشر: 7) **"بستیوں والوں کا جو مال اللہ تعالیٰ تمہارے لڑے بھڑے بغیر اپنے رسولؐ کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے اور رسولؐ کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے"** اور جزیہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ** (التوبۃ:29) **"یہاں تک کہ وہ پست ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دا کریں"**

خراج کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو عبید نے '' الأراضي الخراجية '' میں نقل کی ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ ''ہمیں رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفائے راشدینؓ کے آثار ملے ہیں جن سے مفتوح زمین کے تین احکامات ہمیں پتہ چلتے ہیں۔ جس زمین پر رہنے والے اس پر رہتے ہوئے خود بخود اسلام قبول کریں تو وہ زمین ان ہی کی ملکیت میں رہے گی اور وہ عشری زمین ہو گی۔ عشر کے علاوہ ان پر کچھ بھی نہیں ہو گا۔ جبکہ جو زمین ایک خاص مقدار میں خراج دینے کی شرط پر صلح کے ذریعے فتح کی گئی ہو تو جس مقدار پر صلح ہوئی اس زمین والے اسے ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہ زمین جو طاقت اور قوت کے زور پر فتح کی گئی اس کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رہا ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ زمین مالِ غنیمت کے حکم میں سے ہے، خمس نکالنے کے بعد اس کو تقسیم کیا جائے گا یعنی اس کے پانچ حصوں میں سے چار حصے لڑنے والے مجاہدین کو دیے جائیں گے جبکہ پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے یعنی بیت المال کے پاس رہے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا حکم خلیفہ کی رائے پر موقوف ہے چاہے اس کا خمس نکال کر اس کو تقسیم کرے جیسا رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں کیا یا پھر اس کو فئے بنائے۔ یعنی نہ خمس نکالے اور نہ ہی تقسیم کرے بلکہ اس کو تمام مسلمانوں کے لیے وقف قرار دے دے جیسا کہ

عمر بن خطابؓ نے سواد کی زمینوں کے ساتھ کیا۔ یہ تھے فتح کی گئی زمینوں کے احکامات'' (یہاں تک یہ ابو عبید کا کلام تھا)۔ عمر بن خطابؓ اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان السواد کی زمینوں کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس کو ابو یوسف نے الخراج میں نقل کیا ہے۔

رکاز پر خمس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ»** **"اور رکاز پر خمس (پانچواں حصہ) ہے"**۔ جبکہ زکوۃ کے دلائل تو بہت ہی زیادہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **وَاٰتُوا الزَّكَاةَ** (البقرۃ 43) **"اور زکوۃ ادا کیا کرو"**۔ رسول اللہ ﷺ نے معاذؓ سے فرمایا **«فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ»** **" ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اموال پر زکوۃ کو ان پر فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے وصولی کی جائے گی اور ان کے فقراء کو دی جائے گی"**۔

یہ تمام دلائل وجوب کے لیے ہیں اس لیے ان سب اموال کی ادائیگی اور وصولی فرض ہے یہ اموال ہر حال میں وصول کیے جائیں گے خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فرض قرار دیا ہے اور فرض کو ہر صورت پورا کیا جاتا ہے۔

دفعہ 150: بیت المال کی دائمی آمدنی اگر ریاست کے اخراجات کے لیے ناکافی ہو تب ریاست مسلمانوں سے ٹیکس وصول کرے گی اور یہ ٹیکس وصولی ان امور کے لیے ہے:

ا۔ فقراء، مساکین، مسافر اور فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے بیت المال کے اوپر واجب نفقات کو پورا کرنے کے لیے۔

ب۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جنہیں پورا کرنا بیت المال پر بطورِ بدل واجب ہے جیسے ملازمت کے اخراجات، فوجیوں کا راشن اور حکام کے معاوضے۔

ج۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جو مفاد عامہ کے لیے بغیر کسی بدل کے بیت المال پر واجب ہیں۔ جیسا کہ نئی سڑکیں بنوانا، زمین سے پانی نکالنا، مساجد، اسکول اور ہسپتال بنوانا۔

د۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جو بیت المال پر کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے واجب ہوں جیسے ہنگامی حالت میں قحط، طوفان اور زلزے وغیرہ کی صورت میں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ شرع نے اپنی طرف سے کوئی ٹیکس نافذ کرنے سے حکمران کو منع کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **«لا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ صَاحِبُ مَكْسٍ»** **"کسٹم لگانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا"**۔ اس کو احمد نے نقل کیا ہے اور زین اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس میں لفظ مکس ہے جس کا مطلب ہے وہ ٹیکس جو ریاست کی حدود میں تاجروں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہر قسم کے ٹیکس کے لیے ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے کہ تمہارا خون، تمہارے اموال، تمہاری عزتیں تم پر اس طرح ہی حرام ہیں جیسا کہ یہ دن، یہ شہر اور یہ مہینہ۔ یہ عام ہے اس میں خلیفہ وغیرہ اور سب ہی شامل ہیں۔ چونکہ شرع نے ٹیکس کو حرام قرار دیا چنانچہ خلیفہ کے لیے جائز نہیں کہ وہ رعایا پر اپنی طرف سے کوئی ٹیکس لے۔ تاہم جس کام کے لیے ٹیکس وصول کیا جارہا ہو وہ کام اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا فرض ہو تب خلیفہ وہ ٹیکس نافذ بھی کر سکتا ہے اور جبراً اس کو وصول بھی کر سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں ٹیکس وصول کرنا خلیفہ کی اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنیاد پر ہو گا کیونکہ حکمران کا کام صرف اللہ کے حکم کو نافذ کرنا ہے۔ اس وجہ سے اللہ کے حکم پر عمل درآمد کرنے کے لیے شرع خلیفہ کو ٹیکس لینے کی اجازت دیتی ہے۔ مسلمان اس کو اللہ کا حکم سمجھ کر دیں گے خلیفہ کا کام اس کو اکھٹا کرنا اور اس کے ذریعے مسلمانوں پر فرض عمل کو انجام دینا ہے۔ اس بنا پر یوں کہا جائے گا کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ نے بیت المال اور مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے

اس کے لیے بیت المال میں مال ہو تو اس کو خرچ کیا جائے گا اگر بیت المال میں مال نہ ہو یا ہو مگر ختم ہو جائے یا اتنی مقدار میں ہو جو کافی نہ ہو تب خلیفہ مسلمانوں سے ٹیکس وصول کر کے ان پر عائد فرض کو ادا کرے گا۔ اس دفعہ میں بیان کردہ تفصیلات کا حکم درج ذیل ہے:

پیراگراف (ا) کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فقراء، مساکین، راہبر و مسافر اور فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے مال خرچ کرنے کو خلیفہ پر فرض قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اس کو تمام مسلمانوں پر بھی فرض قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **«مَا آمَنَ بِي مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهُ جَائِعٌ وَهُوَ يَعْلَمُ»** **"وہ شخص مجھ پر ایمان ہی نہیں لایا جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے اور اس کو اس بات کا علم بھی ہو"**۔ اس حدیث کو البزاز نے انسؓ سے روایت کیا ہے اور بیہقی اور منذری نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ دلائل میں فقراء، مساکین، مسافر اور سوالیوں کا ذکر ہے اور ساتھ ہی زکوٰۃ کا حکم ہے، جبکہ جہاد کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے **وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ** **" اور اپنے اموال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو"** (سورۃ الحجرات:15)۔

پیراگراف (ب) کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملازمین کے اخراجات اور فوج کے راشن یعنی ان کی اجرت کو جو کہ عقد اجارہ کی صورت میں ان سے معاہدہ کیا گیا ہو خلیفہ پر فرض قرار دیا ہے۔ خلیفہ اور سارے حکمرانوں کے معاوضے بھی بیت المال پر واجب ہیں، جیسا کہ صحابہؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد ابو بکرؓ کے لیے بیت المال سے خاص مقدار میں مال مقرر کیا تھا۔ اسی طرح تعلیم، عدلیہ اور جہاد بالمال بھی مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ فوجیوں کے راشن (اجرت) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لِلْغَازِي أَجْرُهُ، وَلِلْجَاعِلِ أَجْرُهُ وَأَجْرُ الْغَازِي»** **" غازی کے لیے اس کا اپنا اجر ہے جبکہ جاعل (جس کی جگہ کوئی اور شخص جہاد کرے اور وہ اس شخص کو جہاد کی اُجرت دے) کے لیے اپنا اور غازی دونوں کا اجر ہے"**۔ اس کو ابو داؤد نے عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ملازمین کے اخراجات کی بات کا جہاں تک تعلق ہے جیسے معلمین اور عدلیہ، تو یہ اس دلیل پر ہیں کہ ان کو مقرر کرنے کو شرع نے واجب قرار دیا ہے اس لیے ان

کے لیے اجرت مقرر کرنا بھی اس قاعدے کی رو سے واجب ہو گا کہ جس کام کے بغیر کوئی واجب ادا نہ ہو تا ہو تو وہ کام بھی واجب ہے، کیونکہ بغیر اجرت کے معلمین اور قاضیوں کا تقرر ممکن نہیں۔ رہی بات دیگر ملازمین کی، تو ان کے کام کی نوعیت کو دیکھا جائے گا کہ اگر ان کا کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا فرض ہے تو اسکے لیے ٹیکس لگانا جائز ہے، جیسے مساجد کے امام یا جنگی محکمے کے ملازمین وغیرہ۔ اگر وہ کام بیت المال پر واجب ہے اور مسلمانوں پر واجب نہیں جیسے زکوۃ وغیرہ وصول کرنے والوں کی تنخواہیں تو اس کے لیے ٹیکس لگانا جائز نہیں۔ حکمرانوں کے معاوضے کے لیے بوقت ضرورت ٹیکس لگانا اس لیے جائز ہے کہ حکمران مقرر کرنے کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے تو اس فرض کی ادائیگی مال کے بغیر ممکن نہیں، ان کو مقرر کرنا فرض ہے تو ان کو ریاستی امور کو چلانے کی خاطر اپنا ذاتی کام یا ملازمت نہ کرنے کی بناء پر معاوضہ دینا بھی فرض ہے۔

پیراگراف (ج) کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلیفہ پر اس امر کو فرض قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کے مفادات کی نگرانی کرے اور ان کے مفادات اور ضروریات کے لیے مال خرچ کرے۔ مفاد یا مصلحہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو امت استعمال کرتی ہے جیسے پانی، تعلیم، سڑکیں وغیرہ۔ ہر قسم کی مفادِ عامہ کی چیزوں میں مسافر خانے، پبلک ٹائلٹ، ہسپتال، مساجد اور ان کے ساتھ وضو خانے یا بیٹھنے کے لیے جگہ اور اس قسم کی دوسری سب چیزیں شامل ہیں۔ مصلحہ یا مفاد کہتے ہیں فائدہ اٹھانے اور نقصان سے بچنے یا پریشانی سے دور رہنے کو۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ''نہ کسی کو ضرر (نقصان) پہنچانا ہے اور نہ ہی ضرر (نقصان) کو قبول کرنا ہے'' مذکورہ ضروریات کی عدم دستیابی ضرر کا باعث بنتی ہیں اور ضرر سے بچنا اور بچانا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: **«مَنْ ضَارَّ أَضَرَّ اللهُ بِهِ، وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللهُ عَلَيْهِ»** **''جو کسی کو نقصان پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اس کو نقصان پہنچائے گا اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے گا اللہ تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈالے گا''**۔ اس کو احمد اور ابو صرمہ سے ایسی اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جن کو زین نے صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم نے بھی اسے ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مفادِ عامہ کی ضروریات کی عدم دستیابی سے مسلمانوں کو مشقت اور پریشانی کا سامنا

ہوتا ہے اس لیے خلیفہ پر فرض ہے کہ وہ ان ضروریات کو فراہم کر کے امت کو پریشانی اور مشقت سے بچائے اس طرح یہ مسلمانوں پر بھی واجب ہے کیونکہ یہ دلائل عام ہیں جو کہ خلیفہ اور امت دونوں کے لیے ہیں۔

پیراگراف (د) کی دلیل وہ نصوص ہیں جو مصیبت زدہ لوگوں کے بارے میں ہیں، طوفان یا زلزلہ وغیرہ سے متاثرین مصیبت زدہ لوگ ہوتے ہیں اور قحط تو اس حدیث کے ماتحت ہے کہ وہ شخص مجھ پر ایمان ہی نہیں لایا جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے اور اس کو معلوم بھی ہو۔ اس حدیث کو البزاز نے انسؓ سے روایت کیا ہے اور ہیثمی اور منذری نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اور دوسری حدیث کہ "جس بستی میں کوئی شخص بھوکا سوئے اللہ ان لوگوں سے بیزار ہے" جس کو احمد نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے اور احمد شاکر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ دونوں احادیث عام ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری بیت المال اور مسلمانوں دونوں کی ہے۔

دفعہ نمبر151: وہ اموال بھی آمدن میں شمار ہوتے ہیں جو ریاست کی سرحدوں پر کسٹم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں یا عوامی ملکیت اور ریاستی ملکیت سے حاصل ہوتے ہیں یا لاوارث ہونے کی وجہ سے بیت المال میں جمع کیے جاتے ہیں یا پھر مرتدوں کے اموال۔

اس کی دلیل عمرؓ سے منقول ہے کہ دارالحرب کے تاجروں سے بھی وہی لے لو جو وہ مسلمان تاجروں سے لیتے ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے المصنف میں نقل کیا ہے کہ ابو مجلز سے روایت ہے کہ عمرؓ نے عثمان بن حنیف کو بھیجا تو اس نے ریاست میں آنے والے اہل ذمہ تاجروں سے بیس درہم پر ایک درہم وصول کیا اور عمرؓ کو خط لکھ کر اس کی خبر دی تو عمرؓ نے اس کی اجازت دے دی۔ انہوں نے عمرؓ سے کہا کہ آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں ہم دارالحرب کے تاجروں سے کتنا لیں؟ عمرؓ نے فرمایا: جب تم ان کے ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے ہو وہ تم سے کتنا لیتے ہیں؟ جواب دیا کہ دسواں حصہ، عمرؓ نے فرمایا تم بھی اتنا ہی لو۔ ابو عبید نے الاموال میں عبد الرحمن

بن معقل سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حدیر سے سوال کیا کہ تم کن سے دسواں حصہ لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: ''ہم کسی مسلمان یا معاہد (ذمی) سے دسواں حصہ نہیں لیتے تھے'' میں نے کہا پھر کسی سے لیتے تھے؟ انہوں نے کہا ''دارالحرب کے تاجروں سے کیونکہ ہم بھی وہاں جاتے تھے تو وہ ہم سے دسواں حصہ لیتے تھے'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست کے شہریوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے سرحدوں پر جو کسٹم لیا جاتا ہے وہ بھی بیت المال کی آمدن میں سے ہے۔ یہ بات تو تھی ٹیکس کے حوالے سے، جہاں تک عوامی ملکیت کی اشیاء سے حاصل ہونے والی آمدن کا تعلق ہے، تو وہ اس وجہ سے بیت المال کی آمدن ہے کہ خلیفہ ریاست کی رعایا کی دیکھ بھال کے حوالے سے مسلمانوں کا نائب ہے جو چیز عوامی ملکیت کی ہے اس سے ریاست کے تمام شہری فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے نہری پانی، جسے سب پی سکتے ہیں۔ اگر عوامی ملکیت والی چیز ایسی ہے جس کو سب کے لیے کھلا چھوڑنے کی صورت میں بعض حاصل کریں گے اور بعض محروم رہیں گے جیسے کہ لوہا وغیرہ تب طاقتور تو اس کو حاصل کر لے گا لیکن عاجز اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے خلیفہ امت کا نائب ہونے کی بناء پر کسی کان (نمک، کوئلے کی کان وغیرہ) کو ریاستی کنٹرول میں رکھ کر اس کے مواد کو رعایا کے لیے قابل استعمال بنائے گا۔ یہ اموال بیت المال میں رکھے جائیں گے۔ اور خلیفہ ان کی نگرانی کرے گا لیکن خلیفہ اپنی رائے اور اجتہاد سے جہاں چاہے ان کو خرچ نہیں کر سکتا بلکہ ان کو عوامی مفادات پر ہی خرچ کیا جائے گا، خلیفہ صرف یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کو برابری کی بنیاد پر خرچ کرنا ہے یا کہیں کم کہیں زیادہ، یعنی خرچ تو ہر صورت میں عوامی مفادات پر ہی کرنا ہے کیونکہ یہ ریاست کے اموال نہیں بلکہ عوامی ملکیت ہیں۔

وہ اموال جو لاوارث ہیں ان کو بیت المال میں رکھا جائے گا اگر ان کا وارث مل گیا تو اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا ورنہ وہ بیت المال کا مال تصور ہو گا۔

کیونکہ جس مال کا کوئی وارث نہیں اس کا وارث بیت المال ہے۔ جس شخص کا کوئی وارث نہیں ہوتا تھا مسلمان اس کا مال رسول اللہ ﷺ کے پاس لاتے تھے اور آپ ﷺ پوچھتے تھے کہ اس کے نسب میں

کوئی ہے یا کوئی ذی رحم رشتہ دار ہے؟ پھر آپ ﷺ جس کو چاہتے وہ مال دیتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاوارث مال بیت المال کا ہے۔

مرتدوں کا مال مسلمانوں کے لیے فئے ہے اور بیت المال میں اسی مد میں رکھا جائے گا اور فئے اور خراج کے مصارف پر ہی خرچ کیا جائے گا۔ مرتد کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اگر نکاح کے بعد خلوت اختیار کرنے سے قبل میاں بیوی میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے تو فوراً عقد (نکاح) مسخ ہو جائے گا اس لیے وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے اور اگر خلوت اختیار کرنے کے بعد ان میں سے ایک مرتد ہو جائے تو نکاح فسخ ہو جائے گا۔ ان میں سے جو بھی مرے دوسرا اس کا وارث نہیں ہو سکتا کیونکہ ان میں ایک کافر دوسرا مسلمان ہے۔ اسی طرح کسی مرتد کا کوئی مسلمان رشتہ دار مرے تو مرتد اس کا وارث نہیں بن سکتا کیونکہ مرتد کافر ہے اور مورث مسلمان ہے۔ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کا حصہ دوسرے مسلمان وارثوں کو ملے گا لیکن اگر کوئی اور وارث نہیں تو اس کا مال مسلمانوں کے لیے فئے ہے اور بیت المال میں رکھا جائے گا۔ اگر مرتد مرے اور اس کے ماں باپ بہن بھائی ہوں تو وہ اس کے وارث نہیں ہوں گے کیونکہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ اس کا تمام مال مسلمانوں کے لیے فئے ہو گا اور بیت المال میں رکھا جائے گا۔ اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«لا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ، وَلا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ» "مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے"** (متفق علیہ)۔ اور عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«لا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ» "دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے"** اس کو احمد اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اگر کسی مرتد کے تمام وارث بھی اس کے ساتھ مرتد ہو جائیں تو سب کی جان و مال مباح ہو جائیں گے اور ان کا مال مسلمانوں کے لیے مالِ فئے ہے۔ مرتدین آپس میں ایک دوسرے کے وارث بھی نہیں ہو سکتے۔

دفعہ نمبر 152: بیت المال کے نفقات (اخراجات) کو چھ مصارف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا) وہ آٹھ اصناف جو زکوۃ کے اموال کے مستحق ہیں ان پر زکوۃ کی مد سے خرچ کیا جائے گا۔

ب) فقراء، مساکین، مسافر، جہاد فی سبیل اللہ اور قرضداروں پر خرچ کرنے کے لیے اگر زکوۃ کے شعبے میں مال نہ ہو تو بیت المال کی دائمی آمدنی سے ان پر خرچ کیا جائے گا۔ اگر اس میں بھی کوئی مال نہ ہو تو قرضداروں کو تو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ فقراء، مساکین، مسافر اور جہاد کے لیے ٹیکس نافذ کیا جائے گا اگر ٹیکس عائد کرنے سے فساد کا خطرہ ہو تو قرض لے کر بھی ان حاجات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

ج) وہ اشخاص جو ریاست کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں جیسے ملازمین، افواج اور حکمران ان پر بیت المال کی آمدن میں سے خرچ کیا جائیگا۔ اگر بیت المال میں موجود مال اس کام کے لیے کافی نہ ہو تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگایا جائے گا اور اگر فساد کا خوف ہو تو قرض لے کر یہ ضروریات پوری کی جائیں گی۔

د) بنیادی ضروریات اور مفادات عامہ جیسے سڑکیں، مساجد، ہسپتال، سکول وغیرہ پر بیت المال میں سے خرچ کیا جائے گا۔ اگر بیت المال میں اتنا مال نہ ہو تو ٹیکس وصول کر کے ان ضروریات کو پورا کیا جائے گا۔

و) اعلیٰ معیارِ زندگی مہیا کرنے کے لیے بھی بیت المال سے مال خرچ کیا جائے گا اگر بیت المال میں مال کافی نہ ہو تو پھر ان پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا اور ایسے اخراجات کو موخر کیا جائے گا۔

ہ) اتفاقی حادثات یا ہنگامی حالات جیسے زلزلے، طوفان وغیرہ کی صورت میں بھی بیت المال سے مال خرچ کیا جائے گا۔ اگر بیت المال میں مال نہ ہو تو قرض لے کر خرچ کیا جائے گا پھر ٹیکس وصول کر کے وہ قرض ادا کیے جائیں گے۔

شق (ا) کی دلیل زکوۃ (صدقات) والی آیت ہے **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ**

السَّبِيْلِ (التوبۃ:60)**"صدقات صرف فقیروں کے لیے ہیں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے دل جیتا مقصود ہو اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اور راہبر و مسافروں کے لیے"۔**

شق (ب) کی دلیل یہ ہے کہ فقراء، مساکین، مسافر اور جہاد کے لیے مال خرچ کرنا ہر حال میں بیت المال پر فرض ہے۔ خواہ بیت المال میں مال ہو یا نہ ہو کیونکہ ان کاموں پر خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے بیت المال اور مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ اس لیے اگر بیت المال میں مال موجود نہ ہو تو مسلمانوں پر ٹیکس لگا کر ان کے لیے مال حاصل کیا جائے گا۔ جبکہ قرضداروں کے لیے مال خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے صرف بیت المال پر فرض قرار دیا ہے مسلمانوں پر نہیں۔ اس بات کی دلیل کہ یہ بیت المال پر فرض ہے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے **«أَنَا أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ، فَمَنْ تَرَكَ دَيْناً فَعَلَيَّ، وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ»** **"میں ہر مومن کے لیے اس کی اپنی جان سے بھی مقدم ہوں، جو قرض چھوڑ کر مرا تو وہ میرے اوپر ہے اور جو مال چھوڑ کر مر گیا تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے"** اسے مسلم نے جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا بحیثیت ریاست کے سربراہ کے ہے اس لیے یہ بیت المال کی ذمہ داری ہے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا **«فَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ مَاتَ وَتَرَكَ مَالاً فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوا، وَمَنْ تَرَكَ دَيْناً أَوْ ضَيَاعاً فَلْيَأْتِنِي فَأَنَا مَوْلاَهُ»** **"جو مومن مال چھوڑ کر مرا تو وہ اس کے وارثوں کا ہے خواہ اس کے وارث جو بھی ہوں جس پر قرض ہو یا کوئی یتیم چھوڑ کر مرا تو ان کو میرے پاس آنا چاہیے میں ان کا والی ہوں"** (بخاری) قرض کا ذمہ دار صرف بیت المال ہے۔ اگر بیت المال میں مال ہو تو اس مقصد کے لیے خرچ کیا جائے گا اگر مال نہ ہو تو قرضداروں کے لیے ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ کام مسلمانوں پر فرض ہے۔ امام النووی کی شرح الحدیث میں ہے کہ نبی ﷺ اس شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جو قرضدار مر گیا اور آپ ﷺ نے اس کام کے لیے کسی کو اپنا قائم مقام بھی مقرر نہیں کیا۔ آپ ﷺ یہ اس وجہ سے کرتے تھے کہ لوگ کسی کو اپنا جانشین بنانے میں سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔

آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کی نماز جنازہ نہ پڑھ کر ان کو ڈانٹا یا خبر دار کر دیا۔ جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو فرمایا: **«مَنْ تَرَكَ دَيْناً فَعَلَيَّ» "جس پر قرض ہو اور وہ فوت ہو جائے تو قرض کا ذمہ دار میں ہوں"** یعنی اس کا فیصلہ کرنے کا یعنی یہ قرض بیت المال سے ادا کیا جائے گا، اگر بیت المال میں مال موجود ہو۔

شق (ج) کی دلیل وہی ہے جو ابھی گزری کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تعلیم، قضاء اور جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ پھر خلیفہ پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرے، حکمرانوں اور ملازمین کے مسائل کو حل کرے تاکہ وہ بھی بے فکری سے اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں لگ جائیں۔ بیت المال پر واجب ہے کہ وہ ملازمین کو اجرت اور حکمرانوں کو معاوضہ ادا کرے اور یہ اس قاعدے کی رو سے ہے **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب) "جس عمل کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا وہ عمل بھی فرض ہے"**۔ اگر بیت المال میں موجود مال اس مقصد کے لیے ناکافی ہو تو ٹیکس لگا کر یہ اخراجات پورے کیے جائیں گے اور فساد کا خوف ہو تو پھر قرض لے کر یہ اخراجات پورے کیے جائیں گے۔

شق (د) کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ ان کاموں کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے ان کو نہ کرنے کی صورت میں امت کو نقصان اور پریشانی کا سامنا ہو سکتا ہے اس لیے بیت المال اور مسلمانوں دونوں پر واجب ہے کہ ان کی انجام دہی کا بندوبست کریں اگر بیت المال میں مال نہ ہو تو ٹیکس وصول کر کے یہ کام کیے جائیں گے کیونکہ اس ضرر کو دور کرنا مسلمانوں پر واجب ہے اور ضرر کو دور کرنے کے لیے مال دینے کی ضرورت ہے، اس لیے مال دینا ان پر واجب ہے۔

شق (ہ) اس کی دلیل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ مفاد عامہ کی خاطر ان ضروریات کو پورا کرنا بغیر بدل کے ہے کیونکہ اس کا تعلق رعایا کے مفادات کی نگرانی اور دیکھ بھال سے ہے۔ حدیث میں یہ ارشاد ہے **«وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» "خلیفہ اپنے رعایا کا ذمہ دار ہے"** اسے بخاری نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ ان اعمال کو انجام نہ دینے کی صورت میں امت کو ضرر پہنچنے کا خدشہ ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لا ضَرَرَ وَلا ضِرَارَ» "نہ نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ قبول کرنا"** اسے احمد

نے ابن عباسؓ اور لحاکم نے ابو سعید خدریؓ سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ مفاد عامہ کی دیکھ بھال خلیفہ پر فرض ہے اس لیے خلیفہ کو ہر صورت میں ان عوامی کاموں کو کرنا ہے خواہ ان کا تعلق بنیادی ضروریات سے ہو یا اعلیٰ معیار سے۔ مفادِ عامہ کے ان کاموں کا مسلمانوں پر بھی واجب ہونے کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ حدیث ہے کہ "نہ ضرر پہنچانا ہے اور نہ ضرر قبول کرنا ہے" البتہ امت پر اعلیٰ معیار کے کام واجب نہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے کوئی ضرر تو نہیں پہنچتا۔ امت پر صرف وہ کام واجب ہیں جن کے نہ کرنے کی وجہ سے ضرر پہنچتا ہو جبکہ بیت المال پر مفادِ عامہ کے تمام کام واجب ہیں خواہ ان کا تعلق بنیادی ضروریات سے ہو یا اعلیٰ معیار سے، اس لیے اعلیٰ معیار کے حصول کے لیے مسلمانوں پر ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ جیسا کہ سڑکوں کو کشادہ کرنے کے لیے جب کہ اس توسیع کے بغیر گزارہ ہو رہا ہو یا ایسا ہسپتال بنانا جس کے بغیر کام چلتا ہو یا اس جیسے کوئی اور کام۔ ان کاموں کے لیے اگر بیت المال میں مال ہو تو ان پر خرچ کیا جائے گا ورنہ ان کو مؤخر کر کے مال کے آنے کا انتظار کیا جائے گا۔

شق (و) کی دلیل وہی ہے جو مصیبت زدہ کی مدد کرنے کی ہے۔ ابو موسیٰ الاشعریؓ کی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ **«عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ، فَقَالُوا: يَا نَبِيَّ اللهِ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ؟ قَالَ: يَعْمَلُ بِيَدِهِ فَيَنْفَعُ نَفْسَهُ وَيَتَصَدَّقُ، قَالُوا: فَإِنْ لَمْ يَجِدْ؟ قَالَ: يُعِينُ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوفَ، قَالُوا: فَإِنْ لَمْ يَجِدْ؟ قَالَ: فَلْيَعْمَلْ بِالْمَعْرُوفِ وَلْيُمْسِكْ عَنْ الشَّرِّ، فَإِنَّهَا لَهُ صَدَقَةٌ»** **"ہر مسلمان کو صدقہ دینا چاہیے۔ لوگوں نے سوال کیا: اے اللہ کے نبی ﷺ جس کے پاس نہ ہو؟ فرمایا: اپنے ہاتھ سے کام کرے خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے۔ لوگوں نے کہا: اگر ایسا نہیں کر سکا؟ فرمایا: کسی مصیبت زدہ ضرورت مند کی مدد کرے۔ لوگوں نے کہا: اگر ایسا بھی نہ کر سکے؟ فرمایا پھر بھلائی کے کام کرے اور شر سے اپنے آپ کو بچائے یہ بھی اس کی جانب سے صدقہ ہے"۔**

اسی طرح ابن عمرؓ کی یہ متفق علیہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لا يَظْلِمُهُ وَلا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ**

سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اس کو بے یارو مدد گار چھوڑتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جائے اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان سے اسکی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور کرے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکی پردہ پوشی کرے گا"۔

یہ سارے احکامات عام ہیں۔ یہ خلیفہ کے لیے بھی ہیں اور مسلمانوں کے لیے بھی اس لیے اگر بیت المال میں ان ضرورتوں کے لیے کافی مقدار میں مال موجود ہو تو خرچ کیا جائے گا ورنہ مسلمانوں سے ٹیکس وصول کر کے ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی جائے گی کیونکہ یہ سب پر فرض ہے۔

یہ بات کہ فساد کا خوف ہو تو قرض لے کر یہ کام کیے جائیں گے جیسا کہ شق نمبر (ب)، (ج)، اور (و) میں مذکورہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فساد سے مسلمانوں کو ضرر پہنچتا ہے اور ضرر کو دور کرنا واجب ہے جیسا کہ حدیث میں ہے **«لا ضَرَرَ وَلا ضِرَارَ» "نہ ضرر پہنچانا ہے اور نہ خود برداشت کرنا ہے"**، مال کے نہ ہونے سے اور قرض بھی نہ لینے کی صورت میں ضرر کا خطرہ ہے اس لیے فوراً قرض لے کر ضرر کو ختم کیا جائے گا۔ ریاست پر لازم ہے کہ وہ اتنی مقدار میں قرضہ حاصل کرے کہ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو سکے۔ ہاں ان تین حالات کے علاوہ قرض لینا جائز نہیں کیونکہ باقی کام بیت المال میں مال ہونے سے مشروط ہیں۔ مال نہ ہونے کی صورت میں انتظار کیا جائے گا۔ جب تک مال نہ آئے یہ فرائض ساقط رہیں گے جیسے ہی مال آجائے ان پر خرچ کیا جائے گا یا بعض کاموں کے لیے ٹیکس لگایا جائے گا۔ یہ بھی اس صورت میں کہ انتظام ممکن ہو اور ٹیکس کے جمع ہونے تک انتظار کرنے میں کوئی حرج نہ ہو۔ اگر ٹیکس کے لیے انتظار کرنے میں ضرر (نقصان کا خطرہ) ہو تو فوراً قرض لے کر یہ کام کیے جائیں گے۔ ریاست صرف اضطراری حالت میں قرض لے سکتی ہے اس کے علاوہ نہیں۔

دفعہ نمبر153: ریاست اپنے ہر شہری کے لیے روزگار کی ضمانت دے گی۔

اس دفعہ کے دلائل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے، جو کہ عام ہے: **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»** **"خلیفہ نگہبان ہے اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے"** اسے بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے رعایا کی دیکھ بھال یا نگہبانی کے اہم ترین کاموں میں سے یہ ہے کہ ان میں سے کام کے قابل لوگوں کے لیے روزگار مہیا کیا جائے۔ ایسے فقیر کا نفقہ ریاست کی ذمہ داری ہے جس کا کوئی رشتہ دار اس پر مال خرچ کرنے کے قابل نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **«مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ، وَمَنْ تَرَكَ كَلاًّ فَإِلَيْنَا»** **"جو شخص مال چھوڑ کر مرا تو یہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو لاوارث ہے اس کے ہم ذمہ دار ہیں۔"**

ابو ہریرہؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے اور ابو ہریرہؓ کی ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«تَرَكَ مَالاً فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوا، وَمَنْ تَرَكَ دَيْناً أَوْ ضَيَاعاً فَلْيَأْتِنِي فَأَنَا مَوْلاَهُ»** **"جو شخص مال چھوڑ کر مرا تو اس کے رشتہ دار اس مال کے وارث ہیں چاہے کوئی بھی ہوں اور جو شخص قرض یا لاوارث چھوڑ کر مرا تو میں اس کا ذمہ دار ہوں"**۔ جس شخص کا نفقہ ریاست پر واجب ہے اس کا روزگار بھی ریاست پر واجب ہے تاکہ وہ اس سے روزی کمائے۔ ابن ماجہ نے انس بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ **"انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس گھر میں کوئی چیز ہے؟ اس شخص نے کہا! جی ہاں! ایک چٹائی ہے جس کے آدھے کو بچھاتے ہیں اور آدھا اوڑھ کر سوتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔ فرمایا: ان دونوں چیزوں کو میرے پاس لاؤ، وہ شخص دونوں چیزیں لے کر آیا تو آپ ﷺ نے ان چیزوں کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ یہ دو چیزیں کون خریدے گا؟ ایک آدمی نے کہا: میں ایک درہم میں یہ دونوں چیزیں خریدوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ آپ ﷺ نے دو یا تین دفعہ دہرایا تب ایک اور شخص نے کہا کہ میں دو درہم میں ان کو خریدوں گا، آپ ﷺ نے وہ چیزیں اسی شخص کے حوالے کیں اور دو درہم لے لیے اور فرمایا: ان میں اس ایک درہم میں کھانا**

خرید کر گھر والوں کو دو اور دوسرے سے کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ کلہاڑی لی اور اپنے ہاتھ سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹ کر بیچو اور پندرہ دن تک میں تمہیں نہ دیکھوں۔ وہ شخص لکڑیاں کاٹ کر بیچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے اور وہ آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ان درہم سے خوراک اور کپڑا خرید و۔ پھر فرمایا: یہ کام تمہارے لیے اس سے بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن اس حال میں آؤ کہ سوال (بھکاری پن) تمہارے چہرے پر ایک داغ کی شکل میں ہو اور کسی کو سوال کرنا زیب نہیں دیتا، سوائے انتہا درجے کے فقیر یا قرضوں میں ڈوبا ہوا مجبور شخص یا بیماریوں میں گھرے ہوئے شخص کے''۔ اسے ترمذی نے مختصر الفاظ میں نقل کیا ہے اور انس بن مالکؓ کے الفاظ میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ یوں روایت کی ہے کہ **"رسول اللہ ﷺ نے چٹائی اور پیالہ فروخت کے لیے پیش کیا اور فرمایا: کون اس چٹائی اور پیالے کو خریدے گا؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں ایک درہم میں خریدوں گا۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ ایک آدمی نے دو درہم دے کر یہ دونوں چیزیں خرید لیں"** ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات دہرائی کہ کون ایک درہم سے زیادہ دے گا۔ اسی طرح ترمذی کی حدیث میں بھی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ یہ بات دہرائی کہ کون ایک درہم سے زیادہ دے گا یعنی ان دونوں چیزوں کی فروخت بولی کے ذریعے مکمل ہوئی۔

یوں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے براہِ راست یہ کام کرنا ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے اس بات کی دلیل ہے کہ بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ عاجز خواہ فعلاً ہو یا حکماً اس کا نفقہ ریاست پر ہے۔ فعلاً عاجز وہ شخص ہے جو کام کر ہی نہیں سکتا جبکہ حکماً عاجز وہ ہے جو کام تو کر سکتا ہے لیکن اس کو کام نہیں مل رہا۔ اس لیے اس کا نفقہ بھی ریاست پر واجب ہے یوں حکماً عاجز کو کام دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ فعلاً عاجز کو نفقہ دینا۔ یہ بات بھی ہے کہ شرع نے سوال کرنے (گداگری) کو حرام قرار دیا ہے، سوائے حکمران (سلطان) سے مانگنے کے یعنی ریاست سے مانگنا جائز ہے۔ سمرۃ ابن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ إِلا أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ**

سُلْطَانًا أَوْ فِي أَمْرٍ لا بُدَّ مِنْهُ» **"سوال کر کے انسان اپنے چہرے کو بے رونق اور پریشان کر دیتا ہے سوائے اس کے کہ وہ سلطان (شرعی اقتدار کے حامل شخص) سے سوال کرے یا انتہائی مجبوری میں سوال کرے"** اس کو ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور حدیث احمد نے بھی روایت کی ہے جس کو الزین نے صحیح قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سلطان یعنی ریاست سے مانگنا جائز ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نفقہ اور روزگار دینے کی پابند ہے۔

دفعہ نمبر 154: حقوق اور فرائض کے لحاظ سے افراد اور کمپنیوں کے ملازمین ریاستی ملازمین کی طرح ہیں۔ ہر وہ شخص ملازم ہے جو اجرت پر کام کرتا ہے خواہ کام یا کام کرنے والا کوئی بھی ہو۔ جب آجر (ملازم) اور مستاجر (کام کروانے والا) کے درمیان اجرت پر اختلاف ہو جائے تو اجرت مثل کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا۔ اجرت کے علاوہ اگر کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ احکام شرعیہ کے مطابق ملازمت کے معاہدے کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔

اسکے دلائل بھی وہی ہیں جو اجارہ کے دلائل ہیں کیونکہ ملازم بھی آجر ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ** (الطلاق: 6) **"پھر اگر تمہارے کہنے سے وہی عورتیں دودھ پلائیں تو تم انہیں ان کی اجرت دے دو"**۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«قَالَ اللهُ: ثَلاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» إلى أن قال: «وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ»** **"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن تین آدمیوں کا میں حریف (مدمقابل) ہوں... وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے کام تو پورا لے لیکن اس کی اجرت پوری نہ دے۔"** اس کو بخاری نے ابوہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اگر اجرت معلوم نہ ہو تب بھی اجارہ صحیح ہے اور مقدار میں اختلاف کی صورت میں اجرت مثل کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اجارہ کے عقد کے وقت اگر اجرت کا نام نہیں لیا تھا یا آجیر اور مستاجر (ملازم اور مالک) کے درمیان اختلاف ہو جائے کہ اجرت کتنی مقرر کی گئی تھی تب اجرت مثل کو دیکھا

جائے گا۔ اس کو مہر پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ مہر مقرر نہ کرنے یا مہر کے مقدار میں اختلاف کی صورت میں مہر مثل معتبر ہوتا ہے۔ چنانچہ نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے کہ «عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا صَدَاقًا وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا حَتَّى مَاتَ، فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: لَهَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَائِهَا لا وَكْسَ وَلا شَطَطَ، وَعَلَيْهَا العِدَّةُ وَلَهَا المِيرَاثُ، فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الأَشْجَعِيُّ فَقَالَ: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي بِرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ امْرَأَةٍ مِنَّا مِثْلَ الَّذِي قَضَيْتَ، فَفَرِحَ بِهَا ابْنُ مَسْعُودٍ» **"ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے کہ ان سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا اور اس عورت کے ساتھ تنہائی سے قبل وہ شخص فوت ہو گیا۔ تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس عورت کو اس کی دوسری سہیلیوں کے برابر مہر ملے گا اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو گی اور یہ عورت عدت بھی گزارے گی اور اس کو اپنے مرے ہوئے خاوند کی میراث میں بھی حصہ ملے گا۔ یہ سن کر معقل بن سنان الاشجعی اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بروع بنت واشق کے بارے میں بالکل یہی فیصلہ دیا تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعودؓ خوش ہو گئے"**۔ اس میں اس جیسی دوسری عورتوں کے مہر کے برابر سے مراد یہی مہر مثل ہے۔ مہر مقرر نہ کرنے کی صورت میں شارع نے مہر مثل کو واجب قرار دیا۔ بالکل اسی طرح اگر مقرر کیے ہوئے مہر کی مقدار میں اختلاف ہو جائے تب بھی مہر مثل ہو گا۔ مہر ایک عوض (بدلہ) ہے جو نکاح کا عقد ہونے کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے، اس عوض (بدلہ) جو کسی بھی عقد کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے، پر کسی دوسرے عوض کو قیاس کیا جائے گا خواہ یہ عوض کچھ بھی ہو اور کسی بھی چیز کے مقابلے میں ہو، مال ہو جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے یا فائدہ یا محنت ہو جیسا کہ اجارۃ میں ہوتا ہے یا مہر ہو جیسا کہ نکاح کے عقد سے لازم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان تمام میں عوض کا ذکر نہ کرنے یا عوض میں اختلاف کی صورت میں اس کا مثل لازم ہو گا۔ یوں اجارۃ میں اجرتِ مثل، خرید و فروخت میں ثمنِ مثل (قیمت مثل) اور اجیر اور مستاجر کے درمیان اختلاف کی صورت میں اجرت مثل دینا پڑے گی۔ اگر عقد کے وقت اجرت معلوم تھی اور دونوں نے قبول کیا تھا تو وہی لازم ہو گی ورنہ اس کا مثل دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 155: یہ جائز ہے کہ اجرت کام کے فائدے کے مطابق ہو یا کام کرنے والے سے حاصل ہونے والے نفع کے مطابق ہو۔ ملازم کی معلومات یا اس کی علمی اسناد (ڈگریوں) کی بنیاد پر نہ ہو۔ ملازمین کی ترقی نہیں ہو گی بلکہ ان کو وہ اجرت پوری پوری دی جائے گی جس کے وہ مستحق ہیں، خواہ یہ کام کے لحاظ سے ہو یا کام کرنے والے کے لحاظ سے۔

اس کی دلیل اجارہ کی شرعی تعریف ہے کیونکہ شرعی تعریف حکمِ شرعی ہی ہے۔ شرعی تعریف اور شرعی قاعدہ ایک جیسے ہیں کیونکہ دونوں صحیح اجتہاد کے ذریعے شرعی دلیل یا ایک سے زیادہ دلائل سے مستنبط ہیں۔ تعریف بھی اس مسئلے کے لیے دلیل سمجھی جاتی ہے جس پر وہ منطبق (عائد) ہوتی ہے۔ جیسا کہ شرعی حکم اس مسئلے کے لیے دلیل سمجھا جاتا ہے جس پر وہ منطبق ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں شرعی نص اس حکم شرعی کے لیے دلیل ہوتی ہے جو اس مسئلے پر منطبق ہوتی ہو یا اس شرعی تعریف کے لیے دلیل ہوتی ہے جو اس مسئلے پر منطبق ہوتی ہو۔ اجارہ کی شرعی تعریف یہ ہے کہ عوض کے ذریعے فائدہ ہے جیسا سول انجینئر ہے یا اس اجیر کی ذات سے فائدہ اٹھانا، جیسے خادم (نوکر)۔ فائدے کی یہ دو قسمیں ہیں جن کے لیے عقد ہوتا ہے ان دونوں کے علاوہ کسی پر عقد کو مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عقد کو معلومات یا شہادات (ڈگریوں) پر مرتب نہیں کیا جائے گا بلکہ ملازم سے حاصل ہونے والے فائدے پر لاگو کیا جائے گا۔ یعنی یا اس سے شخصی فائدہ لیا جائے گا یا اس کے کام (ہنر) سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اجرت اس فائدے کے مقابلے میں دی جائے گی جس پر عقد ہوا ہے۔ اس لیے جس چیز کو ملازمین کی درجہ بندی (گریڈنگ) کہا جاتا ہے یعنی جس بنیاد پر ان کی اجرت کو مرتب کیا جاتا ہے وہ ڈگریاں یا اس شخص کی معلومات نہیں ہو گی، بلکہ اس شخص کی ذات کے حوالے سے ہو گی اگر وہ خود جسمانی طور پر کام کرتا ہے، جیسا کہ خادم ہے یا یہ درجہ بندی اس شخص کے کام سے حاصل ہونے والی فائدے پر مبنی ہو گی، اگر وہ اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کام کرتا ہو جیسا کہ سول انجینئر ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کی بنیاد پر نہیں ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجرت کی شرعی تعریف پر یہی چیز منطبق ہوتی ہے۔

دفعہ نمبر156: جس شخص کے پاس کسی قسم کا مال نہیں اور نہ ہی اس کے پاس کام ہو اور نہ ہی اسکا ایسا کوئی رشتہ دار ہو جس پر اس شخص کا نفقہ فرض ہے تب ریاست اس شخص کو نفقہ کی ضمانت دے گی۔ اسی طرح ضرورتمند اور بے یارومددگار لوگوں کو ٹھکانا دینا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اس کی دلیل وہی ہے جو دفعہ نمبر 153 کی دلیل میں گزر چکی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا یہ قول کہ **"جو مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے وارثوں کا ہے اور جو لاوارث چھوڑے تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے"**۔ ابو ہریرہؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے اس حدیث میں **"کل"** لاوارث کا لفظ ہے جو ضعیف کمزور، فقیر، عاجز اور معذور سب کے لیے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"جو قرض یا لاوارث چھوڑ کر مرے میں اس کا والی ہوں"**۔ ابو ہریرہؓ کی یہ روایت بھی متفق علیہ ہے۔ اس حدیث میں بھی 'ضیاع' کا لفظ ہے جو ہر قسم کے فقیر، عاجز اور معذور کے لیے ہے۔

دفعہ نمبر157: ریاست ایسی تدابیر اختیار کرے گی جس سے مال رعایا کے درمیان گردش کرتا رہے اور صرف خاص طبقے کے درمیان نہ رہے۔

اسکی دلیل سورۃ الحشر کی یہ آیت ہے: **كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ** ۚ (الحشر: 7) **"تاکہ تمہارے دولت مندوں کے ہاتھ ہی یہ مال گردش کرتا نہ رہ جائے"**۔ اس آیت میں غزوہ بنو نضیر کے مالِ غنیمت کو انصار کو چھوڑ کر صرف مہاجرین کو دینے کی علت (شرعی وجہ) بتائی گئی ہے۔ حالانکہ یہ مال تمام مسلمانوں کا تھا۔ انصار میں سے سوائے دو آدمیوں کے جو کہ فقیر تھے اور کسی کو نہیں دیا گیا۔ یہ ابو دجانہؓ اور سہل بن حنیفؓ تھے۔ اسے بیہقی نے الکبریٰ میں اور ابنِ سعد نے الطبقات میں ذکر کیا ہے۔ علت یوں بیان کی گئی کہ کہیں مال صرف دولتمندوں کے درمیان گردش کرتا نہ رہے۔ یہ شرعی علت ہے جو اپنے معلول کے گرد

وجود اور عدم کے اعتبار سے گھومتی ہے۔ اسی وجہ سے جب بھی معاشرے میں دولت کا یہ فرق نظر آئے تو خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس آیت پر عمل کرتے ہوئے توازن کو برقرار رکھے۔ کیونکہ یہی اسی آیت (میں موجود حکم) کی علت ہے اور اس کے الفاظ بھی عام ہیں اگرچہ سبب خاص ہے اور شرعی قاعدہ ہے کہ **(العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب)** ' لفظ کے عام ہونے کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا نہیں'۔ یوں یہ ہر وقت اور ہر حالت کے لیے ہے۔

دفعہ نمبر 158: ریاست رعایا کے افراد کے لیے اس بات کو آسان اور ممکن بنائے گی کہ وہ اپنی آسائشوں Luxuries کو جہاں تک ممکن ہو پورا کر سکیں اور درجہ ذیل طریقے سے معاشرے میں دولت کا توازن پیدا کریگی۔

الف) بیت المال میں موجود منقول اور غیر منقول اموال اور مال فئے وغیرہ رعایا میں بانٹے گی۔

ب) جن لوگوں کے پاس زمین نہ ہو، ان کو آباد اور غیر آباد زمین دے گی البتہ جن کے پاس زمین ہو اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا رہے ہوں ان کو زمین نہیں دی جائے گی اور ایسے کاشتکاروں کو مالی مدد فراہم کرے گی جن کے پاس کاشتکاری کے لئے مناسب رقم نہ ہو۔

ج) ایسے قرض داروں کا قرض زکوۃ اور مال فئے وغیرہ سے چکائے گی جو اپنا قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہوں۔

شق (الف) کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال کو نبی ﷺ کے صوابدید پر چھوڑا اور یہ اختیار دیا کہ آپ ﷺ جیسا چاہیں اسے خرچ کریں اور رسول اللہ ﷺ نے یہ مال صرف مہاجرین کو عطاء کیا اور انصار میں سے دو آدمیوں کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں دیا۔ بنو نضیر کے اموال، اموالِ فئے تھے اور اموال

فئے جیسے دوسرے اموال کا بھی یہی حکم ہے۔ مثال کے طور پر خراج بھی بیت المال کی دائمی آمدن ہے اور اسکا خرچ کرنا خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر منحصر ہے، سوائے اس مال کے جس کے بارے میں کوئی نص ہو جس میں اس کا مصرف بیان کیا گیا ہو جیسا کہ زکوٰۃ۔ یہ حکم دائمی آمدن کا ہے۔ جہاں تک ٹیکس وغیرہ سے حاصل ہونے والے اموال کا تعلق ہے تو یہ اموال اس انداز سے کسی کو نہیں دیے جاسکتے کیونکہ نص مال فئے کے بارے میں ہے اس لیے اس پر قیاس بھی اسی مال کو کیا جائے گا جو مال فئے کی طرح ہو یعنی دائمی آمدن ہو۔

شق (ب) کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے جب آپ ﷺ نے ایک قطعہ ارض عطاء کیا۔ عمرو بن حریث کی روایت ہے: **«خَطَّ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ دَارًا بِالْمَدِينَةِ بِقَوْسٍ وَقَالَ: أَزِيدُكَ أَزِيدُكَ»** **"رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں میرے لیے ایک کمان سے مکان (مکان کی جگہ یا پلاٹ) لے کر کھینچ کر دیا اور فرمایا: تمہارے لیے زیادہ کروں گا۔"** اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے جسے احمد نے نقل کیا ہے اور الزین صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور دونوں نے علقمہ بن وائل کے واسطے سے ان کے والد سے یہ حدیث روایت کی **«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَقْطَعَهُ أَرْضًا، قَالَ: فَأَرْسَلَ مَعِي مُعَاوِيَةَ أَنْ أَعْطِهَا إِيَّاهُ، أَوْ قَالَ أَعْلِمْهَا إِيَّاهُ»** **"رسول اللہ ﷺ نے انہیں زمین کا ٹکڑا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے میرے ساتھ معاویہؓ کو بھیجا اور کہا کہ وہ ان کو دے دو یا یوں کہا کہ اس کے بارے میں ان کو بتاؤ"** اور **«سَأَلَ تَمِيمُ الدَّارِيُّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ يُقْطِعَهُ عَيْنُونَ، البَلَدِ الَّذِي كَانَ مِنْهُ بِالشَّامِ قَبْلَ فَتْحِهِ، وَهُوَ مَدِينَةُ الْخَلِيلِ، فَأَقْطَعَهُ إِيَّاهَا ﷺ»** **"تمیم الداری نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ عینون انہیں عطا کر دیں جو کہ فتح سے قبل شام کا ایک شہر تھا، اور یہ الخلیل کا شہر ہے، پس رسول اللہ ﷺ نے ان کو دے دیا"۔** اسے ابو عبید نے الاموال میں اور ابو یوسف نے الخراج میں نقل کیا ہے۔ اس کی دلیل عمر بن خطابؓ کا فعل بھی ہے جب آپ نے عراقی کاشتکاروں کو بیت المال سے مال دیا اور کسی صحابی نے مخالفت نہیں کی۔

شق (ج) کی دلیل زکوٰۃ کے اموال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ہے جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا **وَالْغَارِمِيْنَ** (التوبہ: 60) **"اور قرض داروں کے لیے"**۔ اور رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے **«أَنَا أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ، فَمَنْ تَرَكَ دَيْناً فَعَلَيَّ، وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ»** **"میں ہر مومن کے لیے اس کی جان سے بھی مقدم ہوں، جو قرض چھوڑ کر مرا وہ میرے ذمہ ہے اور جو مال چھوڑ کر مرا وہ اسکے وارثوں کا ہے"**۔ اسے مسلم نے جابرؓ سے روایت کیا۔ شرع نے مال فئے کے خرچ کرنے کو خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہے اس مال کو خرچ کرے اور وہ اس کو قرضداروں کے لیے بھی خرچ کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر159: ریاست زرعی معاملات اور زرعی پیداوار کی نگرانی اُس زرعی پالیسی کے مطابق کرے گی جس کی رو سے زمین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے جو کہ اعلیٰ درجہ کی پیداوار کی صورت میں حاصل ہو۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے: **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»** **"امام (یعنی خلیفہ) نگہبان ہے اور اُس سے اُس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہو گی"**۔ اِسے بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ زرعی معاملات کی نگرانی بھی رعایا کی عام نگہبانی میں شامل ہے۔ اس لیے اس کی نگرانی اور دیکھ بھال بھی خلیفہ پر فرض ہے۔ لیکن ریاست براہِ راست زرعی معاملات کو کنٹرول نہیں کرے گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسے مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ کھجور کی زیرگی (pollination) کے جواب میں فرمایا **«أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ»** **"تم اپنے دنیاوی معاملات کو خود بہتر جانتے ہو"**۔ اسے مسلم نے عائشہؓ اور انسؓ نے انہی الفاظ سے روایت کیا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق جو انسؓ سے مروی ہے **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ بِقَوْمٍ يُلَقِّحُونَ، فَقَالَ: لَوْ لَمْ تَفْعَلُوا لَصَلُحَ. قَالَ: فَخَرَجَ شِيصًا، فَمَرَّ بِهِمْ فَقَالَ: مَا لِنَخْلِكُمْ؟ قَالُوا: قُلْتَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ:**

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ» "نبی ﷺ کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوا جو کہ کھجور کے بور کو ملا رہے تھے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: 'اگر تم ایسا نہ کرو تو اچھا ہو گا۔" راوی کہتا ہے کہ پھر درخت پر پھل ہی نہیں آیا۔ آپ ﷺ پھر ان کے پاس سے گزرے اور فرمایا 'تمہارے کھجوروں کے درختوں کو کیا ہوا؟' لوگوں نے کہا آپ ﷺ نے ہی ہمیں ایسا کرنے کا فرمایا تھا، فرمایا: تم اپنے دنیاوی معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہو"۔ ایک اور روایت میں جو احمد نے انسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِذَا كَانَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِ دُنْيَاكُمْ فَأَنْتُمْ أَعْلَمُ بِهِ، فَإِذَا كَانَ مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَإِلَيَّ» "اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہو تو تم خود بہتر سمجھتے ہو اگر کوئی دینی معاملہ ہو تو مجھ سے پوچھو"**۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست براہِ راست زراعت کی نگرانی نہیں کرے گی بلکہ عام انداز سے اس پر نظر رکھے گی اور زراعت کو ترقی دینے کے لیے اور کاشتکاروں کی سہولت کے لیے تمام مباح ذرائع اور وسائل کو بروئے کار لائے گی اور زراعت کو ترقی دینے کی پالیسی بنا کر پیداوار کو اعلیٰ درجے تک پہنچائے گی۔

دفعہ نمبر 160: ریاست صنعت کے شعبے کی تمام معاملات کی نگرانی کرے گی اور عوامی ملکیت سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کی براہ راست نگرانی اور دیکھ بھال کرے گی۔

اس دفعہ کی دو شقیں ہیں:

ایک یہ کہ ہر قسم کی صنعت کی نگرانی، اور دوسری شق بعض صنعتوں کی براہ راست نگرانی۔ پہلی شق کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے افراد کا فیکٹریوں کے مالک بننے کو برقرار رکھا جیسا کہ جوتے بنانے کی صنعت، تلوار بنانے کی صنعت، کپڑے بنانے کی صنعت وغیرہ۔ بخاری نے عبد اللہ ابن عمرؓ سے روایت کیا **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اصْطَنَعَ خَاتَمًا» "رسول اللہ ﷺ نے انگوٹھی بنوائی"** اور بخاری نے سہل بن سعد ساعدی سے روایت کیا **«أَنَّهُ ﷺ اسْتَصْنَعَ المِنْبَرَ» "نبی ﷺ نے منبر تعمیر کروایا"**۔ یہ روایات اس بات

پر دلالت کرتی ہیں کہ کارخانے کے مالک افراد ہوتے ہیں ریاست نہیں۔ یہ بھی زراعت کی طرح ہی ہے۔ چونکہ ریاست کے اوپر معاملات کی دیکھ بھال کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **"امام (خلیفہ) نگہبان ہے اور اُس سے اُس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہو گی"**۔ اس کو بخاری نے عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے۔ اس لیے ریاست پر صنعتی شعبے کی عمومی نگرانی فرض ہے۔ وہ اس شعبے کی ترقی کے لیے تمام مباح اور ممکنہ وسائل بروئے کار لائے گی۔ اس کے لیے مارکیٹ کھولے گی اور خام مال فراہم کرے گی وغیرہ۔

دوسری شق کی دلیل یہ شرعی قائدہ ہے کہ "کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس میں تیار ہونے والے مواد کا ہے"۔ اس قاعدے کو رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے اخذ کیا گیا ہے کہ **«لَعَنَ اللَّهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ» "اللہ تعالیٰ نے شراب، اس کے پینے والے، پلانے والے، اس کو بیچنے والے، خریدنے والے، نچوڑنے والے، جس کے لیے نچوڑی جارہی ہے اس پر، جو اس کو اٹھا کر لے جارہا ہے اس پر اور جس کی طرف اٹھا کر لے جارہا ہے اس پر لعنت کی ہے"**۔ اس کو ابو داؤد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور ابن السکن نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شراب بنانے کے لئے رس نچوڑنے کی صنعت کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ اسی سے شراب تیار ہوتی ہے۔ حالانکہ رس نچوڑنے کی صنعت اصلاً مباح ہے۔ پس کارخانے کا حکم اس کی پیداوار کے لحاظ سے ہے اور یہ ایک عام قاعدہ ہے جو ہر کارخانے اور ہر پیداوار کے لیے ہے۔ یوں وہ کارخانے اور فیکٹریاں جن میں عوامی ملکیت کے مواد تیار ہوتے ہیں وہ بھی عوامی ملکیت کے حکم میں ہیں کیونکہ ان میں تیار ہونے والا مواد عوامی ملکیت ہے اور کارخانے کا وہی حکم ہو گا جو مواد کا ہے۔ اس لیے ایسے کارخانوں اور ملوں یا فیکٹریوں کو خاص فرد یا افراد کے حوالے نہیں کیا جائے گا اور خلیفہ ہی ان کی نگرانی کرے گا۔ یوں ریاست، عوامی ملکیت میں داخل تمام فیکٹریوں کی براہ راست نگرانی کرے گی، جیسا کہ آئل ریفائنری، اسٹیل ملز، سونے کو صاف کرنے کے کارخانے وغیرہ۔ تاہم ریاست ان فیکٹریوں کی آمدن، اخراجات اور تمام

معاملات کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کرے گی اور ان کی آمدن بیت المال کے ایک خاص اکاؤنٹ میں رکھا جائے گا کیونکہ یہ ریاست کی ملکیت نہیں بلکہ عوامی ملکیت ہیں۔

دفعہ نمبر 161: بیرونی تجارت تاجر کی شہریت کے لحاظ سے ہو گی نہ کہ اس مال کو تیار کرنے والے ملک کے حساب سے۔ اس لیے دارالحرب کے تاجروں کو تاجر اور مال کے لیے اجازت نامہ حاصل کیے بغیر تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ جن تاجروں کے ممالک کے ساتھ معاہدات ہوں گے ان کے ساتھ انہی معاہدوں کے مطابق برتاؤ کیا جائے گا۔ ریاست ان تاجروں کو ریاست کے اندر سے ایسا مال لے جانے کی اجازت نہیں دے گی جن کی ریاست میں ضرورت ہو یا جس کے باہر جانے سے دشمن کی عسکری قوت میں اضافے کا خدشہ ہو یا یہ امکان ہو کہ دشمن اس کے ذریعے اپنی صنعت اور اقتصاد کو مضبوط کرے گا۔ تاہم وہ تاجر اپنی ملکیت میں موجود کسی بھی مال کو ریاست کے اندر لا سکتے ہیں۔ اس سے وہ ممالک مستثنیٰ ہیں جو ہمارے ساتھ عملی طور پر حالات جنگ میں ہوں، جیسا کہ اسرائیل۔ ایسے ممالک کے ساتھ تمام تعلقات عملی حالات جنگ کے مطابق ہوں گے۔ خواہ یہ تعلقات تجارتی ہوں یا غیر تجارتی۔

اس دفعہ میں تین امور ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ سامان کا حکم تاجر کی شہریت کے لحاظ سے ہو گا نہ کہ جہاں سامان تیار (مینوفیکچر) ہوتا ہے۔ دوسری بات تاجر کی شہریت کے لحاظ سے ان کے احکامات کا مختلف ہونا ہے۔ تیسری بات وہ حالات کہ جن میں درآمدات اور برآمدات روک دیئے جائیں گے۔

پہلی بات کی دلیل یہ ہے کہ بیرونی تجارت سے متعلق بہت سے شرعی احکامات ہیں، جیسے تجارت کے احکامات، دارالحرب سے مال ریاست میں لانے کے احکامات، دارالاسلام سے مال دارالحرب میں لے جانے کے احکامات اور اس تجارت سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے اس کے احکامات یا اس کے ذریعے دشمن طاقتور ہو سکتا ہے اس کے احکامات۔ چونکہ حکمِ شرعی کی تعریف یہ ہے کہ یہ بندوں کے افعال سے متعلق شارع کا خطاب ہے، اس لیے بیرونی تجارت کا تعلق تاجروں سے ہے نہ کہ اس جگہ سے کہ جہاں مال تیار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیرونی تجارت سے متعلق شرعی احکامات افراد کے بارے میں نازل ہوئے ہیں اور وہ احکامات جو کسی مال سے متعلق بھی نازل ہوئے، ان کا تعلق بھی مال کے اس پہلو سے ہے کہ یہ مال کسی خاص شخص کی ملکیت ہے نہ کہ مال کے محض مال ہونے کی حیثیت سے یعنی حکم اس اعتبار سے ہے کہ یہ مال کسی معین فرد کی ملکیت ہے۔ لہٰذا بیرونی تجارت سے متعلقہ احکامات ان افراد کے متعلق احکامات ہیں جن کے بارے میں شرع کا ایک خاص نقطہ نظر ہے اور یہی حال ان کے اموال کا بھی ہے یعنی ان افراد کے اور ان کے اموال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ایک ہی ہے۔ یوں بیرونی تجارت کے احکامات کا تعلق ان تاجروں سے ہے جو یہ تجارت کرتے ہیں، جہاں مال تیار کرتے ہیں اس جگہ یا علاقے سے نہیں۔

دوسری بات کی دلیل سلیمان بن بریدۃ کی یہ حدیث ہے جو انہوں نے اپنے والد سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جہاد کے لیے فوج کو تیار کر کے رخصت فرماتے تو فوجی کمانڈروں کو یہ نصیحت فرماتے کہ **«... ادْعُهُمْ إِلَى الإِسْلامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوا مِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللَّهِ الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، وَلا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلا أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ»** ”ان کو اسلام کی دعوت دینا اگر وہ مان جائیں تو قبول کر لینا اور ان سے رک جانا۔ پھر ان کو اپنے دار چھوڑ کر دارالمہاجرین میں آنے کی دعوت دینا اور یہ بھی بتانا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کے بھی وہی حقوق

ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور ان کے بھی وہی فرائض ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنا دارنہ چھوڑیں تو ان کو بتانا کہ وہ بھی مسلمان دیہاتیوں کی طرح ہوں گے، اللہ کا حکم ان پر بھی نافذ ہو گا جیسا کہ مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے لیکن مالِ غنیمت اور مال فئے میں اس وقت تک ان کو حصہ نہیں ملے گا جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شامل نہ ہو جائیں۔" اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ **«ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ»** **"ان کو اپنا ملک چھوڑ کر دارالمہاجرین میں آنے کی دعوت دینا اگر ایسا کریں گے تو ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور ان پر بھی ہی فرائض ہوں گے جو مسلمانوں پر ہیں"**، اس نص میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ حقوق اور فرائض میں مسلمانوں کے برابر ہونے کے لیے ان کو دارالاسلام ہجرت کرنی پڑے گی اور تب ریاست ان پر بھی احکامات نافذ کرے گی۔ اگر وہ ہجرت نہیں کریں گے تو ان کے حقوق و فرائض ہمارے جیسے نہیں ہوں گے۔ ان پر وہ احکامات بھی نافذ نہیں کیے جائیں گے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دارالمہاجرین کی طرف ہجرت کرنے کو مال غنیمت اور مال فئے میں حصہ دار بننے کے لیے شرط قرار دیا اور دوسرے تمام اموال کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔ اس لیے جو شخص دارالمہاجرین کی طرف منتقل نہیں ہو گا وہ بھی غیر مسلمانوں کی طرح اس مال سے محروم ہو گا جس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دارالمہاجرین منتقل نہیں ہوا اس پر مالی احکامات لاگو نہیں ہوں گے۔ دارالمہاجرین کے علاوہ ہر دار کو دارالحرب سمجھ کر اس پر چڑھائی کی۔ تاہم جس علاقے کے رہنے والے مسلمان تھے ان سے قتال نہیں کیا گیا اور انہیں قتل نہیں کیا بلکہ ان کو دارالسلام منتقل ہونے کی دعوت دی۔ جو غیر مسلم تھے ان سے قتال کیا جیسا کہ اس حدیث میں ہے اور ایک اور حدیث جو انسؓ سے روایت ہے اس میں بھی یہی ہے: **«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يُغِرْ حَتَّى يُصْبِحَ، فَإِنْ سَمِعَ أَذَانًا أَمْسَكَ، وَإِنْ لَمْ يَسْمَعْ أَذَانًا أَغَارَ بَعْدَ مَا يُصْبِحُ»** **"رسول اللہ ﷺ جب کسی قوم سے جہاد کے لیے جاتے تو صبح ہونے سے پہلے ان پر حملہ نہیں کرتے اور جب اذان کی آواز سنتے تو رک جاتے اگر آذان کی آواز نہیں آتی تو صبح ہونے کے بعد ان پر حملہ**

کر دیتے" اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ دارالمہاجرین یعنی دارالسلام کے علاوہ ہر دار کو دارالحرب سمجھتے تھے خواہ وہاں کے رہنے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ یعنی اس کو دارالکفر سمجھتے تھے۔ اس کا حکم دارالکفر ہی کا ہو گا یعنی دارالکفر کے احکامات ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ انہی احکامات میں سے مالیاتی احکامات بھی ہیں۔ ان احکامات کی تطبیق میں مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے قتال نہیں کیا جائے گا، ان کو قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے اموال پر قبضہ کیا جائے گا۔ جبکہ غیر مسلموں سے قتال کیا جائے گا اور ان کو قتل کیا جائے گا اور انکے اموال پر قبضہ کیا جائے گا اس کے علاوہ تمام احکامات مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے یکساں ہوں گے۔ یہ ہے دارالکفر اور دارالسلام کی دلیل۔ جو شخص دارالکفر یا دارالحرب میں رہتا ہے تو وہ اس کا شہری ہے اور اس پر دارالکفر کے احکامات ہی نافذ کیے جائیں گے۔ وہ شخص چاہے مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان کی جان و مال محفوظ ہو گی۔ اس وجہ سے دارالحرب کا تاجر مسلمان ہو یا غیر مسلم دارالاسلام میں امان لے کر ہی داخل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق دارالحرب سے ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ وَاحِدَةٌ يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ»** **"تمام مسلمانوں کا ذمہ ایک جیسا ہے ان میں سب سے کمزور شخص بھی ذمہ داری لے سکتا ہے"**۔ علیؓ سے مروی یہ روایت متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا **«قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ يَا أُمَّ هَانِئٍ»** **"اے ام ھانی جسے تم نے پناہ دی ہم نے بھی اس کو پناہ دی"** یہ بھی متفق علیہ ہے۔ دارالحرب کا شہری امان حاصل کر کے ہی دارالاسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کا مال بھی اس کے تابع سمجھا جائے گا اور امان میں شامل ہو گا۔ اگر بغیر مال کے خالی دارالاسلام میں آرہا ہو تب بھی خاص امان کی ضرورت ہو گی۔ جن کے ساتھ معاہدہ ہو تو ان کے ساتھ سلوک بھی ان کے معاہدے کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ کیونکہ ارشادِ باری ہے **فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ** (التوبہ: 4) **"تم بھی ان کے معاہدے کی مدت ان کے ساتھ پوری کرو"**۔ معاہدے میں بھی مسلمان اور کافر میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کا تعلق دارالحرب سے ہے اور دونوں کے پاس دارالکفر کی قومیت ہے۔ ان سے تمام معاملات میں دارالحرب کے معاہدوں کی مطابق ہی معاملہ

کیا جائے گا۔ جس شخص کے پاس اسلامی ریاست کی شہریت ہو مسلمان ہو یا ذمی تو اس کو مال باہر لے جانے سے نہیں روکا جائے گا۔ نہ ہی باہر سے مال لانے سے اس کو منع کیا جائے گا اور اس سے کسٹم ڈیوٹی بھی نہیں لی جائے گی۔ درآمد اور برآمد سے اس کو نہ روکنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ** (البقرۃ: 275) **"اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے"** اس سے مراد ہر قسم کی تجارت ہے خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالحرب میں یعنی بیرونی اور اندرونی دونوں قسم کی تجارت اس میں شامل ہے۔ اس عمومی حکم کو خاص کرنے والی کوئی نص نہیں۔ اسی طرح مسلمان یا ذمی کو مال دارالاسلام میں لانے یا مال دارالاسلام سے لے جانے سے منع کرنے والی کوئی نص نہیں ملتی۔ اس لیے ذمی اور مسلمان دونوں اس میں شامل ہیں۔ ایسی بھی کوئی نص نہیں جس میں ذمی کو تجارت سے منع کیا گیا ہو یا صرف مسلمان کو خصوصی طور پر تجارت کی اجازت دی گئی ہو۔ رہی بات کسٹم ڈیوٹی نہ لینے کی تو ابو عبید الاموال میں کہتے ہیں کہ عبد الرحمن بن معقل نے ان کو بتایا کہ انہوں نے زیاد بن حدیر سے پوچھا: تم کن سے عشر (یعنی کسٹم ڈیوٹی) لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہم کسی مسلمان یا جن سے معاہدہ کیا گیا ہو سے عشر (کسٹم ڈیوٹی) نہیں لیتے تھے۔ میں نے کہا: پھر کس سے لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: دارالحرب کے تاجروں سے کیونکہ وہ بھی ہم سے کسٹم لیتے تھے جب ہم ان کے ملک میں داخل ہوتے تھے"۔ العاشر وہ کہلاتا ہے جو دارلحرب سے دارالاسلام میں داخل ہونے والے تاجروں سے عشر (کسٹم ڈیوٹی) لیتا ہے۔ یہ تھیں دارالاسلام، دارالحرب اور حربی کے دارالاسلام میں امان کے ذریعے داخل ہونے کے دلائل، خواہ یہ حربی مسلمان ہو یا کافر۔ اس طرح جن سے معاہدہ ہو تو ان کی معاہدوں کی پاسداری کی جائے گی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تجارت مسلم اور ذمی دونوں کے لیے مباح ہے یہ سب تھیں اس دفعہ کے دوسرے امر کے دلائل۔

تیسری بات کی دلیل یہ شرعی قاعدہ ہے کہ **"اگر کسی مباح چیز کے کسی جزو یا حصے سے ضرر یا نقصان کا امکان ہو تو اس حصے کو روک دیا جائے گا لیکن وہ مباح چیز مباح ہی رہے گی"**۔ یہ قاعدہ تبوک جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے فوج کو قوم ثمود کے کنویں سے پانی پینے سے منع کرنے والے واقعہ سے مستنبط کیا گیا ہے۔ اس لیے ہر وہ سامانِ تجارت جس کو باہر نکالنے سے ریاست کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو جیسے کھانے پینے کی چیز

یں یا ایسا سامانِ تجارت جس کے باہر جانے سے دشمن کے طاقتور ہونے کا اندیشہ ہو جیسا کہ اسلحہ یا اور کوئی اسٹریٹیجک اہم مواد، ایسے تمام سامان کو برآمد کرنے سے روک دیا جائے گا چاہے برآمد کرنے والا مسلمان ہو یا ذمی، حربی ہو یا معاہد (ایسا تاجر جس کے ملک سے معاہدہ کیا گیا ہو)۔ درآمدات کے بارے میں بھی اسی قاعدے کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اگر کسی مباح مواد کو برآمد کرنے سے کسی نقصان کا خطرہ نہ ہو تو مسلمان یا ذمی کسی کو برآمد سے نہیں روکا جائے گا۔ اس حوالے سے معاہد اور حربی کا بھی یہی حکم ہے۔

دفعہ نمبر 162: رعایا کے تمام افراد کو زندگی کے ہر مسئلے سے متعلق علمی تجربہ گاہیں بنانے کا حق حاصل ہے اور ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ لیبارٹریاں قائم کرے۔

تعلیمی لیبارٹریاں بھی اس علم سے باہر نہیں جو انسان حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو مطلقاً مباح قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ** (العلق:1) **"پڑھ، اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا"** پھر فرمایا: **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ** (العلق) **"جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا"**۔ نبی ﷺ نے فرمایا **«مَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ» "اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے"**۔ امیر معاویہ سے مروی یہ روایت متفق علیہ ہے جبکہ امام بخاری تلیقاً جزم کے صیغے میں یہ روایت کرتے ہیں **«وَإِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ» "علم سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے"**۔ الحافظ الفتح میں کہتے ہیں: (وإنما العلم بالتعلم) مرفوع حدیث ہے۔

یہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ علم بحیثیت علم مباح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ **اِقْرَأْ** ہر قسم کے علم کے لیے ہے اور پھر یہ فرمانا کہ **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ** **"جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا"**۔ یہ بھی ہر قسم کے علم کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول کہ «إنما العلم» اسم جنس

ہے جس پر الف لام موجود ہے، اس لیے یہ عام بھی ہے، پس کسی بھی چیز کے بارے میں پڑھنا اور تعلیم حاصل کرنا مباح ہے۔ دلائل کا عام ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ علم مطلق مباح ہے یہی وجہ ہے کہ ریاست کے شہریوں کو یہ حق حاصل کہ وہ کوئی بھی علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے لیے ضروری دلائل اور ذرائع اختیار کر سکتے ہیں تاکہ معارف اور حقائق تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ہر شخص اپنے لیے لیبارٹری قائم کر سکتا ہے یا لیبارٹری وغیرہ بنانے میں دوسرے کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ لیبارٹریاں انفرادی ملکیت میں داخل ہیں عوامی یا ریاستی ملکیت نہیں۔ تاہم ریاست کے لیے یہ جائز ہے کہ انفرادی ملکیت کی ان چیزوں کی معنوی طور پر مالک بن جائے جیسا کہ کوئی بھی شخص مالک ہوتا ہے، اس سے ان لیبارٹریوں کی نوعیت 'ریاستی ملکیت' نہیں ہو جائے گی بلکہ یہ نوعیت کے لحاظ سے انفرادی ملکیت ہی رہیں گی۔ اور ریاست جب بھی کوئی لیبارٹری قائم کرے گی اس کو رعایا کے امور کی دیکھ بھال کا حصہ سمجھ کر کرے گی جو کہ اس پر فرض ہے کیونکہ علم کو پھیلانے اور سیکھانا اس کی ذمہ داری ہے اور تعلیمی تجربہ گاہیں اس علم کا ذریعہ ہیں۔

دفعہ نمبر 163: افراد کو ایسی تجربہ گاہوں کے مالک بننے سے روک دیا جائے گا جو ایسا مواد تیار کریں جن کا افراد کی ملکیت میں ہونا امت یا ریاست کے لیے نقصان یا ضرر کا سبب ہو سکتا ہو۔

اس کی دلیل بھی وہی شرعی قاعدہ ہے کہ کوئی مباح چیز جس کا کوئی ایک حصہ نقصان اور ضرر کا سبب بنتا ہو تو اس جزو اور حصے کو ممنوع قرار دیا جائے گا لیکن وہ مباح چیز مباح ہی رہے گی۔ وہ لیبارٹریاں جن کا افراد کی ملکیت میں ہونے سے نقصان کا خطرہ ہو افراد کو ان کی ملکیت سے روک دیا جائے گا جیسا کہ ایٹمی لیبارٹریاں وغیرہ، کہ اگر یہ افراد کے ہاتھوں میں آجائیں تو نقصان ہو سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 164: ریاست اپنے عام شہریوں کو ہر قسم کی طبی سہولتیں مفت فراہم کرے گی۔ تاہم ڈاکٹروں کو فیس پر بلوانے یا ادویات کی خرید و فروخت پر پابندی نہیں لگائے گی۔

بے شک علاج معالجہ بنیادی ضروریات اور عوامی مفادات میں داخل ہیں اور کوئی شخص اس کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے علاج کرنے کا حکم دیا **«جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَنَتَدَاوَى؟ قَالَ: نَعَمْ، فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يُنْزِلْ دَاءً إِلاَّ أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً، عَلِمَهُ مَنْ عَلِمَهُ وَجَهِلَهُ مَنْ جَهِلَهُ»** **"ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم ادویات کا استعمال کر سکتے ہیں؟ فرمایا: جی ہاں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں فرمائی جس کی شفا پیدا نہیں کی ہو، کچھ لوگ اس کو سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ نہیں"**۔ اس کو احمد نے اسامہ بن شریک کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ معجم الکبیر میں الطبرانی کی یہ روایت بھی اسامہ بن شریک کے حوالے سے نقل کی گئی ہے **«كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَأَتَاهُ نَاسٌ مِنَ الأَعْرَابِ فَسَأَلُوهُ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَنَتَدَاوَى؟ قَالَ: نَعَمْ، إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يُنْزِلْ دَاءً إِلا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً»** **"ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ کچھ دیہاتی آئے اور کہا کیا ہم علاج کر سکتے ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کی شفاء نازل نہیں کی ہو"**۔ اور ترمذی نے بھی اسامہ بن شریک سے ہی یہ نقل کیا ہے اور اس روایت کو حسن صحیح قرار دیا ہے کہ **«قَالَتْ الأَعْرَابُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَلا نَتَدَاوَى؟ قَالَ: نَعَمْ، يَا عِبَادَ اللَّهِ تَدَاوَوْا، فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً، أَوْ قَالَ دَوَاءً إِلا دَاءً وَاحِدًا، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَمَا هُوَ؟ قَالَ: الْهَرَمُ»** **" دیہاتیوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم علاج کر سکتے ہیں؟ فرمایا کر سکتے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی جس کی شفا نہ اتاری ہو، یا یوں فرمایا سوائے ایک بیماری کے ان لوگوں نے کہا کہ وہ کونسی بیماری ہے؟ فرمایا: بڑھاپا"**۔ یعنی بڑھاپے کی وہ کمزوری کہ جس کے بعد موت آتی ہے مطلب ہے کہ موت کی کوئی دوا نہیں۔ یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ علاج مباح ہے۔ علاج کرنے میں فائدے کا حصول اور نقصان سے بچاؤ ہے اور یہ مصلحت (مفادِ عامہ) ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات کہ کلینک، ہسپتال، وغیرہ عوامی

فائدے کی وہ چیزیں ہیں جہاں سے انسان شفایاب ہوتے ہیں اور علاج کراتے ہیں۔ اس لیے میڈیکل بھی عوامی مفاد کے کاموں میں سے ہے اور عوامی مفاد کے تمام کام ریاست کے ذمے میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» "خلیفہ اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا"**۔ بخاری نے اسے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ طبی سہولیات مہیا کرنا بھی رعایا کے بارے میں ذمہ داری کا حصہ ہے۔ اس لیے ریاست پر لازم ہے کہ وہ طبعی سہولیات کی تمام ضروری چیزیں مہیا کرے۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مسلم نے جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ **«بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ طَبِيبًا، فَقَطَعَ مِنْهُ عِرْقًا ثُمَّ كَوَاهُ عَلَيْهِ» "رسول اللہ ﷺ نے ابی کعب کے پاس علاج کے لیے ڈاکٹر بھیجا اور اس ڈاکٹر نے ابی بن کعب کی ایک رگ کاٹی پھر اس کو سی کر دیا"**۔

حاکم نے مستدرک میں زید بن اسلم سے ان کے والد کی روایت نقل کی ہے کہ **"میں عمر بن خطابؓ کے زمانے میں سخت بیمار ہو گیا۔ عمر بن خطابؓ نے میرے لیے ڈاکٹر بلوایا اور اس ڈاکٹر نے مجھے کھانے سے منع کیا حتی کہ میں بھوک کی شدت کی وجہ سے کھجور کی گٹھلی چوسنے لگا"**۔

یہی وجہ ہے کہ علاج معالجے کی سہولت دینا ریاست پر فرض ہے۔ ان چیزوں پر مال خرچ کرنا بیت المال پر واجب ہے کیونکہ اس کا تعلق عوامی مفاد کے کاموں سے ہے۔ رہی بات اجرت دے کر علاج کے لیے ڈاکٹر بلانے کی یہ اس لیے جائز ہے کہ علاج کرنا مباح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«يَا عِبَادَ اللَّهِ تَدَاوَوْا» "اے اللہ کے بندو! علاج کیا کرو"**۔ اجرت دے کر ڈاکٹر بلانا اجارہ میں داخل ہے کیونکہ یہ معاوضہ دے کر فائدہ اٹھانا ہے اور اس کام سے کہیں منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ روایت میں آتا ہے کہ **«احْتَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حَجَمَهُ أَبُو طَيْبَةَ، وَأَعْطَاهُ صَاعَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَكَلَّمَ مَوَالِيَهُ فَخَفَّفُوا عَنْهُ» "رسول اللہ ﷺ نے ابو طیبہ کو بلا کر ان سے سینگی لگوائی (cupping) اور بطور اجرت ان کو دو صاع کھانا بھی دیا (ایک صاع 2176 گرام ہوتا ہے) اور اس شخص کے موالی سے بات کر کے ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کا معاملہ بھی کروایا"**۔ اس کو بخاری نے انسؓ سے نقل کیا ہے۔ اور موالی سے مراد اس کا آقا اور مالک

ہے کیونکہ وہ شخص ایک گروہ کی ملکیت میں تھا۔ اسی طرح مسلم نے بھی انسؓ سے یہی روایت نقل کی ہے۔ اور ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ **«احْتَجَمَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَعْطَى الْحَجَّامَ أُجْرَةً، وَلَوْ كَانَ سُحْتاً لَمْ يُعْطِهِ»** **" نبی ﷺ نے سینگی لگوا (cupping) کر اجرت دی۔ اگر اجرت دینا جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ کبھی بھی ایسا نہ کرتے"**۔ اس کو احمد نے بھی انہی الفاظ سے نقل کیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اس کو مختلف الفاظ سے بھی نقل کیا ہے۔ اس زمانے میں سینگی لگوا کر) (cupping)خون نکال کر) علاج کیا کرتے تھے اور اس قسم کے علاج پر اجرت دینے سے معلوم ہو گیا کہ علاج کروا کر اجرت دینا جائز ہے۔ اور دوائی بیچنا بھی اسی میں داخل ہے اور یہ تجارت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ** (البقرۃ: 275) **"اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے"**، اور کہیں بھی اس کو حرام نہیں کہا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 165: غیر ملکی سرمائے کا استعمال اور ملک کے اندر اس کی سرمایہ کاری کرنا ممنوع ہو گی نہ کسی غیر ملکی شخص کو کوئی امتیازی رعایت دی جائے گی۔

سرمایہ کاری اور استحصال (عربی میں الاستغلال) کے الفاظ مغربی اصطلاحات ہیں۔ یہاں سرمایہ کاری سے مراد اپنے مال کو کسی ایسی جگہ لگانا(invest) جہاں سے سود حاصل ہو رہا ہو۔ استحصال کا مطلب ہے مال کو صنعت، زراعت یا تجارت میں لگانا تاکہ نفع حاصل ہو۔ اس مفہوم کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی ہر شکل ممنوع ہے کیونکہ یہ سود ہے اور سود حرام ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری بھی اس وجہ سے حرام ہے۔ حربی کے ساتھ سودی لین دین کرنا ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ مسلمان یا ذمی کے ساتھ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَحَرَّمَ الرِّبَا** (البقرہ:275)**"اور سود کو حرام کر دیا"**۔ اس عام حکم کی تخصیص کے لیے کہیں بھی کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حدیث **«لاَ رِبًا بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَهْلُ الْحَرْبِ فِي دَارِ الْحَرْبِ»** **"مسلمانوں اور اہل حرب کے درمیان دارالحرب میں کوئی سود نہیں ہوتا"** اس عام کو خاص کرتی

ہے۔ ایسا اس وجہ سے نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ مکحول سے مرسلاً روایت ہے جس کے بارے میں شافعی نے فرمایا کہ یہ ثابت ہی نہیں اور اس کو بطور دلیل اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اور ابنِ مفلح نے بھی کہا کہ یہ ایک مجہول خبر ہے اس وجہ سے اس سے سود کے حلال ہونے یا آیت کی تخصیص کے لئے استدلال نہیں کیا جاسکتا، پس آیت عام ہی رہے گی اور اس کا حکم عام ہی ہو گا۔ اور غیر ملکی سرمایہ کاری بھی ریاست کے شہریوں میں، مسلم ہوں یا ذمی کی طرف سے، سود کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی طرح حرام ہی رہے گی کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ سودی ہی ہے اس لیے یہ حرام ہے۔

غیر ملکی سرمایہ استعمال کرنا اس لیے حرام ہے کیونکہ یہ حرام تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور شرعی قاعدہ ہے کہ حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے اور اس قاعدے کے مطابق کسی چیز کے حرام ہونے کے لیے غالب گمان کافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کاری کیونکر حرام تک پہنچاتی ہے؟ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ یہ غیر ملکی سرمایہ ہی ہے جو اسلامی علاقوں میں کفار کے قدم جمانے اور ان کے اثر نفوذ کو مضبوط کرنے کا سبب رہا ہے اور کفار کو مسلمانوں کے علاقوں میں قدم جمانے کی اجازت یا سہولت دینا حرام ہے۔

مراعات کی اصطلاح بھی ایک مغربی اصطلاح ہے اور اس کے دو معنی ہیں۔ کسی غیر ملکی ریاست کو دوسری ریاستوں سے علیحدہ مقام اور مراعات دینا اس طرح کہ یہ اُس ریاست کی طرف سے اسلامی ریاست کے لئے لازم کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ وہ مراعات جو اسلامی ریاست نے انیسویں صدی کے اس دور میں دی تھیں جب وہ کمزور ہو چکی تھی اور وہ مراعات جو مصر میں انگریز اور فرانس کو حاصل تھیں۔ ایسی مراعات کہ اجنبی ریاست کے شہریوں کے مقدمات کا فیصلہ اُن کے ملک کے قانون کے مطابق ہو نہ کہ اسلامی قانون کے مطابق یا اسلامی ریاست کا اختیار اِن غیر ملکیوں پر نہ ہو۔ ایسی مراعات دینا حرام ہے۔ اور اس کی دو وجوہات ہیں: ایک وجہ یہ کہ اس سے اسلامی ریاست کی حاکمیت ختم ہو جائے گی اور کافر ریاست کو اسلامی ریاست پر غلبہ حاصل ہو گا جو کہ قطعی حرام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ریاست میں موجود غیر مسلموں پر اسلام کو نافذ نہیں کیا جاسکے گا بلکہ کفر کے قوانین کو نافذ کیا جائے گا اور یہ بھی قطعی حرام ہے۔ اس وجہ سے اس قسم کی کوئی بھی

مراعات دینا منع ہے۔ مراعات کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو کسی مباح کام کے لیے پرمٹ دینا اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنا۔ ایسی مراعات دینا بھی حرام ہے خواہ یہ پرمٹ کسی غیر ملکی کو دیا جائے یا اپنے ہی شہری کو، کیونکہ کوئی بھی مباح کام تمام لوگوں کے لیے مباح ہے اور اس کو کسی کے لیے ممنوع قرار دے کر کسی اور کو اجازت دینا گویا مباح کو حرام قرار دینا ہے۔ ہاں ریاست مباح امور کو اس طرح منظم کر سکتی ہے کہ اس سے استفادہ کرنا آسان ہو لیکن اس تنظیم کے ذریعے مباح کام کو کسی کے لیے حرام اور کسی کے لیے حلال نہیں کر سکتی۔ یوں اس قسم کی مراعات بھی حرام ہیں خواہ غیر ملکی کے لئے ہوں یا اپنے شہریوں کے لیے۔ غیر ملکی کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ اس کو مراعات دینا ریاست پر ان کے غلبے کا سبب بنتا ہے۔ جیسا کہ آج کل پٹرول پر مراعات دینے کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔

دفعہ نمبر166: ریاست اپنی ایک خاص کرنسی، آزادانہ طور پر جاری کرے گی اور اس کو کسی غیر ملکی کرنسی سے منسلک کرنا جائز نہیں۔

اس دفعہ کے پہلے حصہ کی دلیل یہ ہے کہ امام (خلیفہ) کو امت کے معاملات کے دیکھ بھال کا حق حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«الإِمَامُ رَاعٍ»** **"خلیفہ نگہبان ہے"**۔ بخاری نے اسے عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ مباح معاملات کو منظّم کرنا لوگوں کی دیکھ بھال میں شامل ہے اور ریاست کے لیے مخصوص کرنسی جاری کرنا مباح میں آتا ہے۔ خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مخصوص کرنسی جاری کرے اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرنا چاہے تو اسے اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں کوئی خاص کرنسی جاری نہیں کی اور اس وقت ریاست کی کوئی کرنسی نہیں تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بعد چاروں خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ریاست بغیر کسی خاص کرنسی کے چلتی رہی حتی کہ بنو امیہ کے ابتدائی دور میں بھی ایسا ہی تھا۔ جب عبدالملک بن مروان خلیفہ بنے تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام سونا، چاندی منقوش ہو یا غیر منقوش اس کو جمع کر کے ایک منقش اسلامی سکہ بنوایا جائے اور اس کا وزن مقرر کیا جائے جس میں کبھی اختلاف نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے

چاندی سے درھم بنوائے اور سونے سے دینار بنوائے۔ اس دن سے اسلامی کرنسی یعنی درھم و دینار متعارف ہوئی۔ اس سے قبل کوئی مخصوص اسلامی کرنسی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یوں مخصوص نقد کرنسی کا اجرا ریاست کے لئے مباح ہے واجب نہیں ہے۔ تاہم اگر کرنسی جاری نہ کرنے کے نتیجے میں ملکی معیشت کو نقصان ہونے کا خدشہ ہو یا دوسری ریاستوں کی جانب سے معاشی یلغار کا خدشہ ہو تو شرعی قاعدے، **"جس کام کے بغیر کوئی فرض ادا نہ ہو تو وہ کام بھی فرض ہوتا ہے"**، کی رو سے کرنسی کا اجرا فرض ہے۔

اس دفعہ کے دوسرے حصہ یعنی کرنسی کو کسی غیر ملکی کرنسی سے منسلک کرنے کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کرنسی کو غیر ملکی کرنسی سے منسلک کرنے سے ریاست اس کافر ریاست کے رحم و کرم پر ہو گی۔ جیسا کہ عراق میں ہوا جب عراقی کرنسی کو اسٹرلنگ (پاؤنڈ) کے ماتحت کیا گیا۔ ایسا کرنے کے نتیجے میں ریاست اقتصادی میدان کے ہر پہلو میں کافر ریاست کے پنجوں میں پھنس جائے گی جو کہ بالکل حرام ہے اور شرعی قاعدہ ہے کہ حرام کی طرف لے جانے والا وسیلہ بھی حرام ہے۔ یوں اسلامی ریاست کی کرنسی کا کسی ملک کی کرنسی سے منسلک ہونا حرام ہے۔

دفعہ نمبر 167: ریاست کی نقدی (کرنسی) سونے اور چاندی کی ہو گی، خواہ اسے کرنسی کی شکل میں ڈھالا گیا ہو یا نہ ڈھالا گیا ہو۔ ریاست کے لیے سونے چاندی کے علاوہ کوئی نقدی جائز نہیں۔ تاہم ریاست کے لئے سونا چاندی کے بدل کے طور پر کوئی اور چیز جاری کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ کہ ریاست کے خزانے میں اتنی مالیت کا سونا چاندی موجود ہو۔ پس ریاست کے لیے پیتل، کانسی یا کاغذی نوٹ وغیرہ اپنے نام کی مہر لگا کر جاری کرنا جائز ہے جبکہ اس کے پاس اس کے مقابل میں سونا چاندی موجود ہو۔

اسلام نے جب تجارت اور اجرت کے لیے احکامات مقرر کر دیے تو سامان، محنت اور منافع کے بدلے کے طور پر کوئی ایسی خاص چیز مقرر نہیں کی جس کے ذریعے مبادلہ (exchange) فرض ہو۔ بلکہ بدل

کو انسان کی صوابدید پر چھوڑ دیا بشرطیکہ دونوں اطراف سے اس مبادلہ کے ذریعے پر اتفاق ہو۔ پس شادی کرنے کے لئے مہر کے طور پر سلائی کا کام سکھانا جائز ہے، یا یہ بھی جائز ہے کہ گاڑی یہ کہہ کر خریدنا کہ میں اس کے بدلے ایک مہینہ تمہاری فیکٹری میں کام کروں گا۔ یا یہ بھی جائز ہے کہ ایک خاص وزن کی چینی کے بدلے کام کرنا۔ یوں شرع نے اس بدل (اجرت یا قیمت کے ذرائع) کو انسان پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو چاہے بدل کے طور پر لے سکتا ہے۔ کیونکہ تجارت اور اجارہ کے دلائل عام ہیں **وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ** (البقرۃ:275) **"اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کر دیا اور سود کو حرام کیا"**۔ کوئی بھی چیز کسی بھی چیز کے بدلے میں دے جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ **«أَعْطُوا الأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ»** **" مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل دے دو"**۔ اسے ابنِ ماجہ نے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کام کرنے والا جب کام ختم کرے گا تب اس کو اجرت دی جائے گی چاہے یہ اجرت کچھ بھی ہو۔ یہ بات بھی ہے کہ یہ تمام چیزیں جن پر بدل چلتا ہے یہ افعال نہیں ہیں جو بنیادی طور پر حکم شرعی سے مقید ہوتے ہیں اور ان کے مباح ہونے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ اشیاء ہیں اور اشیاء بنیادی طور پر مباح ہوتی ہیں جب تک کہ حرمت کی دلیل نہ ہو۔ اور مذکورہ بالا اشیاء کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے ان اشیاء میں تمام شرعی معاملات جیسے تجارت، خرید و فروخت، ہبہ اور مبادلہ وغیرہ سب جائز ہیں، سوائے ان چیزوں کے جن میں تبادل کے حرام ہونے کے لیے نص موجود ہو۔ اس بنیاد پر سامان کے بدلے نقد لینا یا نقد کے بدلے سامان لینا مطلقاً مباح ہیں۔ البتہ نقد کے بدلے نقد لینے کے خاص احکامات موجود ہیں اور یہ معاملہ (نقد کے بدلے نقد) ان احکامات کے مطابق کرنا ہو گا۔ اس طرح محنت کے بدلے نقد لینا یا نقد کے بدلے محنت کرنا مباح ہے سوائے ایسے سامان یا ایسی محنت کے کہ جس کے حرام ہونے کے لیے نص موجود ہو۔ اس اصول کی بنیاد پر ایک خاص مقدار میں نقد کے بدلے سامان لینا یا محنت کے بدلے خاص مقدار میں نقد لینا مطلقاً جائز ہے۔ خواہ یہ نقد کتنا بھی ہو اور کیسا بھی ہو۔ پھر یہ نقد ایسا ہو جس کے مقابلے میں کوئی چیز نہ ہو جیسے کرنسی نوٹ یا یہ نقد ایسا ہو جسکا کوئی مقابل ہو، جیسا کہ سونے اور چاندی کی ایک مخصوص مقدار کے مقابلے میں جاری کیے گئے نوٹ، یا سونے اور چاندی کے قائم مقام

کے طور پر جاری کیے گئے نوٹ، ان تمام میں تبادل صحیح ہے۔ لہٰذا سامان یا محنت کے بدلے کسی بھی قسم کی نقدی لینا جائز ہے۔ مسلمان کے لیے کسی بھی نقدی کے بدلے سامان بیچنا صحیح ہے یا کسی بھی نقدی کے بدلے خریدنا یا اجرت دینا یا اجرت لینا صحیح ہے۔

تاہم ریاست جب اس علاقے کے لیے جس پر اس کی حکومت ہے ایک الگ نقدی اکائی مقرر کرنا چاہے تاکہ مال سے متعلق تمام شرعی احکامات پر عمل کر سکے جیسے زکوٰۃ، لین دین، سود یا پھر فرد سے متعلق احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے کے لیے، یا جیسے دیت یا چوری کی سزا کے لئے مقررہ مقدار کا تعین کرنے کے لیے تو ریاست کو یہ اجازت حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی اکائی کو مقرر کرے بلکہ اس کے پاس ایک ہی اکائی ہے جس کی بنیاد پر وہ کرنسی بنا سکتی ہے یعنی سونے اور چاندی کی بنیاد پر اور کسی بھی حالت میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتی کیونکہ اس اکائی کا تعین شرع نے کر دیا ہے۔ ریاست جب بھی نقدی (کرنسی) کا اجراء کرنا چاہے تو وہ سونے اور چاندی کے سکے ہی بنوا سکتی ہے۔ شرع نے ریاست کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ جس چیز سے چاہے کرنسی بنوائے بلکہ ریاست کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ صرف سونا چاندی کو کرنسی کی بنیاد بنائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلام نے سونے چاندی کو ان دائمی احکامات سے مربوط کیا ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب دیت کو فرض قرار دیا اس کے لئے سونے کی ایک خاص مقدار بھی مقرر کر دی اور اسی طرح جب چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس کم سے کم مقدار کہ جس پر ہاتھ کاٹا جائے کا تعین بھی سونے کے حساب سے کیا۔ آپ ﷺ نے اہلِ یمن کے نام اپنے خط میں فرمایا **«وَأَنَّ فِي النَّفْسِ المُؤْمِنَةِ مِائَةٍ مِنَ الإِبِلِ، وَعَلَى أَهْلِ الْوَرَقِ أَلْفُ دِينَارٍ»** **"مومن کے قتل کی دیت سو اونٹ اور جس کے پاس نقد ہو تو ایک ہزار دینار ہے"**۔ ابنِ قدامہ نے المغنی میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو عمرو بن حزم نے رسول اللہ ﷺ کے خط سے نقل کیا ہے جو اہل یمن کو لکھا گیا۔ نسائی کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کے خط کے حوالے سے یوں بیان ہے کہ **وعلى أهل الذهب ألف دينار "اور جس کے پاس سونا ہو اس پر ایک ہزار دینار ہے"** یعنی (الورق) کی جگہ الذھب کا لفظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لا تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ إِلاَّ فِي رُبْعِ دِينَارٍ**

فَصَاعِدًا» "چور کا ہاتھ دینار کے ایک چوتھائی حصہ یا اس سے زیادہ چوری کرنے پر کاٹا جائے گا" اس کو مسلم نے عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شرع کی جانب سے درھم اور دینار کی یہ تحریر اور اس سے متعلقہ احکامات یہ سب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ نقدی اور کرنسی کی اکائی سونا اور چاندی ہی ہے۔ جن کے اوپر اشیاء اور محنت کی قیمت کو قیاس کیا جائے گا۔ یعنی یہ اکائی ہی وہ واحد اکائی ہے جس پر نقدی کی اساس ہو گی۔ شرع کی جانب سے احکاماتِ شرعیہ کو سونے اور چاندی سے مربوط کرنا اس بات کے لئے نص ہے کہ نقد سے متعلقہ احکامات سونے اور چاندی پر مبنی ہیں اور سونے اور چاندی کے علاوہ کسی چیز کو نقد کی اکائی بنانا جائز نہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نقدی پر زکوٰۃ کو واجب قرار دیا تو اس کو سونے اور چاندی کی صورت میں واجب قرار دیا، کسی اور چیز کی صورت میں نہیں۔ پھر نصاب کی مقدار بھی سونے اور چاندی ہی میں مقرر کر دی۔ نقدی کی زکوۃ کا سونے اور چاندی کی صورت میں مقرر کرنے کا مطلب ہے کہ نقدی سونا یا چاندی ہی ہونی چاہیے۔ پھر یہ بات کہ لین دین کے حوالے سے جتنے بھی احکامات ہیں جن کا تعلق نقدی سے ہے وہ سونے اور چاندی کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ اسلامی مالیات کے تمام احکامات سونے اور چاندی کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ نقدی کا لین دین یہ ہے کہ نقد کو نقد کے بدلے میں لینا یا دینا، یہ لین دین یا تو یوں ہو گا ایک کرنسی دے کر دوسری کرنسی لی جائے یا پھر ایک ہی کرنسی کا آپس میں تبادلہ کیا جائے، اس کو نقدی کا لین دین (Money Exchange) کہتے ہیں۔ اس کے لیے اسلام نے سونے اور چاندی کا تعین کیا ہے یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ نقدی سونے اور چاندی کی ہونی چاہیے کسی اور چیز کی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالْفِضَّةِ وَالْفِضَّةَ بِالذَّهَبِ كَيْفَ شِئْتُمْ» "تم جس طرح چاہو سونے کو چاندی کے بدلے اور چاندی کو سونے کے بدلے بیچو"** اس کو بخاری نے ابو بکرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اسی روایت کو مسلم نے عبادہ بن صامت کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **«الذَّهَبُ بِالْوَرِقِ رِباً إِلاَّ هَاءَ وَهَاءَ»** ترجمہ: **"سونے کو دینار کے بدلے دینا بھی سود ہے مگر جب بالکل برابر ہو"** (یعنی وزن میں برابر ہو تب سود نہیں)۔ عمرؓ سے مروی یہ روایت متفق علیہ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کو نقدی کے طور پر مقرر کیا اور انہی کو نقدی کے لیے ایسا معیار مقرر کیا جس پر اشیاء اور محنت کو قیاس کیا جائے گا۔ اسی کی بنیاد پر معاملات انجام پاتے تھے۔ اس طرح اس نقدی کے لیے اوقیہ، درہم، دانق، قیراط، مثقال اور دینار کی اصطلاحات مقرر کیں۔ یہ تمام اصطلاحات رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہی مشہور و معروف تھیں اور لوگ انہی کی بنیاد پر لین دین کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کو برقرار رکھا۔ تمام تجارتی لین دین اور نکاح وغیرہ بھی سونے اور چاندی کے ذریعے انجام پاتے تھے اور صحیح احادیث میں ان کا ذکر موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے سونے اور چاندی کو نقدی مقرر کرنا اور شرع کی جانب سے کئی احکامات کو ان سے مربوط کرنا خاص کر نقدی کی زکوۃ کو ان میں محصور کرنا اور مالی معاملات کو ان میں محدود کرنا یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اسلام میں نقدی سونا یا چاندی ہے اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ شرع کی جانب سے ریاست کے لیے صرف سونا چاندی کو نقد کی اکائی مقرر کرنے کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ریاست اپنے ماتحت علاقوں میں کسی اور کرنسی میں لین دین یا ان کرنسیوں کے تبادلے کو ممنوع کرے گی اور تمام لین دین صرف اسی کرنسی میں مقید کر دیئے جائیں گے۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جن احکامات میں شرع نے اس نقدی کو مقرر کر دیا اس میں تو یہی کرنسی چلے گی تاہم دوسری کرنسی کے آپس میں تبادلے وغیرہ مباح ہی رہیں گے۔ ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تمام لین دین کو اپنی کرنسی میں مقید کرے کیونکہ ایسا کرنا ایک مباح کام کو حرام کرنا ہے جو جائز نہیں۔ صرف اس صورت میں ریاست دوسری کرنسیوں کے لین دین کو روک سکتی ہے جب اس لین دین سے ریاست کی کرنسی یا اس کی اقتصادیات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، یعنی اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اس لین دین کو ممنوع قرار دیا جائے گا کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے۔ اگر ریاست یہ دیکھ لے کہ کسی خاص کرنسی سے اس کی معیشت کو خطرہ ہے تو اس کرنسی میں لین دین کو روک دے گی کیونکہ شرعی قاعدہ یوں ہے کہ کسی مباح چیز کے کسی جزو سے نقصان کا اندیشہ ہو تو وہ جزو حرام ہو گا لیکن وہ چیز اصلاً مباح ہی رہے گی، یہی

قاعدہ اپنی کرنسی کے بدلے دوسری کرنسی ریاست میں لانے پر بھی لاگو کیا جائے گا جیسا ریاست کے اندر اس تعامل پر لاگو کیا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر168: اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کی کرنسیوں کے مابین تبادلہ جائز ہے جیسا کہ اپنی کرنسی کا آپس میں تبادلہ جائز ہے، اگر کرنسی دو مختلف جنس کی ہوں تو کمی بیشی کے ساتھ بھی تبادلہ جائز ہے بشرطیکہ یہ تبادلہ دست بدست ہو۔ ادھار کی بنیاد پر یہ تبادلہ جائز نہیں۔ جب دونوں کرنسیاں مختلف جنس کی ہوں تو بغیر کسی قید کے شرح تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ ریاست کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی بھی داخلی یا خارجی کرنسی جب چاہے خرید سکتا ہے۔ پھر اس کرنسی کے ذریعے بغیر کسی اجازت کے خرید و فروخت کر سکتا ہے۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے **«وَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالْفِضَّةِ وَالْفِضَّةَ بِالذَّهَبِ كَيْفَ شِئْتُمْ»** **"سونے کو چاندی کے بدلے اور چاندی کو سونے کے بدلے جیسے چاہو بیچ دو"۔** اسے بخاری نے ابو بکرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ مالک بن اوس بن الحدثان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں یہ کہتے ہوئے مجلس میں داخل ہوا کہ کون دراہم کا تبادلہ کرے گا؟ تو طلحہؓ بن عبید اللہ، جو کہ عمر بن خطابؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، نے کہا "اپنا سونا ہمیں دکھاؤ، جب ہمارا خادم آئے پھر ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہاری نقدی (دینار) تمہیں دے دیں گے"۔ تو عمر بن خطابؓ نے فرمایا: "ہرگز نہیں اللہ کی قسم! تم اسی کے دینار اس کو دوگے یا اسی کا سونا اس کو دوگے"۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **«الْوَرِقُ بِالذَّهَبِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ»** **"دینار سونے کے بدلے لینا سود ہے ہاں اگر بالکل برابر ہو (تب سود نہیں ہے)"** اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ البراء بن عازب اور زید بن ارقم دونوں کاروبار میں شریک (Partner) تھے ایک مرتبہ دونوں نے مل کر کچھ نقد اور کچھ ادھار پر چاندی خریدی۔ جب رسول اللہ

ﷺ کو اس کا علم ہوا تو ان دونوں کو یہ حکم دیا کہ **«أَنَّ مَا كَانَ بِنَقْدٍ فَأَجِيزُوهُ، وَمَا كَانَ بِنَسِيئَةٍ فَرُدُّوهُ»** **"جو کچھ نقدی کے بدلے لیا ہے اس کو رکھو اور جتنا قرض پر لیا ہے اس کو واپس کر دو"**۔ اسے احمد نے ابو منہال کے حوالے سے نقل کیا ہے اور بخاری نے بھی سلیمان بن ابی مسلم سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو منہال سے صَرف (یعنی کرنسی کے تبادلے) کے برابر ہونے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اور میرے شراکت دار (Partner) نے برابر اور قرض پر ایک چیز خریدی۔ پھر البراء بن عازب ہمارے پاس آئے تو ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اور میرے شراکت دار زید بن ارقمؓ نے ایسا ہی کیا اور نبی ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا **«أَنَّ مَا كَانَ بِنَقْدٍ فَأَجِيزُوهُ، وَمَا كَانَ نَسِيئَةً فَرُدُّوهُ»** **"جو کچھ تم نے نقد کے بدلے خریدا ہے اس کو رہنے دو اور جو چیز قرض کے بدلے خریدی ہے اس کو واپس کرو"**۔ یعنی وہ دونوں صرافی (Money Exchanger) تھے۔ یہ احادیث کرنسی کے تبادلے کے جواز کی دلیل ہیں۔ یہ کام اندرونی اور بیرونی دونوں معاملات میں ہوتا ہے جیسے سونے کا ملک کے سونے سے اور چاندی کا ملک کی چاندی سے تبادلہ جائز ہے بالکل اسی طرح غیر ملکی کرنسی کا تبادلہ بھی ملکی کرنسی سے ملک سے باہر اور ملک کے اندر جائز ہے، جب دو مختلف کرنسیوں کے درمیان تبادلہ ہوتا ہے تو ان کے درمیان فرق ہوتا ہے اس کو ایکس چینج ریٹ کہا جاتا ہے۔ یہ ایکس چینج ریٹ ہی وہ نسبت ہے جو ملک کی کرنسی میں موجود خالص سونے اور غیر ملکی کرنسی میں موجود خالص سونے کے درمیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نسبت کی تبدیلی سے ایکس چینج ریٹ تبدیل ہوتا رہتا ہے کیونکہ مختلف ملکوں میں سونے کی قیمت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ سونے اور چاندی کے تبادلے کے احکامات موجودہ کرنسی نوٹوں پر بھی لاگو ہوں گے کیونکہ دونوں میں علت (نقدی ہونا یا قیمت ہونا) موجود ہے اور یہ ریاست کی جانب سے نقدی کے طور پر لازم کیا گیا ہے۔ تبادلے کے حوالے سے احادیث تو سونے اور چاندی کے بارے میں ہیں لیکن یہ اسم جنس کے طور پر ہیں اس کا کوئی 'مفہوم' نہیں اور نہ ہی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ڈھالے گئے سونے اور چاندی کے بارے میں بھی احادیث ہیں یعنی درھم اور دینار کے بارے میں اس کے نقدی ہونے کی علت مستنبط ہوتی ہے یعنی اسے بطور

قیمت اور اجرت کے استعمال ہونے پر قیاس کیا جاتا ہے۔ اوپر بیان کی گئی مالک بن اوس کی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ درھم کے صراف (ایکس چینج) کا کام کرتے تھے، کیونکہ درھم کے لفظ کا مفہوم نقدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سونے چاندی کے تبادلے کے جتنے احکامات ہیں یعنی حلال اور حرام ہونے کی حیثیت سے یہ سارے احکامات ریاستوں کی جانب سے جاری کئے گئے موجودہ کرنسیوں پر بھی منطبق ہوتے ہیں یعنی اگر کرنسی ایک ہی جنس کی ہو تو پھر بالکل برابر ہونا شرط ہے اور اگر کرنسی دو مختلف قسموں کی ہوں تو دونوں کے درمیان قیمت کے فرق کو مد نظر رکھ کر برابر ہونا چاہیے یعنی قیمت کے لحاظ سے برابر ہونا چاہیے اگرچہ تعداد میں ایک سے زیادہ ہو۔

دفعہ نمبر 169: بنک کھولنے کی مکمل ممانعت ہو گی اور صرف اسٹیٹ بنک موجود ہو گا۔ کوئی سودی لین دین نہ ہو گا اور اسٹیٹ بنک بیت المال کے محکموں میں سے ایک محکمہ ہو گا اور اسٹیٹ بنک احکام کے مطابق قرضے جاری کرے گا اور مالیاتی اور کرنسی کے معاملات میں سہولیات فراہم کرے گا۔

بنک کے تین بڑے کام ہوتے ہیں جو کہ یہ ہیں:

سودی معاملات جیسا کہ بانڈ اور لاٹری وغیرہ،

ڈرافٹ کے معاملات جیسے چیک وغیرہ

یا امانت کا معاملہ۔

جہاں تک ڈرافٹ اور امانتوں کا معاملہ ہے یہ تو شرعاً جائز ہیں۔ اس کی دلیل بعینہ وہی ہے جو 'حوالہ' کی دلیل ہے یا امانتوں کی دلائل ہیں۔ اس لیے مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ ایسا بنک کھولے جس میں وہ صرف منی ٹرانسفر کرے یا امانتیں (منی آرڈر، پارسل وغیرہ) پہنچائے یا ان جیسے دوسرے جائز معاملات انجام دے جیسے منی ایکس چینج وغیرہ۔ اس صورت میں بنک کھولنا حرام نہیں ہو گا۔ حرام صرف وہ بنک ہے جس میں سودی لین دین ہوتا ہے۔ لیکن مذکورہ کام یا معاملات میں اتنا منافع نہیں جس سے بنک چلایا جا سکے۔ یہ کام تو صرافوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ہوتا ہے۔ اس آمدن کے ذریعے بنک کھولنا ممکن نہیں کیونکہ منی ٹرانسفر یا پارسل یا

منی ایکس چینج کا منافع سودی منافع کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، بڑا منافع وہاں ہے جن سودی معاملات کے لیے سرمایہ کاری کی جاتی ہے اس سودی سرمایہ کاری سے ہی بڑے منافع حاصل ہوتے ہیں، اس وجہ سے صرف حوالہ یا منی ایکس چینج یہ امانتوں کو پہنچانے کے ذریعے آج کل کے بنکوں کی طرح بنک کھولنا ممکن نہیں بلکہ ان کاموں کے لیے صرافوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کافی ہیں اور صرف ان کاموں کو انجام دینے کو آج کل کے مروجہ بنکوں سے مماثلت نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے آج کل کے ان بنکوں کو کھولنے کے لیے سودی لین دین کرنا پڑتا ہے اور سود قرآن کی نص سے قطعی حرام ہے جیسا کہ ارشاد ہے **"اور سود کو حرام کر دیا"**(البقرۃ: 275)۔ اس لیے مروجہ بنک کھولنا حرام ہے۔

تاہم قرض دینا مباح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِماً قَرْضاً مَرَّتَيْنِ إِلاَّ كَانَ كَصَدَقَتِهَا مَرَّةً» "کسی مسلمان کی جانب سے دوسرے مسلمان کو دو بار قرض دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کو صدقہ دینا"**۔ اس کو ابنِ ماجہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ اور انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«رَأَيْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عَلَى بَابِ الْجَنَّةِ مَكْتُوباً: الصَّدَقَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، وَالْقَرْضُ بِثَمَانِيَةَ عَشَرَ، فَقُلْتُ: يَا جِبْرِيلُ، مَا بَالُ الْقَرْضِ أَفْضَلُ مِنْ الصَّدَقَةِ؟ قَالَ: لأَنَّ السَّائِلَ يَسْأَلُ وَعِنْدَهُ، وَالْمُسْتَقْرِضُ لا يَسْتَقْرِضُ إِلاَّ مِنْ حَاجَةٍ» "جس رات مجھے آسمانوں پر لے جایا گیا اس رات میں نے جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا: صدقہ کا بدلہ دس گنا ہے اور قرض کا بدلہ اٹھارہ گنا، میں نے جبریل سے کہا کہ اے جبریل، یہ کیسی بات ہے کہ قرض صدقہ سے افضل ہے؟ جبریل نے فرمایا: سوال کرنے والے کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے جبکہ بندہ قرض انتہائی مجبوری کے علاوہ نہیں لیتا"**۔ اسے ابنِ ماجہ نے نقل کیا ہے۔

چونکہ امانتوں کو لوگوں تک پہنچانا بھی مباح ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا** (النساء: 58) **" اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ"**۔ اور فرمایا **فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ**

(البقرۃ: 283) **"ہاں اگر آپس میں ایک دوسرے سے مطمئن ہو تو جسے امانت دی گئی ہے وہ اسے ادا کرے"۔** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أَدِّ الأَمَانَةَ إِلَى مَنْ ائْتَمَنَكَ، وَلا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ»** **"جس نے تمہارے پاس امانت رکھی اس کو اس کی امانت واپس کرو اور جس نے تمہارے ساتھ خیانت کی تم اس کے ساتھ خیانت مت کرو"**۔ اس کو ترمذی نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ نبی ﷺ کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ **«أَنَّهُ كَانَتْ عِنْدَهُ وَدَائِعُ، فَلَمَّا أَرَادَ الهِجْرَةَ أَوْدَعَهَا عِنْدَ أُمِّ أَيْمَنَ، وَأَمَرَ عَلِيّاً أَنْ يَرُدَّهَا عَلَى أَهْلِهَا»** **"آپ کے پاس امانتیں تھیں جب آپ نے ہجرت کا ارادہ کیا ان کو اُمِ ایمن کے حوالے کیا اور علیؓ کو حکم دیا کہ ان کو مالکوں تک پہنچاؤ"** اس کو ابنِ قدامہ نے المغنی میں نقل کیا ہے۔

حوالہ کا عمل رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے مباح ہے کہ **«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ»** **" مالدار کی جانب سے ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور جو سامان پہنچانے کی ذمہ داری لے لے تو اس کو پہنچانا چاہیے"** اس کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے لفظ **(مَلِيٍّ)** کا استعمال کیا ہے اور مسند احمد میں ہے کہ **«وَمَنْ أُحِيلَ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَحْتَلْ»** **" جو ذمہ داری قبول کرے تو اس کو وفا بھی کرے"۔**

یہ تین کام بنک کرتے ہیں اور یہ تینوں جائز ہیں۔ حرام صرف سودی قرضے جاری کرنا، سودی قرضے لینا اور دینا ہے۔ سودی قرضے کے بغیر بنک کھولنا اور اس کو چلانا ممکن نہیں اس لیے یہ تینوں کام بغیر کسی سود کے کئے جائیں گے اور قرضے بھی بغیر سود کے جاری کیے جائیں گے۔ اس وجہ سے ریاست پر لازم ہے کہ وہ بیت المال کے شاخ کے طور پر ایسا بنک کھولے جو خلیفہ کی رائے اور اجتہاد کے مطابق یہ تینوں کام کرے کیونکہ یہ تینوں وہ مباح کام ہیں جن کا تعلق رعایا کی دیکھ بھال سے متعلق ہے اور ان کو خلیفہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق انجام دے گا۔ یوں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست لوگوں کے مفادات کے لیے بنک کھولے گی۔

تعلیمی پالیسی

دفعہ نمبر170: تعلیمی نصاب کا اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر استوار ہونا فرض ہے، چنانچہ تمام تدریسی مواد اور تدریسی طریقے کو اس طرح وضع کیا جائے گا کہ اس بنیاد سے روگردانی نہ ہو۔

لغت میں کہا جاتا ہے کہ آدمی نے علم حاصل کیا یعنی اس کو حقیقت معلوم ہو گئی، کسی چیز کا علم حاصل کرنا اس کو پہچاننا ہے۔ القاموس المحیط (ڈکشنری) میں لکھا ہے **(علمه كسمعه علماً بالكسر عرفه، وعلم هو في نفسه، ورجل عالم وعليم جمعه علماء وعلام) علمه** کا مطلب ہے کسی چیز کی معرفت حاصل کرنا، یہی فی نفسہ علم ہے، اور آدمی کو عالم اور علیم کہا جاتا ہے جس کی جمع علماء اور علامی۔ علم کے لفظ کا اصل لغوی معنی یہی ہے۔ جب بھی علم کا لفظ بولا جائے یا اس لفظ سے نکلنے والے کوئی بھی الفاظ بولے جائیں ان سب کا یہی لغوی معنی مراد ہو گا سوائے اس کے کہ کوئی قرینہ ایسا موجود ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہاں یہ لغوی معنی مراد نہیں ہے بلکہ اصطلاحی معنی مراد ہے۔ جب طریقہ تعلیم کا ذکر ہو گا تب بھی یہی لغوی معنی مراد لیا جائے گا یعنی مکمل معرفت۔ طریقہ تعلیم اس بنیاد سے عبارت ہے جس پر وہ تمام معلومات مبنی ہوتی ہیں جن کی تعلیم مقصود ہو اور ان موضوعات سے عبارت ہے جن کے اندر یہ معلومات ہیں اور اس کیفیت سے عبارت ہے جس کے مطابق یہ معلومات دوسروں تک منتقل کی جاتی ہیں۔ یوں اس میں دو معاملات ہوئے۔ پہلا معاملہ: درسی مواد، اور دوسرا معاملہ: طریقہ تدریس۔ چونکہ اسلامی عقیدہ ہی مسلمان کی زندگی کی اساس ہے، یہی اسلامی ریاست کی اساس ہے اور یہی مسلمانوں کے درمیان تعلقات اور معاشرے کی اساس ہے، چنانچہ مسلمان جس چیز کی معرفت (علم) حاصل کرنا چاہے اس کی بنیاد بھی اسلامی عقیدہ ہی ہو گا، خواہ اس معلومات کا تعلق اس کی زندگی سے ہو یا دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات سے یا پھر ریاست کے سیاسی احوال سے یا اس زندگی کے کسی بھی پہلو سے ہو یا اس زندگی سے پہلے یا اس کے بعد کی صورت حال سے ہو۔ رسول اللہ ﷺ پہلے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے یعنی اسلامی عقیدے کو اپنانے کی تاکہ وہ اسلام قبول کر

لیں۔ جب وہ اسلام قبول کر لیتے تب ان کو اسلام کے احکامات کی تعلیم دیتے۔ یوں رسول اللہ ﷺ کے مسلمانوں کو تعلیم دینے کی بنیاد اسلامی عقیدہ ہی تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے بیٹے، ابراہیم کے وفات کے دن سورج گرہن ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کی وفات کی وجہ سے سورج گرہن ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، لا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلا لِحَيَاتِهِ»** **"بے شک سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ یہ کسی کی موت یا زندگی سے گرہن نہیں ہوتے"** متفق علیہ۔ یوں رسول اللہ ﷺ نے چاند گرہن اور سورج گرہن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسلامی عقیدے کو بنیاد بنایا۔ بخاری نے ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: **«خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ بَنِي الْمُصْطَلِقِ، فَأَصَبْنَا سَبْيًا مِنْ سَبْيِ الْعَرَبِ، فَاشْتَهَيْنَا النِّسَاءَ، فَاشْتَدَّتْ عَلَيْنَا الْعُزْبَةُ وَأَحْبَبْنَا الْعَزْلَ، فَسَأَلْنَا رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: مَا عَلَيْكُمْ أَنْ لاَ تَفْعَلُوا، مَا مِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلاَّ وَهِيَ كَائِنَةٌ»** **"غزوہ بنی المصطلق میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے، پھر ہمیں عرب قیدیوں میں سے کچھ قیدی عورتیں ملیں، ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور اپنے گھروں سے دور ہونے کی وجہ سے یہ خواہش شدید تھی، ہم نے عزل (جماع کے بعد منی باہر خارج کرنے) کا ارادہ کیا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا ایسا کر سکتے ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں، قیامت تک جس انسان کو دنیا میں آنا ہے وہ تو بہر صورت آئے گا"**۔ دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ کیا عزل کر سکتے ہیں تو فرمایا: **«مَا عَلَيْكُمْ أَنْ لاَ تَفْعَلُوا، فَإِنَّ اللهَ قَدْ كَتَبَ مَنْ هُوَ خَالِقٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»** **"کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ لکھا ہوا ہے کہ قیامت تک جس نے پیدا ہونا ہے"**۔ مسلم نے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے عزل کے بارے میں ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم کچھ بھی کرو جس بچے کو پیدا ہونا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔ عزل کو وہ مانع حمل سمجھتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے جواب کی بنیاد کو اللہ تعالیٰ کے علم پر ایمان رکھنے سے مربوط کیا یعنی اسلامی عقیدے کو اس جواب کی بنیاد بنایا۔ کئی اور احادیث ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی

عقیدے کو طریقہ تعلیم کے لیے بنیاد بنانا ریاست پر فرض ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ اسلامی عقیدے کو طریقہ تعلیم کی بنیاد بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام کا تمام علم صرف اسلامی عقیدے سے ہی اخذ کیا جائے۔ شرع کو یہ مطلوب نہیں اور یہ حقائق کے بھی منافی ہے۔ اسلامی عقیدے سے تمام کا تمام علم نہیں نکلتا کیونکہ اسلامی عقیدہ تو عقائد اور احکامات کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے اس کا تعلق ویسا نہیں۔ اسلامی عقیدہ کو تعلیمی طریقہ کی بنیاد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ عقائد اور احکامات سے متعلق تمام علوم اسلامی عقیدے سے نکلنے چاہیں کیونکہ یہ اسلامی عقیدے سے ہی نکلتے ہیں۔ عقائد اور احکامات کے علوم کے علاوہ باقی علوم کے لیے اسلامی عقیدے کو بنیاد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام علوم اسلامی عقیدہ پر مبنی ہوں یعنی اسلامی عقیدہ ہی ان کے لیے معیار اور پیمانہ ہو۔ جو چیز اسلامی عقیدہ کے خلاف ہو اس کو اختیار نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کا اعتقاد رکھا جائے اور جو چیز اس عقیدے کے خلاف نہ ہو اس کو لینا جائز ہو گا۔ یعنی یہ اسلامی عقیدہ ہی کسی چیز کو اختیار کرنے یا کسی چیز پر اعتقاد لانے کے لیے معیار ہے۔ لیکن صرف معرفت اور تعلیم کی خاطر کسی بھی چیز کو پڑھنے میں کوئی ممانعت نہیں۔ کیونکہ وہ دلائل جو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں عام ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ **«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ»** **"علم حاصل کرنا فرض ہے"** زرکشی نے التذکرۃ میں کہا ہے کہ حافظ جمال الدین مزی نے کہا ہے کہ یہ حدیث اتنے طریقوں سے روایت کی گئی کہ یہ حسن کے مرتبے کو پہنچ گئی۔ اس میں لفظ "علم" عام ہے ہر فائدہ مند علم اس میں داخل ہے۔ ابو داؤد، احمد اور ابن حبان اور بیہقی نے شعب میں کثیر بن قیس سے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے **«مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ»** **"جو شخص علم طلب کرنے کے راستے میں نکلے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلائے گا"** اس میں بھی لفظ "علم" عام ہے جو ہر نافع علم کو شامل ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ان افکار اور عقائد کو ذکر کیا گیا ہے جو اسلام سے متصادم ہیں جیسے **وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ** **"اور ہمیں تو زمانہ ہی مارتا ہے"** (جاثیۃ:24)۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مثالیں ہیں جو

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام سے متناقض افکار کو پڑھنا یا ان کے بارے میں جاننا جائز ہے لیکن ان کو اختیار کرنا یا ان پر اعتقاد رکھنا ممنوع اور حرام ہے مثال کے طور پر ڈارون کا نظریہ کہ انسان بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **كه اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ** (ال عمران: 59) **"اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال ہو بہو آدمؑ کی مثال ہے جسے مٹی سے بنا کر کہہ دیا کہ ہو جا! پس وہ ہو گیا"**۔ اسی طرح اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کا نظریہ مادی ترقی جس کی رو سے کہتے ہیں کہ مادہ خود بخود ترقی کرتا ہے اور کوئی اور ذات ایسی نہیں ہے جو اس مادے کو ترقی دیتی ہو اس لیے کوئی الہ (معبود) نہیں۔ حالانکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (النساء:136) **"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ"** یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے وجود پر ایمان لاؤ، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ فرمایا: **اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا** (الفرقان: 59) **"اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو پیدا کیا"**۔ زمانہ جاہلیت کے ادب کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کا قصہ جھوٹا ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ قصہ گو لوگوں کا گھڑا ہوا ہے، حالانکہ ابراھیمؑ کا قصہ قرآن میں مذکور ہے اور بطور ایک حقیقی واقعہ کے بیان کیا گیا ہے جس کا انکار قرآن کو جھٹلانا ہے۔ اس قسم کی معلومات نصاب تعلیم میں شامل نہیں کی جائیں گی کیونکہ ان سے اعتقادات کے گمراہ ہونے کا خدشہ ہے، خاص طور پر ابتدائی تعلیم میں تو خاص طور پر ایسا نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچپن میں ان کو پڑھنے کا مطلب ان کو اختیار کرنا ہی ہو گا۔ اگر اس قسم کی معلومات نصاب میں شامل بھی کی گئیں تو اس کا مقصد ان کی گمراہی کو واضح کرنا ہو گا تاکہ کوئی بطور اعتقاد کے ان کو نہ اپنائے۔

یوں اسلام عقیدے کو طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی بنیاد بنایا جائے گا۔ معارف کو قبول کرنے ان کی تصدیق کرنے اور ان پر اعتقاد رکھنے کے حوالے سے اسلامی عقیدہ ہی وہ پیمانہ ہو گا جس پر منہج تعلیم کی بنیاد ہو گی۔

دفعہ نمبر 171: تعلیمی پالیسی کا مقصد اسلامی عقلیہ اور اسلامی نفسیہ کی تعمیر ہے، اسی حکمت عملی کی بنیاد پر تمام تدریسی مواد وضع کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 172: تعلیم کا مقصد اسلامی شخصیت پیدا کرنا اور لوگوں کو زندگی کے معاملات سے متعلق علوم و معارف سے لیس کرنا ہے۔ چنانچہ طریقہ تعلیم کو اس طرح بنایا جائے گا کہ جس سے یہ مقصد حاصل ہو اور ہر وہ طریقہ ممنوع ہو گا جو اس مقصد سے ہٹاتا ہو۔

ان دونوں دفعات کی رو سے تعلیمی پالیسی سے مراد وہ قاعدہ یا قواعد ہیں جن کی بنیاد پر تعلیم فراہم کی جائے گی۔ تعلیم سے مقصود وہ ہدف ہے جس کے لیے معلومات دی جاتی ہیں۔ تعلیمی پالیسی وہ بنیاد ہے جس پر تعلیم مبنی ہوتی ہے جبکہ تعلیم کا مقصد وہ ہے جس کے لیے یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیمی پالیسی کا تعلق درسی مواد (curriculum) سے ہے اور تعلیم کا مقصد طریقہ تدریس سے تعلق رکھتا ہے۔ حقیقت میں انسان اشیاء اور افعال کا ادراک کر کے ان پر حکم لگاتا ہے اور ان اشیاء اور افعال کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان دونوں (یعنی اشیاء اور افعال پر حکم لگانے اور ان کی طرف مائل ہونے) سے باہر نہیں نکلتا۔ علم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ یا تو عقل (سمجھ بوجھ) کو بڑھا کر اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ افعال اور اشیاء پر حکم لگائے یا پھر یہ علم انہی اشیاء اور افعال کے بارے میں ہوتا ہے تاکہ (عقل) ان سے فائدہ اٹھائے۔ علم بھی ان دونوں حالتوں سے باہر نہیں ہوتا۔ اسلام نے اسلامی عقیدے کو مسلمان کی زندگی کے لیے بنیاد قرار دیا یوں اس عقیدے کو اس کے افکار کی اساس بنایا اور اس عقیدے کو اس کے میلانات (رجحانات) کے لیے بھی بنیاد قرار دیا۔ جو قرانی آیات اور احادیث، فکر کی دعوت و ترغیب دیتی ہیں وہ فکر کے ذریعے اللہ پر ایمان لانے کی ترغیب دیتی ہیں جیسا کہ یہ آیت ہے کہ **وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ** (آل عمران: 191) ترجمہ: **"اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں"** اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ **«تَفَكُّرْ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ»** **"تھوڑی دیر غور و فکر کرنا ایک سال عبادت کرنے سے بہتر ہے"** القرطبی فی التفسیر۔ اور وہ آیات و احادیث جن میں انسان کے میلانات اور رجحانات کا ذکر ہے۔ ان میلانات اور رجحانات کو اسلامی

عقیدے میں مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے جیسے اس آیت میں کہ **قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ** **"(اے رسول ﷺ) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس میں کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جنہیں تم پسند کرتے ہو، اگر یہ تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"** (التوبہ:24)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ **«لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ»** **"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ اس کے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں"** انسؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ ان تمام آیات اور احادیث میں مسلمان کے میلانات کو اسلامی عقیدے میں مقید دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ افعال اور اشیاء پر اسلامی عقیدے کی بنیاد پر حکم لگائے۔ اسی طرح افعال اور اشیاء کے لیے اس کے میلانات اسلامی عقیدے پر مبنی ہوں۔ چونکہ علم ہی اشیاء پر حکم لگانے کے لیے عقائد کی تعمیر کرتا ہے اور علم ہی اشیاء کی طرف میلان کے لیے نفسیہ کی تعمیر کرتا ہے چنانچہ اس علم کا اسلامی عقیدے پر مبنی ہونا انتہائی ضروری ہے۔ خواہ یہ علم عقل کی نشوونما کے لیے ہو یا افعال اور اشیاء سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہو۔ یعنی وہ علم جو مسلمان کی عقلیہ کو تعمیر کرتا ہے اور وہ علم جو اس کی نفسیہ کو تعمیر کرتا ہے لامحالہ اسلامی عقیدے پر مبنی ہونا چاہیے۔ یوں تعلیمی پالیسی کی بنیاد لازماً اسلامی عقلیہ اور اسلامی نفسیہ کی تعمیر کے لیے ہونی چاہیے۔ علم کی حقیقت کو بحیثیت معرفت دیکھنے کے بعد اور فکر و میلانات سے متعلق قرآنی آیات کے مجموعے کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد اور ان کو معرفت کی حقیقت سے جوڑنے کے بعد تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی ہے اور اسی دلیل کی بنیاد پر دفعہ نمبر 171 کو وضع کیا گیا ہے۔ جہاں تک دفعہ نمبر 172 کا تعلق ہے تو یہ دفعہ مسلمانوں کو تعلیم دینے

کے لیے رسول اللہ ﷺ کے فعل سے اخذ کی گئی ہے، چاہے ہجرت سے قبل مکہ میں ہو یا ہجرت کے بعد مدینہ میں۔ نبی ﷺ ہمیشہ تعلیم کے ذریعے اسلامی عقلیہ، یعنی اشیاء اور افعال پر حکم لگانے، اور اسلامی نفسیہ یعنی اشیاء اور افعال کے بارے میں ان کے میلانات کو تعمیر کرتے تاکہ اسلامی شخصیت کی تعمیر کی جائے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے احکامات کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ ان کو اعلیٰ اقدار بھی سیکھاتے تھے جیسے ہمیشہ اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھنا، عزت کے ساتھ رہنا، لوگوں کے درمیان ہدایت کو پھیلانے کے لیے اپنی ذمہ داری پوری کرنا، موثر اور نتیجہ خیز انداز سے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا وغیرہ جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: **اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ** (النحل125) **"اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے"** آپ ﷺ ان کو قرآن یاد کرواتے تھے، اسلام کے احکامات بتاتے تھے، اوامر کی اتباع اور نواہی سے اجتناب کے حوالے سے ان کی خبر لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ان کی معیشت کے لیے ان کو وہ چیزیں سیکھنے کو مباح قرار دیا جو ان کی تجارت، زراعت اور صنعت میں کام آئیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فعل سے اسلامی شخصیت کی تعمیر ہوئی اور وہ شخصیت زندگی کی تمام ضروریات سے متعلق علوم سے لیس ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فعل ہی اس دفعہ کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 173: تعداد اور وقت کے لحاظ سے دوسرے علوم کی طرح اسلامی اور عربی علوم کے بھی لازمی ہفتہ وار پیریڈ مخصوص ہونے چاہیں۔

تدریسی مواد کی دو ہی قسمیں ہیں: پہلی قسم میں ایسے علمی علوم شامل ہیں جن سے عقل کی نشوونما ہو تاکہ انسان ان کے ذریعے اقوال، افعال اور اشیاء پر اِن کے حقائق اور خواص کی حیثیت سے حکم لگائے یا انسانی فطرت کے ساتھ ان کے تعلق کے حوالے سے حکم لگائے جیسے کیمسٹری، فزکس، فلکیات، ریاضیات جیسے تجرباتی علوم۔ یہ وہ علوم ہیں جن کا شخصیت کی تعمیر کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ دوسری قسم میں وہ شرعی علوم

شامل ہیں جن کے ذریعے اقوال، افعال اور اشیاء پر شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے یعنی کہ ان کا واجب، مندوب، مباح، مکروہ یا حرام ہونے کا بیان۔ اسی طرح ان کے سبب، شرط، مانع، رخصت، عزیمت، صحیح، باطل اور فاسد ہونے کے حکم شرعی کا بیان۔ یہی چیز اسلامی عقلیہ کو تعمیر کرتی ہے۔ جب یہ شرعی احکامات مسلمان کی جانب سے شرعی موقف اختیار کرنے کے ساتھ یکجا ہو جائیں یعنی اقوال، افعال اور اشیاء میں سے کس کی طرف میلان ہونا اور کن سے اعراض ہونا چاہیے یا کس کو اختیار کرنا ہے اور کس کو ترک کرنا ہے تاکہ اپنی جبلتوں اور عضویاتی حاجات کو پورا کرتے وقت اس کی نفسیہ اسلامی ہو۔ یوں اسلامی نفسیہ اور اسلامی عقلیہ سے اسلامی شخصیت وجود میں آتی ہے جو اسلامی عقیدے کو ہی اپنی فکر اور میلانات کی بنیاد بناتی ہے۔ اسلام نے مسلمان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ کائنات، انسان اور حیات کی تخلیق پر غور و فکر کرے جیسا کہ اس آیت میں ہے **وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ** (آل عمران: 191) ترجمہ: **"اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں"** یا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ** (الغاشیۃ: 17) ترجمہ: **"کیا یہ اونٹ کو نہیں دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے ہیں"** اسی طرح یہ آیت **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** (البقرۃ: 73) ترجمہ: **"اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کر کے تمہیں تمہاری عقل مندی کے لیے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے"** اسلام مسلمان سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ افعال و اشیاء پر حکم لگانے اور اپنے میلانات و رجحانات میں شرعی احکامات کی پابندی کرے اور اپنے افعال کو ان احکامات کے عین مطابق انجام دے۔ ارشاد باری ہے **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** (النساء:65) ترجمہ: **"سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ تمام آپس کے اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں"** یہ ارشاد بھی ہے: **وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** (الحشر: 7) ترجمہ: **"اور تمہیں رسول جو کچھ دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ"** اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ**

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا آبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ

(التوبۃ: 23)"اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان سے زیادہ کفر کو عزیز رکھیں" اور فرمایا

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (التوبۃ: 105) ترجمہ: "کہہ دیجیے کہ تم عمل کیے جاؤ تمہارے عمل اللہ خود دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی (دیکھ لیں گے) اور تم کو ضرور اس کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلائے گا"

جس طرح سکول کا مقصد اصول فقہہ، لغت اور تفسیر کے علوم میں ممتاز اسلامی شخصیت پیدا کرنے کے لیے پہلی آغوش بننا ہے بالکل اسی طرح سکول کے لئے ایٹمی علوم، اسپیس ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کے علوم میں بھی ایک امتیازی اسلامی شخصیت بنانے کے لیے پہلی تربیت گاہ بننا بھی ضروری ہے۔ جس اسلامی امت نے سیاست، حکمرانی اور جہاد کے میدان میں ابو بکرؓ، خالد بن ولیدؓ اور صلاح الدین جیسی قد آور شخصیات پیدا کیں اسی امت نے علم کے میدان میں شافعی، بخاری، الخوارزمی اور ابن الہیثم جیسے عظیم شہسوار بھی دنیا کو دئے۔ سکول کے مراحل میں ان علوم و معارف کو پڑھانے کا مقصد طالب علم کی ایسی اسلامی شخصیت کو پروان چڑھانا ہے کہ وہ زندگی میں علمی معرکے کا شہسوار ہونے کے لیے تیار ہو یعنی ممتاز شخصیت بننے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہو تا کہ اسلامی امت علمی اور فکری لحاظ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکے اور دنیا کی قیادت سنبھالنے کی اہل ہو جائے، تمام انسانوں کو کفر کی ظلمتوں سے اسلام کے نور کی طرف لائے اور خود ساختہ قوانین کے ظلم سے نکال کر انسانوں کو شریعت اسلامی کے عدل کے سائے میں لائے اور ساتھ ساتھ زمین و فضل کو انسانوں کی فلاح و بہبود اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تسخیر کرے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو عملی جامہ پہنائے کہ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: 77) "اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ اور اپنے دنیاوی حصے کو بھی نہ بھول"

اس بنیاد پر درسی پیریڈز کو علمی معارف اور شرعی معارف دونوں پر مشتمل ہونا چاہیئے اور پیریڈز کی تقسیم ہر صورت ان دونوں قسم کے علوم کے مقاصد کے مطابق ہونا چاہیئے تاکہ مسلمان اس زمین کو جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے اس طرح آباد کرنے کے قابل ہو جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ خوش ہوں۔ علمی معارف سے ہماری مراد وہ علوم اور ہنر ہیں جن کا براہ راست زندگی کے بارے میں نقطہ نظر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ اسلامی عقیدے سے پھوٹتے ہیں۔ ابتدائی طور پر طالب علموں کو ان علوم و معارف میں سے وہ چیزیں سیکھائی جائیں گی جو اپنے اردگرد اور ماحول سے تعلق کے حوالے سے ان کے لیے لازم ہیں جیسے حساب اور ان تمام اوزار اور آلات کی پہچان جن کو وہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں جیسے الیکٹرک اور الیکٹرونک آلات یا گھریلو اشیاء۔ اس کے علاوہ ان کو ٹریفک کے اصول اور قوانین وغیرہ سیکھائے جائیں گے۔ ان چیزوں کی تعلیم دیتے وقت ان کے رہن سہن اور ماحول کا لحاظ رکھا جائے گا خواہ وہ صنعتی ہو، زرعی ہو یا تجارتی ہو حتیٰ کے یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ پہاڑی علاقوں کے ہیں، میدانی علاقوں کے یا پھر ان کا تعلق ساحلی علاقوں سے ہے یا یہ کہ ان کے علاقے کا موسم گرم ہے یا سرد۔ اس قسم کے مواد کی تعلیم دینے کا مقصد دس سال کی عمر تک طالب علموں کو اپنے آس پاس کی اشیاء اور ماحول سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ اپنی عمر اور اپنی ضرورت کے مطابق ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دس سال کی عمر کے بعد بتدریج ان کو ہر قسم کی ریاضیات اور دوسرے علوم جیسے فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی اور مفید جسمانی ورزش جیسے تیرنا، چھلانگ لگانا یا نشانہ بازی وغیرہ کی تعلیم دی جائے گی۔ بالغ ہونے کے بعد فوج کی نگرانی میں عسکری تربیت کو بھی ان کے کورس میں شامل کیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ درجے کے انسٹی ٹیوٹ اور یونیورسٹیوں میں انسانیت کے لیے مفید علوم بقدر ضرورت حاصل کریں گے۔

دفعہ نمبر 174: تعلیم میں تجرباتی علوم یا ان سے ملحقہ علوم جیسے ریاضی اور ثقافتی علوم کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ تجرباتی اور اس سے ملحقہ علوم حسب ضرورت پڑھائے جائیں گے۔ تعلیمی مراحل

میں سے کسی بھی مرحلے میں ان کو لازمی قرار نہیں دیا جائے گا۔ جبکہ ثقافتی علوم کو ابتدائی مرحلے میں رکھا جائے گا، یعنی اعلیٰ تعلیم سے پہلے اور اس میں ایک خاصل حکمت عملی کی پیروی کی جائے گی جو اسلامی افکار و احکام کے مخالف نہ ہو۔ اعلیٰ مرحلے میں ان معارف و علوم کو اس شرط کے ساتھ پڑھایا جائے گا کہ کسی بھی طرح تعلیمی پالیسی اور اس کے مقصد سے دوری نہ ہو۔

اس کی دلیل وہ عام دلائل ہیں جن میں علم حاصل کرنے کو مباح قرار دیا گیا ہے۔ جن سے مراد ہر علم ہے۔ مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ ہر قسم کا علم سیکھے، ہاں ایسے علوم کا پڑھنا حرام ہے جن سے عقائد کے خراب ہونے اور عقائد میں کمزوری کا خطرہ ہو۔ اگر ان کے اثر انداز ہونے کا خطرہ نہ ہو تو پھر جائز ہے کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ **" مباح چیز کا جو حصہ کسی حرام تک پہنچاتا ہو تو وہ حصہ حرام ہو گا باقی چیز مباح ہی رہے گی"** اس وجہ سے علوم کے مباح ہونے کے عام دلائل اور یہ شرعی قائدہ اس دفعہ کی دلیل ہے۔ ان چیزوں کی تعلیم جن سے عقائد خراب ہوتے ہیں یا عقائد کمزور ہوتے ہیں وہ بچوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ان چیزوں کی تعلیم ابتدائی دو مرحلوں میں ممنوع ہو گی۔ یعنی ابتدائی اور ثانوی مرحلے میں۔ تاہم اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں ان علوم جیسے فلسفہ وغیرہ کی تعلیم جائز ہے لیکن وہ بھی ان علوم کے تضادات اور باطل ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے، کیونکہ قرآن کریم میں بھی دوسری اقوام کے افکار و عقائد کا ذکر ہے لیکن ان کی کجی اور باطل ہونے کو بیان کیا گیا ہے اور ان کو جواب بھی دیا گیا ہے۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم میں جب یہ علوم شامل کیے جائیں گے تو ان کی خرابی اور گمراہی کو بیان کر کے ان کا جواب دیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 175: تعلیم کے تمام مراحل میں اسلامی ثقافت کی تعلیم لازمی ہو گی۔ اعلیٰ تعلیمی مرحلے میں جیسے میڈیکل، انجینئرنگ اور طبیعات میں اسپیشلائزیشن ہوتی ہے بالکل اسی طرح مختلف اسلامی علوم میں بھی اسپشلائزیشن ہو گی۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے۔ آپ مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں سب کو اسلام کے احکامات سیکھاتے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہر نسل اور ہر عمر کے لیے ہے اس لیے تمام تعلیمی مراحل میں اسلام کی تعلیم دی جائے گی۔ اسلام کے احکامات کے علاوہ جو دوسرے علوم ہیں جیسے صنعتی علوم، یہ سب جائز ہیں تاہم ان کی حقیقت یہ ہے کہ ان علوم سے قبل کچھ ضروری چیزوں کو سیکھنا لازمی ہے۔ اور اس کے بعد ہی ان علوم اور صنعتوں میں داخلہ لیا جاتا ہے جیسا کہ میڈیکل ہے یا انجینئرنگ ہے۔ اس وجہ سے ان علوم کو شروع کرنے سے قبل کچھ معارف کی تعلیم ضروری ہے اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیمی مرحلے میں ان علوم کو سیکھا جاتا ہے۔ اس حقیقت اور رسول اللہ ﷺ کے فعل کو سامنے رکھ کر یہ دفعہ وضع کی گئی ہے۔

دفعہ نمبر176: فنون اور صنعت ایک لحاظ سے سائنس ہیں جیسے تجارتی فنون، فن جہاز رانی یا فنون زراعت۔ اس قسم (سائنسی نوعیت) کے فنون کو بغیر کسی قید و شرط کے اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے پہلو سے یہ فنون جب زندگی کے بارے میں نقطہ نظر سے متاثر ہوتے ہیں تو ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں جیسے تصویر سازی اور آرٹس (پینٹنگ)۔ اس صورت میں اگر یہ اسلام کے نقطہ نظر سے مخالفت رکھتے ہوں تو ان علوم کو ہرگز حاصل نہیں کیا جائے گا۔

اس کی دلیل وہی ہے جو دفعہ نمبر162 کی دلیل ہے یعنی علم کے بارے میں دلائل کا عام ہونا اور یہ شرعی قاعدہ کہ مباح چیز کے جس حصے سے ضرر کا خطرہ ہو وہ ممنوع ہو گا، کیونکہ فنون اور صنعتیں مباح ہیں اور یہ عام دلائل کے ماتحت آتے ہیں تو اگر ان میں سے کسی چیز میں ضرر ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے گا یعنی کسی خاص نظریے سے متاثر ہونے کی وجہ سے اس کو اپنانے میں نقصان کا اندیشہ ہو۔ یہ اس وقت ہے کہ ان چیزوں کی حرمت کے بارے میں کوئی نص نہ ہو۔ اگر کسی چیز کے بارے میں حرام ہونے کی دلیل موجود ہو تو اس کو کسی

بھی حالت میں اختیار نہیں کیا جائے گا جیسا کہ جاندار چیزوں کے مجسمے یا انسان، حیوان اور پرندوں کی پینٹنگ (مصوری) کرنا۔ ایسی مصوری اور مجسمہ سازی احادیث کی رو سے حرام ہے۔

دفعہ نمبر 177: ریاست میں منہج تعلیم (نصاب اور طریقہ تدریس) ایک ہی ہو گا۔ ریاست کے منہج کے علاوہ کسی دوسرے منہج کی اجازت نہیں ہو گی۔ پرائیویٹ اسکول کی اجازت صرف اس صورت میں ہو گی جب تک وہ ریاستی منہج پر کاربند رہے، تعلیمی پالیسی کی بنیاد (یعنی عقیدہ) پر رکھے، تعلیم کے مقصد اور حکمت عملی کو ملحوظ خاطر رکھے اور ان میں طلباء اور اساتذہ دونوں کے لحاظ سے مرد و زن کا اختلاط نہ ہو اور ان مدارس کا تعلق کسی خاص گروہ، دین، مذہب یا رنگ و نسل سے نہ ہو۔

تمام رعایا کو ایک ہی نصاب تعلیم (سلیبس) کا پابند بنانا مباح ہے، کیونکہ یہ ان مباح کاموں میں سے ہے جن میں امام (خلیفہ) کو لوگوں کو ایک خاص اسلوب کا پابند کرنے کی اجازت دی گئی ہے، عثمان بن عفانؓ نے یہی کیا اور قرآن کے ایک ہی نسخے کی کاپیاں ریاست کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیں۔ تمام علوم جائز ہیں اور ہر طریقہ تعلیم مباح ہے کیونکہ یہ سب معارف ہیں۔ لیکن ان معارف کو پڑھانے کے لئے ان کو ایک خاص متعین پروگرام میں منظم کرتے ہوئے ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم کو منظم کرنے کا اسلوب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ریاست کے کسی محکمے کو منظم کرنے کا اسلوب۔ امام کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب اختیار کر کے لوگوں کو اس کا پابند بنائے کیونکہ اس کا تعلق بھی عوام کی دیکھ بھال اور نگہبانی سے ہے اور اس معاملے میں خلیفہ کی اطاعت فرض ہے۔

ریاست کی جانب سے اپنے وضع کردہ نصاب تعلیم کے علاوہ کسی نصاب کی اجازت نہ دینا اس وجہ سے ہے کہ خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق ایک خاص اسلوب اختیار کرے اور جب خلیفہ ایک معین اسلوب اختیار کرے گا اس کی اطاعت فرض ہے اور اس کی مخالفت حرام ہے۔ کیونکہ

خلیفہ کی اطاعت کا حکم قرآن میں مذکور ہے۔ ارشاد ہے: **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ** (النساء:59) ترجمہ: **"فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ کی اور تم میں سے (شرعی) اقتدار والوں کی"** ۔ اسی طرح یہ اطاعت احادیث میں بھی مذکور ہے جیسا کہ یہ حدیث **«اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَإِنْ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيبَةٌ»** **"سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر ایک ایسے حبشی غلام کو امیر مقرر کیا جائے جس کا سر کشمکش کی طرح ہو"**۔ اس کو بخاری نے انسؓ سے نقل کیا ہے، امیر المومنین یا خلیفہ کی اطاعت ان معاملات میں لازم ہے جن میں اس کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق کام کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کیونکہ اس حال میں اس کی اطاعت ہی اولوالامر کی اطاعت ہے جس کا مذکورہ آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شرعی احکامات جیسے مندوبات، مباحات، واجبات یا محرمات میں اس (خلیفہ) کی اطاعت دراصل اس کی نہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر حکمران کسی گناہ کا حکم دے تو اس کی اطاعت حرام ہے، نافع نے عبد اللہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ **«السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَةَ»** **"مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا اپنے پسند اور ناپسند میں اس وقت تک لازم ہے جب تک اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ جب اس کو گناہ کا حکم دیا گیا تو اس پر سننا اور اطاعت کرنا لازم نہیں"** اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ احمد نے بھی صحیح اسناد کے ساتھ عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ **«لا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى»** **'اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں"** چنانچہ معاملات کی دیکھ بھال میں اس کا حق ان امور میں ہے جو اس کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہیں، اس کی اطاعت کے حکم کی پابندی بھی انہی امور میں ہے، لہذا اگر وہ مباح امور کی تدبیر کسی مخصوص طریقے سے کرے جیسا کہ کوئی خاص پروگرام وضع کرے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دے اور اس کی خلاف ورزی سے منع کرے تو اس میں اس کی اطاعت فرض ہے۔

یہ تو تعلیمی (درسی) نصاب کے ایک ہونے کے حوالے سے ہے جہاں تک پرائیویٹ اسکولوں کے مباح ہونے کی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے معلمین بھیجتے تھے۔ لوگوں کو بھی ایک دوسرے کو تعلیم دینے کی اجازت دیتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ جس کو چاہے اجرت لے کر یا بغیر اجرت کے تعلیم دے، اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنا سکول کھولے، لیکن وہ بھی رعایا کے تمام افراد کی طرح ریاست کے منہج (نصاب تعلیم) کا پابند ہے، یعنی اس منہج کا جس کا خلیفہ حکم دے، اس کی دلیل وہی ہے جو اوپر گزری ہے کہ مباح امور میں امام (خلیفہ) کی اطاعت واجب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ پھر اہل ذمہ کس طرح اپنی اولاد کو اپنے دین کی تعلیم دیں گے کیونکہ پرائیویٹ سکول بھی اسلامی ریاست کی تعلیمی منہج کے پابند ہوں گے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو اپنے گھروں اور اپنی عبادت گاہوں میں عبادت اور اپنے دین کی تعلیم سے نہیں روکا جائے گا، یعنی مدارس کی طرح عام زندگی کے علاوہ، ریاست کی تعلیمی پالیسی اس طریقے پر گامزن ہو گی، رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی اہل ذمہ اپنے موجود کلیسوں اور کنیسوں میں اپنی عبادات سیکھتے تھے، بخاری نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ **«بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ إِذْ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: انْطَلِقُوا إِلَى يَهُودَ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ حَتَّى جِئْنَا بَيْتَ الْمِدْرَاسِ، فَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ فَنَادَاهُمْ: يَا مَعْشَرَ يَهُودَ، أَسْلِمُوا تَسْلَمُوا...» "ایک مرتبہ ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ (حجرے سے) نکل آئے اور فرمایا: چلو یہودیوں کی طرف چلتے ہیں، ہم آپ کے ساتھ نکل پڑے یہاں تک ہم ان کے عبادت خانے میں پہنچے پھر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے یہودیو! اسلام لاؤ سلامتی پاؤ گے"** اس حدیث میں "المدراس" کا لفظ ہے جس کا مطلب یہودیوں کا عبادت خانہ ہے جہاں بیٹھ کہ وہ تورات پڑھتے تھے، وہاں جمع ہوتے تھے اور اپنے تہواروں میں عبادت کرتے تھے، جیسا کہ "القاموس المحیط" میں مذکور ہے کہ "المدراس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے اور مدراس الیہود سے نکلا ہے"، یعنی وہ جگہ جہاں بیٹھ کر یہودی تورات پڑھتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ "فُهر الیهود، پیش

کے ساتھ، یہودیوں کے پڑھنے کی وہ جگہ جہاں یہودی اپنے تہواروں میں جمع ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غیر مسلموں کو ان کے عبادت خانوں میں اپنے مذہب کا علم حاصل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ یہی سلسلہ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں بھی جاری رہا، چنانچہ عبدالرزاق نے اپنے تصنیف میں علی بن ابی طالبؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک گروہ کو قطار کی شکل میں دیکھا تو فرمایا: "لگتا ہے یہ یہودی ہیں جو اپنے **"فھر"** سے نکل رہے ہیں" ہم نے عبدالرزاق سے کہا کہ " فُھر" کیا چیز ہے انہوں نے کہا کہ ان کا عبادت خانہ، یعنی علیؓ نے جن لوگوں کو قطار میں دیکھا انہیں یہودیوں سے تشبیہ دی جو عبادت کرنے کے بعد اپنے عبادت خانے سے نکلتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اہل ذمہ اپنے دین اور اپنے تہواروں کے بارے میں اپنے عبادت خانوں اور کلیسا میں تعلیم حاصل کرتے ہیں یا ان سے ملحق کسی مکان میں۔ رائج الوقت معنی کے اعتبار سے ان کے لیے مخصوص اسکول نہیں تھے۔

ریاستی تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ممنوع ہے اور اسی طرح پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی ہر قسم کا اختلاط ممنوع ہے اور اس بات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

بخاری نے ابو سعید خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ **«قَالَتْ النِّسَاءُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَفْسِكَ، فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيهِ، فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ، فَكَانَ فِيمَا قَالَ لَهُنَّ: مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ ثَلاثَةً مِنْ وَلَدِهَا إِلا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِنْ النَّارِ، فَقَالَتْ امْرَأَةٌ: وَاثْنَتَيْنِ؟ فَقَالَ: وَاثْنَتَيْنِ»** **"خواتین نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ سے علم حاصل کرنے میں مرد ہم سے آگے نکل گئے آپ ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک دن مقرر کیجیے۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے ایک دن مخصوص کیا اور اس دن ان کو وعظ نصیحت کی اور ان کو کچھ احکامات سکھائے۔ ان سے فرمایا کہ جس عورت کے تین بچے اس سے پہلے مر جائیں تو وہ بچے اس کے اور جہنم کی آگ کے درمیان پردہ (رکاوٹ) ہوں گے، یہ سن کر ایک عورت بول اٹھی کہ جس کے دو بچے مریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے دو بھی مریں"** یعنی عورتوں کی تعلیم مردوں سے الگ ہوتی تھی

مخلوط نہیں، حتیٰ کہ نماز میں بھی عورتوں کی الگ صفیں ہوتی تھیں، نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلتے ہوئے بھی مرد اور عورتیں اکھٹے نہیں نکلتے تھے بلکہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے والے صحابہؓ عورتوں کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے اور ان کے بعد نکلتے تھے۔

بخاری نے ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا سَلَّمَ يَمْكُثُ فِي مَكَانِهِ يَسِيراً، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: فَنُرَى، وَاللهُ أَعْلَمُ، لِكَيْ يَنْفُذَ مَنْ يَنْصَرِفُ مِنْ النِّسَاءِ»** **"نبی ﷺ جب (نماز میں) سلام پھیرتے تھے تو تھوڑی دیر انتظار فرماتے، ابن شہاب نے کہا ایسا لگتا ہے کہ خواتین کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے اور حقیقت اللہ کو ہی معلوم ہے۔"** دوسری روایت یوں ہے کہ مسلمہؓ نے کہا کہ **«كَانَ يُسَلِّمُ، فَيَنْصَرِفُ النِّسَاءُ فَيَدْخُلْنَ بُيُوتَهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَنْصَرِفَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ»** **" آپ ﷺ سلام پھیرتے پھر خواتین نکل کر اپنے گھروں میں داخل ہو جاتیں اس کے بعد آپ ﷺ نکلتے"**۔ یوں یہ لازمی ہے کہ تعلیم مخلوط نہ ہو۔

جہاں تک پرائیویٹ اسکولوں کے کسی خاص گروہ، دین، مذہب یا رنگ و نسل سے مخصوص نہ ہونے کا سوال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی کسی بنیاد پر سکول کھولنا ریاست کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور علیحدگی کے جھگڑوں کے ذریعے شیرازے کو بکھیر دیتا ہے۔ خصوصاً اسکول کا طالب علموں کی عقلیہ اور نفسیہ کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ہوتا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں انہی اسکولوں نے ریاست کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وجہ سے اس قسم کے اسکولوں کی اجازت نہیں ہو گی کیونکہ ان کے نتائج بہت ہی نقصان دہ ہوتے ہیں اس لیے یہ حرام ہیں، یعنی ضرر اور حرام کے وسیلے والا قاعدہ ان کی حرمت کی دلیل ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن و سنت میں گروہ بندی کو صرف انسان کی پہچان تک محدود کیا گیا ہے اور ہر قسم کی عصبیت اور رنگ و نسل کی تمیز کو ختم کر دیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ **يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ** (الحجرات: 13) **" اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک**

ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تم میں کنبے اور قبیلے اس لیے بنائے ہیں تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ بے شک اللہ دانا اور باخبر ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ خَرَجَ مِنْ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً، وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عِمِّيَّةٍ يَغْضَبُ لِعَصَبَةٍ أَوْ يَدْعُو إِلَى عَصَبَةٍ أَوْ يَنْصُرُ عَصَبَةً فَقُتِلَ فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ» " جو اطاعت سے نکل گیا اور جماعت سے جدا ہوا اور اس حال میں مرا، یا گروہ بندی کی دعوت دی گروہ بندی کی مدد کی اور مارا گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا" اس کو مسلم نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ ابو نقرۃ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا "جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کا خطبہ سنا تھا اس نے مجھے بتایا کہ رسول ﷺ نے ایام تشریق کے درمیان میں خطبہ دیا جس میں فرمایا: اے لوگو! سنو تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ ایک ہے خبردار کسی عربی کو عجمی پر اور نہ ہی کسی عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل ہے نہ ہی کسی گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کے۔ کیا میں نے پہنچایا۔ سب نے کہا اللہ کے رسول ﷺ نے پہنچایا۔" یہ سب اس دفعہ کے دلائل ہیں۔

دفعہ نمبر 178: ریاست پر وہ تعلیم مہیا کرنا فرض ہے جو زندگی کے میدان میں انسان کے لئے لازمی ہے۔ اور یہ دو مرحلوں میں یعنی ابتدائی اور ثانوی مرحلے میں ہر فرد کو چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، مہیا کرنا ہو گی، یہ تعلیم سب کو مفت فراہم کرنا ریاست پر لازم ہے اعلیٰ تعلیم بھی ممکن حد تک ریاست کے تمام افراد کے لئے مفت ہونی چاہیے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ بھی انسان کی بنیادی ضروریات اور اجتماعی مفادات میں سے ہے۔ رعایا کے افراد کو وہ تعلیم دینا جو کارزار حیات میں ان کے لیے لازمی ہے بنیادی مفادات میں سے ہے۔ اس میں جلب منفعت اور دفع مضرت یعنی فائدے کا حصول اور نقصان سے بچنا ہے اس وجہ سے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ

معرکہ حیات کے لیے بقدر ضرورت ان کو فراہم کرے اور عوام میں ان قابل لوگوں کو جو یہ کام انجام دے سکیں تمام ضروریات فراہم کرے۔ موجوہ دور میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا ہونے کے لئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم تو بنیادی ضرورت بن چکی ہے، اس لیے عوام کے تمام افراد کو ابتدائی اور ثانوی مرحلے تک تعلیم مہیا کرنا ریاست پر فرض ہے اور ریاست پر لازم ہے کہ وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے اتنے اسکول کھولے کہ رعایا کے تمام افراد کو تعلیم دینا ممکن ہو اور زندگی گزارنے کے لیے بنیادی تعلیم مفت دینا بھی فرض ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار کے جنگی قیدیوں کا یہ فدیہ مقرر کیا کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سیکھائے گا۔ فدیہ مال غنیمت میں سے ہوتا ہے جس پر خلیفہ کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے مفادات کو دیکھ کر خرچ کرے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تعلیم بلا معاوضہ ہونی چاہیے۔

اعلیٰ تعلیم بھی بنیادی مفادات میں سے ہے اس لیے اس میں سے بھی جو زیادہ ضروری ہے، جیسے میڈیکل کی تعلیم وہ بھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی طرح بلا معاوضہ اور مفت فراہم کرنا ریاست پر فرض ہے۔ اس میں بھی دفع مضرت اور جلب منفعت ہے اس لیے یہ شرعاً واجب ہے اس کے علاوہ دوسری نوعیت کی اعلیٰ تعلیم جیسے ادبی علوم وغیرہ ریاست اس وقت مفت دے گی جب اس کے پاس ایسا کرنے کے لئے اموال (فنڈز) موجود ہوں۔

یوں ابتدائی اور ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم میں سے جو امت کے لیے زیادہ ضروری ہو وہ سب ان مفادات اور مصالح میں ہیں جن کو بلا معاوضہ مفت فراہم کرنا بیت المال کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر 179: اسکولوں اور یونیورسٹی کے علاوہ بھی ریاست لائبریریاں لیبارٹریاں اور علم حاصل کرنے کے تمام وسائل مہیا کرے گی۔ تاکہ ایسے لوگوں کو مواقع حاصل ہوں جو لوگ مختلف علوم و معارف جیسے فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر یا دوسرے افکار جیسے میڈیکل، انجینئرنگ، کمسٹری، وغیرہ میں بحث و

تحقیق کرنا چاہیں اور تجربات، ایجادات اور انکشافات کر سکیں۔ تا کہ امت کے اندر مجتہدین اور موجدین کی ایک بڑی تعداد ہو۔

اس کی دلیل رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»** ترجمہ: **" امام نگہبان اور نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا"**۔ اس کو بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے اور شرعی قاعدہ ہے کہ **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب) "جس کام کے بغیر کوئی واجب ادا نہیں ہوتا، وہ کام بھی واجب ہوتا ہے"**۔ لائبریریاں، لیبارٹریاں، اور علم حاصل کرنے کے دوسرے تمام وسائل کا تعلق امت کی دیکھ بھال سے ہے جو خلیفہ پر فرض ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کرے گا تو اس کا احتساب ہو گا۔ علم و تحقیق کے یہ وسائل اگر اس نوعیت کے ہوں کہ ان کے بغیر اجتہاد، ممکن نہ ہو یا ان کے بغیر وہ ایجادات اور اختراعات ممکن نہ ہوں جو ریاست کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہیں تب تو ان کو فراہم کرنا خلیفہ پر فرض ہے جیسا کہ شرعی قاعدہ ہے کہ جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہو سکتا ہو وہ کام بھی فرض ہے۔ اگر ان وسائل کا تعلق اس نوعیت سے ہو جس سے بحث و تحقیق اور ایجادات میں آسانی ہو سکتی ہو یعنی کہ صرف مددگار ثابت ہو سکتی ہوں تب جلب منفعت میں داخل ہیں لیکن فرض نہیں ہیں۔ اگر ریاست کے پاس فنڈز ہوں گے تو وہ یہ وسائل بھی فراہم کرے گی ورنہ نہیں۔ یوں ہر قسم کی لائبریریاں، لیبارٹریاں اور بحث و تحقیق کے تمام تر وسائل کی دستیابی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر 180: تعلیم کے تمام مراحل میں تالیف سے فائدہ اٹھانے (کاپی رائٹ) کی اجازت نہیں ہو گی۔ کوئی بھی شخص جس نے کتاب لکھ کر شائع کی اس کے بعد اس کو کاپی رائٹ کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے خواہ یہ شخص مولف ہو یا کوئی اور۔ ہاں جب تک افکار اس کے ذہن میں ہیں ان کی نشر و اشاعت نہیں ہوئی تو وہ ایسے افکار لوگوں کو دے کر اس پر اجرت لے سکتا ہے جیسا کہ پڑھا کر اجرت لی جاتی ہے۔

اس کی دلیل تعلیم کی اجرت کا جائز ہونا ہے اور تعلیم کا لوگوں کے لیے مباح ہونا ہے۔ تعلیم پر اجرت لینے کے جواز میں رسول اللہ ﷺ کا قول ہے کہ **«إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ»** **"جس چیز پر اجرت لینے کا تمہیں زیادہ حق ہے وہ اللہ کی کتاب ہے"** اس کو بخاری نے ابنِ عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جب قرآن پڑھا کر اجرت لینا جائز ہے تو دوسرے علوم پڑھا کر لینا بطریقہ اولیٰ جائز ہے۔ رسول ﷺ کی جانب سے جنگی قیدیوں کا فدیہ دس مسلمانوں کو تعلیم دینے کی صورت میں قبول کرنا بھی ثابت ہے اور یہ اجرت دے کر تعلیم حاصل کرنا ہے۔ تالیف علم کو لکھنا یعنی لکھ کر لوگوں کو تعلیم دینا ہے اور یہ زبانی پڑھانے کی طرح ہی ہے۔ علم یا تو روز بروز زبانی پڑھایا جاتا ہے یا لکھ کر دیا جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں اس کی اجرت لینا جائز ہے۔ جب کسی شخص نے زبانی یا کتاب لکھ کر اپنا علم دوسرے کو منتقل کیا اب وہ دوسرا شخص بھی اس کا مالک بن گیا ہے۔ اب وہ شخص جس نے وہ علم سنا یا سیکھا ہے، وہ بھی زبانی یا لکھ کر علم کسی کو منتقل کر کے اس کی اجرت لے سکتا ہے۔ جن لوگوں نے بدر کے قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا، ان کے پڑھانے والوں کا سوائے اجرت کے کوئی حق نہیں رہا۔ اب جن لوگوں نے پڑھنا، لکھنا سیکھا ہے اس کو دوسروں کو سیکھا کر اس پر اجرت لے سکتے ہیں اور انہیں اپنے استادوں سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بھی ہے کہ علم چونکہ مباح ہے اور مباح ہونے کا یہ مطلب ہے کہ کوئی بھی اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ پھر جو شخص براہ راست اس کی تعلیم دیتا ہے اس کے لیے اجرت بھی جائز ہے اور صرف پہلا معلم ہی اجرت کا مستحق نہیں۔ اس وجہ سے علم و معرفت میں علم کی ملکیت صرف اس سیکھانے والے ہی کی نہیں بلکہ سیکھنے والے کی بھی ہوتی ہے۔ جب تک علم عالم کے پاس ہے یہ اس کی ملکیت ہے، وہ چاہے تو دوسروں کو سیکھا کر اجرت لے سکتا ہے اور چاہے تو بغیر اجرت کے سیکھا سکتا ہے۔ لیکن وہ علم جس وقت اس سے دوسرے کو منتقل ہو گیا خواہ کسی فرد یا جماعت کو چلتے پھرتے بتا دیا یا پھر کسی بھی طریقے سے یہ علم لوگوں تک پہنچا دیا تو وہ تمام لوگوں کے لیے مباح ہے کیونکہ علم سب کے لئے مباح ہے۔ اب جس شخص یا جس جماعت نے اس علم کو حاصل کیا ہے وہ معلم کی اجازت کے بغیر خواہ معلم راضی ہو یا ناراض ہو، اس علم کو دوسروں تک منتقل کر سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تالیف کا حق کسی کے پاس نہیں۔ جب تک وہ

علم اس کے پاس ہے وہ اس پر اجرت لے سکتا ہے جب پڑھا کر یا لکھ کر یا کسی بھی وسیلے سے وہ علم دوسروں کو منتقل کر دے اب وہ سب کے لیے مباح ہو گیا۔ اب کوئی بھی اس کو سیکھ سکتا ہے، پڑھ سکتا ہے اور پڑھا سکتا ہے۔ یوں کسی مولف کو تالیف کا حق (کاپی رائٹ) دینا ایک مباح کام کو حرام کرنا ہے۔ یعنی اب اس علم سے استفادہ اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا نہ ہی کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس پر اجرت لے سکتا ہے۔ اس لیے کاپی رائٹ (حق تالیف) جائز نہیں۔

خارجہ پالیسی

دفعہ نمبر 181: سیاست امت کی داخلی اور خارجی معاملات کی نگرانی (دیکھ بھال) کو کہتے ہیں۔ سیاست ریاست اور امت دونوں کی جانب سے ہوتی ہے۔ ریاست خود براہ راست عملی طور پر یہ نگرانی (نگہبانی) کرتی ہے جبکہ امت اس ذمہ داری کی انجام دہی کے حوالے سے ریاست کا احتساب کرتی ہے۔

یہ دفعہ سیاست کی تعریف کے بارے میں ہے۔ یہ تعریف تمام لوگوں کے ہاں عام ہے کیونکہ یہ سیاست کے زمینی حقائق کی صفت ہے۔ یہ بالکل عقل، صدق (سچ)، یا سلطان کی تعریف کی طرح ہے۔ یا جیسے کوئی بھی معانی جو بنی نوع انسان کے درمیان حقائق اور واقع کی شکل میں اس طرح موجود ہیں کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ ایک محسوس حقیقت ہے۔ ہاں اختلاف اس کے بارے میں احکامات کے حوالے سے ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سیاست کے لفظ کے لغوی معنی بھی عوام کو کسی کام کا حکم دینا اور کسی کام سے منع کرنا ہی ہے یعنی ان کے معاملات کی دیکھ بھال اوامر اور نواہی کے ذریعے کرنا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وہ تمام احادیث جو حکمران کی ذمہ داری، حکمران کے احتساب اور مسلمانوں کے مفادات کی دیکھ بھال اور اہتمام کے بارے میں ہیں، ان سے بھی یہی تعریف معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث جو کہ بخاری نے معقل

بن یسار کے حوالے سے نقل کیا ہے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ **«مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يُحِطْهَا بِنُصْحِهِ إِلاَّ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ»** "جس بندے کو اللہ نے حکمرانی دی اور اس شخص نے اپنی عوام کی خیر خواہی نہیں کی تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا"۔ رسول ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ: **«مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَهُمْ إِلاَّ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ»** " جو شخص مسلمانوں کا حکمران بنے اور اس حال میں مرے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے رہا ہو، اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔" رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ **«سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ، قَالُوا: أَفَلاَ نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لا مَا صَلَّوْا»** "تمہارے ایسے حکمران ہوں گے جن کو تم پہچانو گے اور (ان کی تابعداری سے) انکار کرو گے۔ جس نے ان کو پہچانا وہ بری ہوا اور جس نے ان کا انکار کیا وہ سلامت رہا، ہاں جس نے ان پر رضامندی ظاہر کی اور ان کی تابعداری کی (وہ نہ تو بری ہے اور نہ سلامت رہا) صحابہؓ نے کہا! کیا ہم ان سے لڑیں فرمایا نہیں اس وقت تک نہیں جب تک وہ نماز (شریعت کو نافذ) کو قائم رکھیں۔" اس کو ام سلمہؓ سے مسلم نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ **«وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ غَيْرُ اللهِ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ، وَمَنْ لَمْ يَهْتَمَّ لِلْمُسْلِمِينَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ»** " جس کے پیش نظر غیر اللہ ہو تو اللہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور جو شخص مسلمانوں کے معاملات کو اہمیت نہیں دیتا وہ مسلمان ہی نہیں۔" اس کو حاکم نے مستدرک میں ابن مسعودؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

جریر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ **«بَايَعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلَى: إِقَامِ الصَّلاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ»** " میں نے رسول ﷺ کی اس بات پر بیعت دی کہ نماز قائم کروں گا، زکوۃ ادا کروں گا۔ اور ہر مسلمان کو نصیحت کروں گا۔" یہ حدیث متفق علیہ ہے اور جریر بن عبد اللہؓ سے ہی ایک اور روایت ہے کہ **«أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ قُلْتُ: أُبَايِعُكَ عَلَى الإِسْلاَمِ، فَشَرَطَ عَلَيَّ: وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ»** " میں نبی ﷺ کے پاس اسلام کی بیعت دینے کے لئے آیا۔ تو نبی ﷺ نے یہ شرط رکھی کہ ہر مسلمان کو نصیحت کرو گے۔" اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ تمام احادیث خواہ ان کا تعلق حکمران کی

حکمرانی سے ہو یا امت کی جانب سے حکمران کے محاسبہ کرنے سے ہو یا پھر مسلمانوں کا آپس کے تعلق اور ایک دوسرے کے معاملات کی دیکھ بھال اور نصیحت سے ہو، ان سب سے سیاست کی یہ تعریف آشکار ہو جاتی ہے کہ سیاست امت کے امور کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے کا نام ہے۔ یوں اس دفعہ میں سیاست کی جو تعریف کی گئی ہے وہ شرعی تعریف اور شرعی دلائل سے مستنبط ہے۔

دفعہ نمبر 182: کسی فرد، حزب گروہ یا جماعت کے لئے جائز نہیں کہ اس کے کسی بھی اجنبی ریاست سے کسی بھی قسم کے تعلقات ہوں۔ ریاستوں کے ساتھ تعلقات صرف اور صرف ریاست کا کام ہے۔ کیونکہ صرف ریاست کو ہی عملی طور پر امت کے معاملات کی دیکھ بھال کا حق حاصل ہے۔ امت اور پارٹیوں (جماعتوں) کا کام ان خارجہ تعلقات کے حوالے سے ریاست کا محاسبہ کرنا ہے۔

اس کی دلیل رسول ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ **«الإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»** ترجمہ: **"امام (خلیفہ) نگہبان ہے اور اس سے اس کی عوام کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"** اس کو بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ شرع نے براہ راست عملی طور پر عوام کی دیکھ بھال کی ذمہ داری صرف حکمران پر لازم قرار دی ہے۔ عوام کے لئے حکمران کا کام کرنا جائز نہیں۔ کسی مسلمان کے لیے شرعی تقرر کے بغیر حکمران کا کام کرنا حلال نہیں۔ اگر حکمران خلیفہ ہے تو لوگوں کی جانب سے بیعت کے بعد یا پھر خلیفہ کی جانب سے معاون یا والی مقرر کرنے کے بعد ہی کوئی مسلمان حکمرانی کے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ جس کی بیعت نہ کی گئی ہو اور نہ ہی خلیفہ کی جانب سے مقرر کیا گیا ہو اس کے لیے براہ راست امت کے معاملات کی نگرانی خواہ خارجی طور پر ہو یا داخلی طور پر ہو، بالکل جائز نہیں۔

یہاں اس تعریف کی دلیل کی وضاحت ضروری ہے اور اس حقیقت کی بھی جس پر یہ دلیل لاگو ہوتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ شرع نے اختیار یا اقتدار صرف حکمران کے ساتھ خاص کیا ہے اور لوگوں کے معاملات کی

دیکھ بھال اور نگرانی صرف حکمران کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **«مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ مِنْ النَّاسِ خَرَجَ مِنْ السُّلْطَانِ شِبْرًا فَمَاتَ عَلَيْهِ إِلاَّ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً»** **"جس کو اپنے امیر (حکمران) کی بات ناپسند ہو تو اسے اس پر صبر کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو شخص حکمران کی اطاعت سے بالشت بھر بھی دور ہوا اور اس حال میں مرا تو گویا جاہلیت کی موت مرا"** یہ متفق علیہ حدیث ہے جسے ابنِ عباسؓ نے روایت کیا ہے۔ پس اس کے خلاف خروج کو سلطان (شرعی اقتدار) سے خروج قرار دیا، اس لیے اس کا اختیار سلطان کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ **«كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمْ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ»** **" بنی اسرائیل کی باگ ڈور ان کے انبیاء کے ہاتھ میں تھی، ایک نبی وفات پاتا تو دوسرا اس کا جانشین بنتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر (میرے بعد) خلفاء ہوں گے۔"** ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تمہارے امور کی نگرانی خلفاء کریں گے۔ یوں مسلمان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والوں کا تعین کر دیا گیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عوام کے معاملات کی دیکھ بھال صرف حاکم کا کام ہے کسی اور کا نہیں۔ رسول ﷺ کا اپنا عمل بھی اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت سربراہ مملکت آپ ﷺ نے ریاست کے امور کی نگرانی خود کی۔ اس لیے آپ ﷺ خود ان لوگوں کا تقرر کرتے تھے جو سیاست یعنی حکمرانی کریں اور لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ آپ ﷺ جب کسی غزوہ کے لیے نکلتے، تو کسی کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کرتے۔ آپ ﷺ نے ہی والی، قاضی اور مالیاتی امور کے ملازمین (زکوۃ، جزیہ، وغیرہ اکھٹا کرنے والے) مقرر کیے۔ اسی طرح مال کو تقسیم کرنے والے، پانی اور پھلوں کو تقسیم کرنے والے اور حساب رکھنے والے ملازمین متعین کئے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے امور کی نگرانی صرف حکمران کا کام ہے۔ یعنی خلیفہ یا خلیفہ کی جانب سے مقرر کئے گئے گورنر اور ضلعی افسران۔ سلطان (اتھارٹی) لازمی طور پر لوگوں کے معاملات کی نگہبانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قوم میں سیاست کرنے کا یہی مطلب ہے کہ حکمران ہی لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کا پابند اور ذمہ دار ہے یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال لازمی ہے۔ یعنی یہ صرف خلیفہ کی ذمہ داری ہے، کسی اور کے لیے یہ کام

کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرع نے یہ اختیار صرف خلیفہ کو یا اس کی جانب سے نامزد کئے گئے شخص کو دیا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اپنی طرف سے حکمرانی کے معاملات انجام دینا شروع کرے تو یہ شریعت کی مخالفت ہو گی۔ اور یہ فعل باطل ہو گا۔ اور تمام باطل اعمال حرام ہیں۔ اس لیے خلیفہ اور اس کی جانب سے مقرر کئے گئے شخص کے علاوہ کسی کی جانب سے حکومت اور اختیار والے کام کرنا منع ہو گا۔

یہ تو دلیل کے اعتبار سے تھا اور موجودہ صورت حال اور زمین حقائق کے اعتبار سے، کسی پارٹی کی جانب سے بعض معاملات کی دیکھ بھال کی پابندی جمہوری نظامِ حکومت کے تصورات کا حصہ ہے کیونکہ جمہوری نظامِ حکومت میں انسٹی ٹیوشنز (ادارے) ہوتے ہیں جن کے اوپر وزارت یعنی حکومت ہوتی ہے۔ لیکن اس حکومت کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ادارے ہوتے ہیں جو رعایا کے بعض معاملات کی دیکھ بھال کے پابند ہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں ایک طرح کی حکومت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ ایسوسی ایشن (انجمنیں) یا یونین جیسے بار ایسوسی ایشن جو کہ وکالت کے پیشے سے منسلک تمام وکیلوں کے معاملات کی نگرانی کرتی ہے۔ اور یہ نگرانی اس پر لازم ہے یوں بعض معاملات میں اس ایسوسی ایشن کو وکیلوں پر اختیار اور اقتدار حاصل ہے کیونکہ یہی ان کو پریکٹیس کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ ان کو سزا وغیرہ بھی دیتی ہے اور ان کے لیے ریٹائرمنٹ فنڈ مقرر کرتی ہے وغیرہ اور یہ سارے کام اقتدار یعنی حکومت کے ہیں جو وکالت کے پیشے سے منسلک افراد کے حوالے سے اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ایسوسی ایشن ان امور کو وزارت کی طرح نافذ بھی کرتی ہے۔ یہی حال میڈیکل ایسوسی ایشن اور ڈاکٹرز یونین اور تمام یونینوں کا ہے۔ یہ ہے وہ زمینی حقیقت جس پر داخلی لحاظ سے دلیل لاگو ہوتی ہے جبکہ خارجہ امور کے لحاظ سے اس طرح ہے کہ بعض جمہوری ممالک اپوزیشن پارٹی کو دوسرے ممالک سے روابط استوار کرنے کا حق دیتے ہیں۔ اور اس کو حکومت سے باہر ہوتے ہوئے بھی بات چیت اور مذاکرات کا حق دیتے ہیں۔ اور وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے بعض معاہدے بھی کرتے ہیں پھر حکومت میں آکر ان کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ خارجی حوالے سے ان زمینی حقائق کے لئے یہی دلیل ہے۔

یہ حقائق یعنی لوگوں کے بعض آرگنائزیشنز اور ایسوسی ایشن کی جانب سے بعض داخلی معاملات کی نگرانی کا پابند ہونا اور بعض اداروں اور پارٹیوں کی جانب سے خارجی معاملات کی نگہبانی کا پابند ہونا اسلام میں بالکل جائز نہیں۔ کیونکہ اتھارٹی اور لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کا حق صرف خلیفہ یا امیر کو یا پھر خلیفہ اور امیر کی جانب سے مقرر کئے گئے شخص کو حاصل ہے اور کوئی بھی شخص براہ راست ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ صرف ایک ہی مسئلہ کے لئے کیوں نہ ہو کیونکہ شرع میں اس کی اجازت نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کی براہ راست نگرانی کا پابند ہونا لوگوں پر نگہبان ہونا ہے اور یہ نگہبانی ایک عقد ہے جو لا محالہ دو آدمیوں کے درمیان ہونا چاہیے۔ خلیفہ اور امت کے درمیان جسے انہوں نے امیر بنا دیا ہے۔ یا پھر خلیفہ اور اس شخص کے درمیان جس کو امیر نے اپنا قائم مقام مقرر کیا ہے۔ جو بغیر عقد کے براہ راست معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے تو یہ باطل ہے اور کوئی بھی باطل کام بغیر کسی اختلاف کے حرام ہے۔ یوں عوام کے امور کی براہ راست دیکھ بھال کا التزام (پابندی) غیر حکمران کے لئے بالکل حرام ہے۔ اس وجہ سے سیاسی پارٹیوں اور امت کے افراد کے لیے کسی اجنبی ملک سے براہ راست تعلقات قائم کرنا حرام ہے کیونکہ یہ عوام کے معاملات کی براہ راست نگران بننا ہے۔ یہ تھی اس دفعہ کی دلیل۔

دفعہ نمبر 183: مقصد کا نیک ہونا (اس مقصد کے حصول کے) ذریعے کو جائز نہیں بناتا، کیونکہ طریقہ بھی فکر کی جنس سے ہے اس وجہ سے حرام ذریعہ اختیار کر کے واجب (فرض) کو ادا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی مباح کام کو انجام دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کے ذرائع کا سیاست کے طریقے سے متناقض ہونا جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے احکامات نازل کیے ہیں، جیسے خرید و فروخت، اجارہ کمپنی وغیرہ کے احکامات۔ پھر ان احکامات کو لوگوں کے درمیان رائج کرنے اور ان پر نافذ کرنے کے کچھ مزید احکامات دیے ہیں، جیسے خرید و فروخت میں دھوکہ دینے والے کو تعزیری سزا اور چور کا ہاتھ کاٹنے کی حد۔ بالکل

اسی طرح اللہ نے اسلامی ریاست اور کافر ریاستوں کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے احکامات نازل کیے ہیں، جیسے معاہد (جس کے ساتھ کوئی عہد کیا گیا ہو) یا مستأمن (جس کو امان دی گئی ہو) کے احکامات، اور دارُ الحرب کے احکامات اور بہترین انداز سے کفار کو دعوت دینے اور تبلیغ کرنے کے احکامات وغیرہ۔ پھر ان احکامات کو نافذ کرنے کے لیے دیگر احکامات نازل کیے ، جیسے مسلمان کی جان و مال کی حفاظت کی طرح مستأمن (امن حاصل کرنے والے) کی جان ومال کی حفاظت کے احکامات یا کافروں کو اسلام کی تبلیغ اور دعوت دینے سے قبل ان کو قتل کرنے کے حرام ہونے کے احکامات۔ یوں اسلام میں طریقہ بھی شرعی احکامات پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ اس لیے دھوکہ دے کر کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی یا عہد شکنی کر کے فتح حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ جس طرح مقصد کا تعین بھی شرع سے کیا جانا چاہیے بالکل اسی طرح اس مقصد تک پہنچانے کا ذریعہ بھی شرع کی اجازت سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ مقصد اور اسے حاصل کرنے کا ذریعہ دونوں بندے کے افعال ہیں۔ جو چیز اس فعل کو مباح یا ممنوع بناتی ہے وہ شرعی دلیل ہے نہ کہ وہ نتائج جو کہ اس فعل کو انجام دینے سے حاصل ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہ غایت جو اس فعل کی انجام دہی کا ہدف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے: **وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ' آپ ان کے معاملات میں اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکمرانی کیجئے"** (المائدہ:49)۔ نہ کہ اعمال کے نتائج کے مطابق۔ پس ذریعے کا حکم بھی غایت کے حکم کی طرح شرعی دلیل پر مبنی ہو گا۔ یعنی دلیلِ شرعی ہی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ یہ غایت (مقصد) مباح ہے یا حرام اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ غایت ذریعے کے لیے بہانہ نہیں (یعنی نیک مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی ذرائع اختیار نہیں کئے جاسکتے)۔ دوسرے الفاظ میں اگر شرعی دلیل کی رو سے واسطہ (ذریعہ) حرام ہے تو مقصد اور غایت کا نیک ہونا اسے مباح نہیں بنائے گا۔ کوئی ذریعہ اس لیے مباح نہیں ہو گا کہ اس کا مقصد مباح، واجب یا مندوب ہے یا اس لیے کہ اس غایت میں نفع، خیر یا کامیابی ہے۔ بلکہ ذریعہ اُس وقت مباح ہو گا جب شرع اس کو مباح قرار دے اور اس وقت حرام ہو گا جب شرع اس کو حرام قرار دے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں شرع کی پیروی کی جائے گی۔ کیونکہ مسلمان کے تمام اعمال کا شرع کے مطابق ہونا واجب ہے اس لیے حکم شرعی کی

تعریف یہ ہے کہ بندوں کے افعال سے متعلق شارع کا خطاب۔ یوں مسلمان کے تمام افعال حکمِ شرعی کے موافق ہونے چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس قاعدے کو نہیں مانتے اور اس کی مذمت کرتے ہیں کہ نیک مقصد کے لیے کوئی بھی ذریعہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کے دلائل سے ایسے قواعد اخذ کیے گئے ہیں جن کی رو سے مقصد تک پہنچانے والے ذریعے کا بھی وہی حکم ہے جو مقصد کا ہے، جیسا کہ یہ قاعدہ ہے کہ **(الوسيلة إلى الحرام حرام)** **" حرام کام کا وسیلہ (ذریعہ) بھی حرام ہے"** یا یہ قاعدہ: **(كل فرد مباح إذا أوصل إلى ضرر حرم ذلك الفرد وبقي الشيء مباحاً)** **" مباح کا ہر وہ جزو جو ضرر (نقصان) کا سبب ہو، وہ حرام ہے، لیکن وہ مباح چیز مباح ہی رہے گی"**۔ اسی طرح یہ قاعدہ: **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب)" جس کام کے بغیر فرض ادا نہیں ہوتا وہ کام بھی فرض ہے"**۔ لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب ذریعہ مباح یا فرض ہو۔ اگر ذریعہ حرام ہے تو غایت (مقصد) کے حلال ہونے کی وجہ سے ذریعہ حلال نہیں ہو گا خواہ غایت فرض ہو یا مباح بلکہ حرام ذریعہ حرام ہی رہے گا۔ یوں مقصد ذریعے کے لیے جواز نہیں بن سکتا۔ دوسرے الفاظ میں غایت خواہ واجب ہو یا مباح حرام ذریعے کو مباح نہیں کر سکتی۔ اس بنیاد پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا اور یہی اس دفعہ کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 184: خارجہ سیاست میں سیاسی چال چلنا ضروری ہے۔ سیاسی چال کی اصل طاقت اہداف کو خفیہ رکھنا جبکہ اعمال (کاروائیوں) کا اعلان کرنا ہے۔

یہ دفعہ ان مباح کاموں سے ہے جنہیں خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ سیاسی چال اور داؤ پیچ سے مراد وہ کام ہیں جو ریاست کچھ خاص مقاصد سامنے رکھ کر انجام دیتی ہے۔ یہ مقاصد اُن مقاصد سے مختلف ہوتے ہیں جو اقدامات سے ظاہراً نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کفار کے خلاف سیاسی چالیں چلتے تھے۔ ان سیاسی چالوں میں سے وہ جنگی مہمیں شامل ہیں جو آپ ﷺ نے پہلے ہجری سال کے اواخر اور دوسرے سال کے اوائل میں بھیجیں۔ بظاہر تو ان جنگی مہموں سے یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قریش

سے جنگ کرنا چاہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول ﷺ انہیں دہشت زدہ اور خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسرے عرب قبائل کو اپنے اور قریش کے درمیان جاری اس لڑائی میں غیر جانبدار رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان سرایا میں آپ ﷺ بہت تھوڑی تعداد میں مجاہدین بھیجتے تھے۔ ساٹھ، دو سو یا تین سو۔ یہ تعداد قریش کے ساتھ جنگ کے لیے ہر گز کافی نہیں تھی اور ان تمام سرایا میں باقاعدہ جنگ بھی نہیں ہوئی لیکن ہر سریہ کے بعد نتیجے کے طور پر کسی نہ کسی عرب قبیلے سے معاہدے کیے گئے جیسے آپ ﷺ نے بنو ضمرہ کو اپنا حلیف بنایا اور بنی مدلج کی ہمدردی و مدد حاصل کی۔ رسول اللہ ﷺ کے اس سیاسی داؤ پیچ میں سے ایک اور مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ قریش کے ساتھ حالت جنگ میں ہونے کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال حج کرنے کے ارادے سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے اور اس کا اعلان بھی کیا، حالانکہ کعبہ قریش کے کنٹرول میں تھا۔ اس سفر کا مقصد بھی قریش کے ساتھ سیز فائر اور صلح کرنا تھا۔ تاکہ یکسو ہو کر خیبر پر حملہ کیا جا سکے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو چکا تھا کہ خیبر اور قریش کے درمیان مذاکرات اور بات چیت جاری ہے کہ متفقہ طور پر مدینہ منورہ پر حملہ کیا جائے۔ اس سفر کے سیاسی چال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ واپسی پر راضی ہو گئے اور حج بھی نہیں کیا اور صلح کو کامیابی بھی قرار دیا۔ اور پھر مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد دو ہفتے کے اندر خیبر پر حملہ کر کے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ سب سیاسی چالیں ہیں۔ ان چالوں کی طاقت اس امر میں ہے کہ ان میں بطور سیاسی چال جو کام انجام دیئے جاتے ہیں وہ ظاہری اور اعلان کردہ ہوتے ہیں، لیکن ان کاموں کے پیچھے موجود مقصد کو پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ پس سیاسی چالوں کی طاقت اعمال کا ظاہر کرنے اور اہداف کو خفیہ رکھنے میں ہے۔

دفعہ نمبر 185: ریاستوں کے جرائم کو بے نقاب کرنے میں جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرنا، جھوٹی پالیسیوں کے خطرے کو بیان کرنا، خبیث سازشوں کو طشت از بام کرنا، گمراہ کن شخصیات کو زمیں بوس کرنا؛ یہ سب سیاست کے اہم اسالیب میں سے ہیں۔

یہ دفعہ اسالیب کے بارے میں ہے اور اسالیب مباحات میں سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ احزاب کے دن بنو قریظہ کی جانب سے عہد شکنی کے جرم کو بے نقاب کیا۔ جب عبد اللہ بن جحش نے قریش کے دو آدمیوں کو قیدی بنایا تھا اور ایک آدمی کو حرام مہینے میں قتل کر دیا تھا تو قریش نے مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول دیا کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے حرام مہینے کو حلال کر دیا ہے، خون بہایا ہے، اموال پر قبضہ کیا ہے اور لوگوں کو قیدی بنایا ہے۔ تو اِس پر اللہ تعالیٰ نے آیات اتاریں اور واضح کیا کہ قریش کس قدر جھوٹی چالوں کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **يَسْاَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ** " **لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے۔ لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجدِ حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی بڑا گناہ ہے**"(البقرۃ:217)۔

جب بنو نضیر کے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کی اور آپ ﷺ پر اس وقت بھاری پتھر گرانا چاہا جب آپ ﷺ دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، تو آپ ﷺ نے ان کی سازش کو فاش کیا اور سزا کے طور پر انہیں ملک بدر کر دیا۔ ابنِ اسحاق کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ بنو عامر کے اُن دو مقتولین کی دیت میں مدد حاصل کرنے کے لیے بنو نصیر کے پاس گئے، جن کو عمرو بن امیہ الضمیری نے قتل کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے درمیان معاہدہ کیا تھا جیسا کہ یزید بن رومان نے مجھے بتایا ہے۔ بنو نضیر اور بنو عامر کے درمیان معاہدہ تھا اور وہ اتحادی تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ ان دو مقتولین کی دیت میں مدد لینے کے لیے بنو نضیر کے پاس پہنچے تو ان لوگوں نے کہا جی ہاں اے ابو القاسم اس حوالے سے آپ کو جو مدد درکار ہو ہم آپ کی مدد کریں گے پھر ان میں سے کچھ لوگوں نے ایک طرف ہو کر تنہائی میں بات چیت کی اور کہا کہ یہ آدمی اس طرح پھر کبھی تمہیں نہیں ملیں گے۔ رسول ﷺ ان کے گھروں کی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تم میں

سے کون اس چھت پر جا کر ایک بھاری پتھر ان پر گرادے تاکہ ان سے ہمیشہ کے لیے ہماری جان چھوٹ جائے؟ عمرو بن جحاش بن کعب اس کام کے لئے تیار ہو گیا اور کہا میں یہ کام کروں گا اور پتھر گرانے کے لیے چھت پر چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو وحی سے ان لوگوں کے ارادے کی خبر دی گئی اور آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ اور مدینہ پہنچ کر جنگ کی تیاری کا اعلان کر دیا اور تیاری مکمل ہوتے ہی ان پر ہلہ بول دیا اور ان کو جلاوطن کر دیا۔

اسی طرح قرآن نے بھی ابولہب کا نام لے کر اس کو نشانہ بنایا اور اسے رسوا کیا۔ ارشاد فرمایا: **تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ** **"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گیا"** (المسد 1:)۔ اور اسی طرح قریش کے دوسرے سرداروں کو نشانہ بنایا۔ یہ سب گمراہ کن شخصیات کو بے نقاب کرنے کی مثالیں ہیں۔ یہ تھے اس دفعہ کے دلائل۔

دفعہ نمبر 186: افراد، امتوں اور ریاستوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے حوالے سے اسلامی افکار کی عظمت کو نمایاں کرنا، خارجہ سیاست کا اعلیٰ طریقہ ہے۔

ایسا کرنا ریاست پر واجب ہے۔ یہ فرض ہے مباح نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ دعوت کو اس طرح پہنچانا ریاست پر فرض ہے کہ وہ بالکل واضح اور بہترین انداز سے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا **وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ** ' **رسول کے ذمہ تو صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہی ہے"** (العنکبوت:18)۔ اس میں **الْمُبِيْنُ** کا کلمہ ایک مفہوم والی صفت (وصف مفہم) ہے اس لیے یہ تبلیغ کے لیے شرط ہے۔ اسلامی افکار کی عظمت کو اجاگر کیے بغیر اعلیٰ انداز میں دعوت کی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔

اسلامی افکار کی عظمتوں میں سے اسلامی ریاست کی جانب سے ذمیوں، مستأمن اور اہلِ معاہدہ کے ساتھ حسنِ سلوک اور حاکم کا شریعت کا نافذ کرنے کا پابند ہونا نہ کہ عوام پر مسلط ہونا ہے۔ اسی طرح امت کی

جانب سے بلا خوف و خطر حکمران کا مکمل احتساب ہے۔ جس طرح امت پر حکمران کا محاسبہ فرض ہے بالکل اسی طرح اس کی اطاعت بھی فرض ہے اگرچہ وہ ظلم کرے۔ لیکن گناہ کے کام میں اس کی اطاعت حرام ہے۔ امت کو انقلاب لانے کا پورا پورا حق حاصل ہے، جب وہ حکمران کی طرف سے کھلم کھلا کفر دیکھے، ایسی صورت میں امت کے لیے حکمران کے خلاف اٹھنا فرض ہو جاتا ہے۔ اسلامی افکار کی عظمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس میں حاکم اور محکوم ہر لحاظ سے برابر ہیں۔ جیسے افراد کو حقوق کے حوالے سے قاضی کے سامنے شکایت کرنے کا حق حاصل ہے بالکل اسی طرح امت کو حکمران کے خلاف شکایت کرنے کا بھی حق حاصل ہے، جب حکمران حکمرانی کے دوران شرع کی مخالفت کرے یا کسی اسلامی فکر کی خلاف ورزی کرے تو قاضی المظالم سے اس کی شکایت کی جائے گی۔ ان افکار کی عظمت کو اجاگر کرنے سے اسلام کی عظمت نمایاں ہوتی ہے اور اسلام کی تبلیغ بہترین انداز سے ہو گی۔ اسلامی افکار کی عظمت کا اظہار کرنا سیاست کا اسلوب نہیں بلکہ یہ سیاست کا طریقہ ہے۔

شرعی حکم یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ کرنے سے قبل کفار کو قتل کرنا یا ان سے عملاً لڑائی کرنا جائز نہیں۔ طبرانی نے الکبیر میں فروہ بن مسیک المرادی سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری قوم میں سے جو ایمان لائے ہیں ان کو لے کر ایمان نہ لانے والوں سے لڑ سکتا ہوں؟ فرمایا: ہاں۔ وہ شخص جانے لگا تو واپس بلایا اور فرمایا ان کو اسلام کی دعوت دو اگر انکار کریں تو ان سے لڑو" ترمذی نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں **«مَا قَاتَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَوْماً حَتَّى دَعَاهُمْ» "رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی قوم کو دعوت دینے سے قبل ان سے لڑائی نہیں کی"** (دارمی، احمد، حاکم)۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ لڑائی سے پہلے اسلام کی دعوت دینا واجب ہے۔ دعوت کو مکمل کرنے کے لیے لازم ہے کہ اسلام کی تبلیغ بہترین انداز میں کی جائے۔ اس لیے اسلامی افکار کی عظمت کو اجاگر کرنا فرض ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر بہترین انداز میں دعوت کی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔ یہ اسالیب کے نہیں طریقے کے احکامات میں سے ہے۔

دفعہ نمبر187: امت کا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ اسلام اس امت کی ریاست کی قوت ہے، اور یہ کہ اسلامی احکامات کا بہترین طریقے سے نفاذ کیا جائے اور دنیا کے سامنے اسلامی دعوت کو پیہم طریقے سے پہنچایا جائے۔

سیاسی مسئلہ کے لفظ کا یہ مطلب ہے کہ وہ کام جو ریاست اور امت کے سامنے ہے اور معاملات کی دیکھ بھال کی خاطر ہر حال میں اس کام کو کرنا ضروری ہے۔ یہ امر کبھی عام ہوتا ہے اور کبھی خاص ہو گا لیکن دونوں صورتوں میں یہ امت کے لئے سیاسی مسئلہ ہو گا یہاں تک کہ یہ کبھی جزوی امر بھی ہو تب بھی یہ سیاسی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہو گا۔ مثال کے طور پر وہ امر جس کا امت کو سامنا ہے اور امت نے ہر صورت میں اس کام کو انجام دینا ہے کیونکہ رعایا کی دیکھ بھال اس کے بغیر ممکن نہیں , وہ خلافت کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔ یوں یہ مسلمانوں کا سیاسی مسئلہ ہے اس کے علاوہ جو دوسرے مسائل ہیں جیسے فلسطین کا مسئلہ یا وسط ایشیاء کا مسئلہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل مسئلے کے تحت ہیں۔ یہ مسائل اگرچہ امت کو درپیش ہیں اور رعایا کی دیکھ بھال میں سے ہیں لیکن یہ خلافت کے از سر نو قیام کے مسئلے کے جزوی مسائل ہیں۔ جب اسلامی ریاست قائم ہو گی تو اس کا سیاسی مسئلہ داخلی طور پر اسلام کو بھرپور انداز میں نافذ کرنا اور اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہو گا۔ جب ریاست مضبوط ہو جائے اور اس کا ایک مقام بن جائے تو اس کا سیاسی مسئلہ وہی ہو گا جو اس دفعہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ریاست جب اسلام کو زبردست انداز سے نافذ کرے گی اور دنیا میں طاقتور مقام حاصل کرے گی تو اس کا 'سیاسی مسئلہ' اسلام کی دعوت کو سارے عالم کے سامنے پیش کرنا ہو گا تاکہ اللہ تعالیٰ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ یوں سیاسی مسئلہ وہ مسئلہ ہے جو امت اور ریاست کے امور میں سے اہم ترین ہے، جسے حل کرنے کو شرع نے فرض قرار دیا ہے۔ ریاست پر فرض ہے کہ وہ اس مسئلے کو اسی طرح انجام دے جس طرح شرع نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ بات کسی خاص دلیل کی محتاج نہیں کیونکہ اس کا تعلق ان تمام شرعی احکامات کو نافذ کرنے سے ہے جن کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا مختلف احوال میں سیاسی مسئلہ بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ مکہ میں دعوت کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کا سیاسی مسئلہ اسلام کا غلبہ تھا۔ اس وجہ سے جب ابو طالب نے رسول اللہ

ﷺ سے کہا"إن قومك قد جاءوني فقالوا لي كذا وكذا، للذي كانوا قالوا له، فأبق علي وعلى نفسك، ولا تحملني من الأمر ما لا أطيق" " تمہاری قوم میرے پاس آئی تھی اور مجھ سے یہ اور یہ کہا۔ جو کچھ انہوں نے کہا، سو مجھ پر اور اپنے آپ پر رحم کرو۔ میرے کندھوں پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کو میں اٹھا نہ سکوں۔ رسول اللہ ﷺ سمجھ گئے کہ ابو طالب کیا کہہ رہے ہیں یعنی وہ آپ کی مدد جاری نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ وہ آپ کی مدد اور نصرت سے عاجز ہو گئے ہیں"۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے فرمایا«يَا عَمُّ، وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى أَنْ أَتْرُكَ هَذَا الأَمْرَ حَتَّى يُظْهِرَهُ اللهُ أَوْ أَهْلَكَ دُونَهُ مَا تَرَكْتُهُ» "چچا جان: اللہ کی قسم! اگر یہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ میں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں اور کہیں کہ میں اس (دعوت) سے باز آجاؤں تو باز نہیں آؤں گا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میں اس راستے میں مارا جاؤں" (سیرت ابنِ ہشام)۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اس قسم کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت آپ ﷺ کا 'سیاسی مسئلہ' اسلام کا غلبہ تھا۔ پھر مدینہ آکر ریاست قائم کرنے کے بعد اسلام کے اولین دشمن اور کفر کے سرغنہ قریش کے ساتھ جنگ لڑنے میں بھی آپ ﷺ کا 'سیاسی مسئلہ' اسلام کا اظہار (غلبہ) ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اور حدیبیہ کے مقام سے پہلے آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قریش کو آپ ﷺ کی روانگی کی خبر ہو چکی ہے اور وہ جنگ کی تیاری کر کے نکل چکے ہیں۔ جیسا کہ بنی کعب کے آدمی نے آپ ﷺ کو بتایا کہ قریش کو آپ کی روانگی کی خبر ہو چکی ہے اور وہ شیر کی کھال پہن کر (جنگ کی تیاری کر کے) نکل چکے ہیں اور ذی طوع پہنچ کر اللہ سے عہد کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ کو کسی بھی صورت میں مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «يَا وَيْحَ قُرَيْشٍ! لَقَدْ أَكَلَتْهُمُ الْحَرْبُ، مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ خَلَّوْا بَيْنِي وَبَيْنَ سَائِرِ النَّاسِ» إلى أن قال: «فَمَاذَا تَظُنُّ قُرَيْشٌ؟ وَاللهِ، إِنِّي لا أَزَالُ أُجَاهِدُهُمْ عَلَى الَّذِي بَعَثَنِي اللَّهُ لَهُ حَتَّى يُظْهِرَهُ اللَّهُ لَهُ أَوْ تَنْفَرِدَ هَذِهِ السَّالِفَةُ» "قریش ہلاک ہو گئے! جنگوں نے ان کو کھا لیا، ان کو کیا ہوتا کہ وہ میرے اور دوسرے لوگوں کے بیچ سے ہٹ جاتے۔ وہ کیا گمان کرتے ہیں۔ میں تو ان سے اس وقت

تک لڑوں گا یہاں تک کہ اللہ اسے غالب نہ کردے یا مرا سر تن سے جدا ہو جائے"۔ اس کو احمد نے المسور اور مروان سے نقل کیا ہے۔ یہاں لفظ **السالفه** سے مراد گردن ہے اور گردن کے الگ ہونے یا سر تن سے جدا ہونے کا مطلب موت ہے۔ یعنی میں اس وقت تک لڑوں گا جب تک زندہ ہوں۔ تو ان دونوں حالتوں میں (یعنی مکہ اور مدینہ میں) 'سیاسی مسئلہ' ایک ہی تھا، یعنی اسلام کا غلبہ۔ تاہم پہلی حالت میں اسلام کے غلبہ تک اس کی دعوت پر ڈٹے رہنے کی قسم کھائی۔ جبکہ ریاست کے قیام کے بعد اسلام کے غلبے کے لیے مرتے دم تک جہاد کرنے کی قسم کھائی۔ جب آپ ﷺ قریش کے ساتھ صلح تک پہنچ گئے تو یہ بہت بڑی فتح تھی کیونکہ اس سے فتحِ مکہ کی راہ ہموار ہو گئی اور اہلِ عرب فوج در فوج رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر ایمان لانے لگے۔ اب رسول اللہ ﷺ کا سیاسی مسئلہ صرف عرب میں اسلام کا غلبہ نہ تھا بلکہ یہ سارے ادیان پر اسلام کا غلبہ بن گیا۔ یعنی دوسرے مذاہب کی تمام بڑی ریاستوں جیسے فارس اور روم پر غلبہ اب سیاسی مسئلہ ہو گیا۔ اس لیے سورۃ فتح نازل کی گئی اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا **هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ** **" وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کردے"**(الفتح:28)۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی اسلامی ریاست اسلام کو شاندار انداز میں نافذ کرے گی اور ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرے گی اس کا سیاسی مسئلہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنا ہو جائے گا۔ اور وہ اسلام کو پھیلانے کے لیے دوسرے ادیان اور عقائد والی ریاستوں کے ساتھ جہاد کرے گی۔ یہ تھے اس دفعہ کے دلائل۔

دفعہ نمبر188: اسلامی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہی سیاست کا محور ہے جس کے گرد خارجہ سیاست گھومے گی اور اسی کی بنیاد پر ریاست دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات استوار کرے گی۔

یہ دفعہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بادشاہوں کو لکھے گئے خطوط، اسامہؓ کے لشکر کی تیاری، جسے آپ ﷺ سلطنتِ روم سے جنگ کرنے کے لیے فلسطین کی سرزمین البلقاء اور الداروم بھیجنا چاہتے تھے، اور

مرض الموت میں بھی اس فوج کو روانہ کرنے پر اصرار کرنے، سے اخذ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف دعوت دینا ہی اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے۔ یہ تعلقات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ فوج کو تیار رکھا جائے۔ جنگی تیاری کئے جانے تک، بہترین انداز میں اسلامی دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی جو اسے قبول نہ کریں، موقع ملتے ہی زبردست طاقت و قوت کے ساتھ ان سے جہاد کیا جائے۔ یوں اسلامی دعوت ہی کسی بھی ریاست کے ساتھ تعلقات کی بنیاد ہے اور یہی دعوت خارجہ سیاست کی بنیاد ہے۔

دفعہ نمبر 189: دنیا میں موجود دوسری ریاستوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات چار بنیادوں پر استوار ہوں گے۔

اول: وہ ریاستیں جو عالمِ اسلام میں قائم ہیں، ان سب کو یہ حیثیت دی جائے گی کہ گویا یہ ایک ہی ریاست کے اندر ہیں۔ اس لیے یہ خارجہ سیاست کے زمرے میں نہیں آتیں۔ نہ ہی ان سے تعلقات خارجہ سیاست کے اعتبار سے قائم کئے جائیں گے، بلکہ ان سب کو ایک ریاست میں یکجا کرنا فرض ہے۔

دوم: وہ ریاستیں جن سے ہمارے اقتصادی، تجارتی، اچھے ہمسائیگی یا ثقافتی معاہدات ہیں، ان کے ساتھ ان معاہدات کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ ان کی رعایا کو بغیر پاسپورٹ کے صرف شناخت کی بنیاد پر ریاست میں داخلے کا حق حاصل ہو گا۔ بشرطیکہ معاہدے میں یہ بات ہو اور وہ بھی ہمارے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہوں۔ ان کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی تعلقات کچھ متعین اشیاء تک محدود ہوں گے اور ان اشیاء کی صفات معلوم ہوں۔ اور یہ ایسی اشیاء نہ ہوں کہ جس سے اس ریاست کو تقویت پہنچتی ہو۔

سوئم: وہ ریاستیں جن کے ساتھ ہمارے کوئی معاملات نہیں یا ستعماری ممالک جیسے برطانیہ ،امریکا، اور فرانس یا وہ ممالک جو ہمارے علاقوں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں، جیسے روس۔ یہ ریاستیں ہمارے ساتھ حکماً متحارب (جنگی حالت میں) ہیں۔ ان کے حوالے سے ہر طرح کی احتیاط برتی جائے گی۔ ان کے ساتھ کسی بھی قسم کے سفارتی تعلقات استوار کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ ان ریاستوں کے شہری ہمارے علاقوں میں پاسپورٹ اور خصوصی اجازت اور ہر شخص کے لیے الگ ویزے کے ساتھ داخل ہو سکتے ہیں ماسوائے کہ ان سے عملاً جنگ شروع ہو جائے۔

چہارم: وہ ریاستیں جو ہمارے ساتھ عملاً حالت جنگ میں ہوں، جیسے اسرائیل۔ ان کے ساتھ ہر حوالے سے حالتِ جنگ کا ہی معاملہ کیا جائے گا۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے گا گویا ہماری اور ان کی جنگ ہو رہی ہے اگر چہ ہمارے اور ان کے درمیان سیز فائر جنگ بندی ہو ان کا کوئی شہری ہمارے علاقے میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یہ دفعہ دارالاسلام اور دار الکفر کے احکامات، اسی طرح معاہدہ اور مستامن کے احکامات، سے ماخوذ ہے۔

پہلا نکتہ اسلامی علاقوں کے بارے میں ہے جہاں اسلام کی حکومت تھی جیسے ہندوستان یا جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی جیسے لبنان۔ اسلامی علاقے 1342ھ میں خلافت کے انہدام کے وقت سے سب کے سب دارالکفر ہیں، یہاں تک کہ خلافت دوبارہ قائم ہو جائے۔ کیونکہ ان علاقوں میں اسلام کی حکمرانی نہیں اور ان کی خارجی امان اسلام کے ذریعے نہیں ان میں کچھ علاقوں میں امان تو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اسلام نافذ نہیں ہے۔ بہر حال یہ تمام علاقے دارالکفر ہیں۔ اگر آج مسلمانوں کے علاقے دارالاسلام ہوتے تو پھر ان کو دارلاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے کام کرنا فرض نہ ہوتا لیکن جب تک یہ تمام علاقے اسلامی حکمرانی کے تحت نہیں یا پھر ان کی امان اسلام کی وجہ سے نہیں، یہ دار لکفر ہی ہیں۔ دارالکفر ہونے کا ہر گز یہ

مطلب نہیں کہ ان کے رہنے والے سب کافر ہیں۔ اور نہ ہی دارلاسلام کا یہ مطلب ہے کہ اس کے رہنے والے سارے مسلمان ہیں۔ یہاں دار کا معنی ایک شرعی اصطلاح یعنی 'شرعی حقیقت' ہے یعنی شرع نے ہی اسے ایک خاص معنی عطا کیے ہیں، جیسا کہ شرع نے ایک عبادت کو صلاۃ کا دوسری کو صوم کا نام دیا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک علاقے کو دارالکفر اور دوسرے کو دارالاسلام کا نام دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر مثلاً ایک علاقے میں رہنے والے عیسائی ہوں لیکن وہ اسلامی ریاست کا حصہ ہو تو اس پر دار الاسلام کا اطلاق ہو گا کیونکہ وہاں جو قوانین نافذ کیے جا رہے ہیں وہ اسلام کے قوانین ہیں اور اس علاقے کی امان اسلام کے ذریعے ہے، جب تک وہ اسلامی ریاست کا حصہ ہے۔

اور اسی طرح ایک ایسا علاقہ کہ جس کے لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو لیکن وہ ایک ایسی ریاست کے تحت ہوں جو اسلام کے ذریعے حکمرانی نہیں کرتی اور اس علاقے کا امن و تحفظ مسلمانوں کی فوج کی بجائے کفار کی فوج کے ذریعے ہو تو وہ علاقہ دار الکفر ہے، اگرچہ لوگوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ کیونکہ 'دار' کا معنی ایک شرعی حقیقت ہے اور اس میں مسلمانوں کی قلت یا کثرت کا عمل دخل نہیں۔ بلکہ جس چیز کا اعتبار ہے وہ یہ ہے کہ وہاں قوانین کون سے نافذ ہو رہے ہیں اور وہاں کے لوگوں کا امن و تحفظ کس ذریعے سے ہے۔ یعنی 'دار' کے معنی کو شرعی نصوص سے اخذ کیا گیا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ لفظ 'صلاۃ' کے معنی شرعی نصوص سے ماخوذ ہیں۔ یہی تمام شرعی حقائق کا معاملہ ہے کہ ان کے معنی شرعی نصوص کی بنا پر ہیں اور یہ لغوی معنی نہیں ہیں۔

دار الکفر کے احکامات دار الاسلام کے احکامات سے یکسر مختلف ہیں۔ دارالکفر کے لیے مخصوص احکامات ہیں:

اگر ایک مسلمان دار الکفر میں رہائش پزیر ہو اور وہ دین کے شعائر کا اظہار نہ کر سکتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ کسی اور دار لکفر کی طرف ہجرت کر جائے جہاں وہ اپنے دینی شعائر کا اظہار کر سکتا ہو۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے **اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا**

فِيْهَا ۚ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں، تو پوچھتے ہیں: تم کس حال میں تھے۔؟ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ کمزور اور مغلوب تھے اور فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے جو پہنچنے کی بہت بری جگہ ہے۔" (النساء: 97)۔

یہ اس وقت ہے جب کہیں بھی دارالاسلام نہ ہو جیسا کہ آج کل کی صورتِ حال ہے۔ اگر دارالاسلام موجود ہو تو دار لکفر سے دارالاسلام ہجرت کرنے کے مندرجہ ذیل احکامات ہوں گے:

1) جو شخص ہجرت کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور اپنے علاقے میں اپنے دین کو ظاہر بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسلام کے مطلوبہ احکامات کو ادا کر سکتا ہے، اس پر دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا فرض ہے۔ اس حال میں دار لکفر یعنی دار لحرب میں رہائش اختیار کرنا اس کے لیے جرم ہے۔ اس کی دلیل یہی سابقہ آیت ہے **اَلَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں، تو پوچھتے ہیں: تم کس حال میں تھے؟ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ کمزور اور مغلوب تھے اور فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے جو پہنچنے کی بہت بری جگہ ہے"** (النساء: 97)۔ اس کی دلیل یہ روایت بھی ہے جو ترمذی نے جریرؓ کے حوالے سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أَنَا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِينَ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَلِمَ؟ قَالَ: لا تَرَايَا نَارَاهُمَ» " میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان رہتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: کیوں؟ فرمایا تم ان کی آگ کو بھی مت دیکھو"۔** اور ابوداؤد کی روایت یوں ہے **«قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، لِمَ؟ قَالَ: لا تَرَاءَى نَارَاهُمَا»** اور نسائی نے بھی ایسا ہی روایت کیا ہے۔ اور ان کی آگ کو بھی نہ دیکھو، کے معنی ہیں کہ تم ایسی جگہ پر مت ہو کہ

تمہیں ان کی آگ نظر آئے اور وہ تمہاری آگ دیکھیں، جب آگ سلگائی جائے۔ جو اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ ان کے علاقے میں رہائش پزیر نہ ہوا جائے۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا تعلق ہے جسے بخاری نے روایت کیا: **«لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ فَتْحِ مَكَّةَ»** **"فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں"**۔ اور یہ قول: **«لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ»** **"فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں"**۔ اور یہ قول: **«قَدْ انْقَطَعَتْ الْهِجْرَةُ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ»** **"ہجرت منقطع ہو گئی ہے مگر جہاد اور نیت باقی ہے"**۔ اور جو صفوان بن امیہ کے متعلق روایت کیا گیا کہ جب اس نے اسلام قبول کیا تو اس سے کہا گیا: **(لاَ دِينَ لِمَنْ لَمْ يُهَاجِرْ)"اس کا دین نہیں جو ہجرت نہ کرے"**، پس وہ مدینہ آیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: **((مَا جَاءَ بِكَ أَبَا وَهْبٍ ؟))"اے ابو وھب تم کس وجہ سے یہاں آئے ہو"**۔ اس نے کہا: مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس کا کوئی دین نہیں جس نے ہجرت نہ کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا **ارْجِعْ أَبَا وَهْبٍ إِلَى أَبَاطِحِ مَكَّةَ، فَقَرُّوا عَلَى مَسْكَنِكُمْ فَقَدْ انْقَطَعَتْ الْهِجْرَةُ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، فَإِنْ اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوا"اے ابو وھب مکہ کے علاقوں کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور وہیں رہو۔ کیونکہ ہجرت منقطع ہو چکی ہے، اب جہاد اور نیت ہے۔ اور جب تمہیں جہاد کے لیے نکلنے کے لیے کہا جائے تو نکلو"**(ابنِ عساکر)۔ یہ تمام روایات فتح مکہ کے بعد ہجرت کی نفی کرتی ہیں۔ تاہم ان روایات میں شرعی علت موجود ہے جو کہ اسی حدیث سے مستنبط ہوتی ہے۔ جب یہ کہا گیا (بعد فتح مکہ) "فتح مکہ کے بعد" تو اس کے اندر علت موجود ہے۔ یعنی فتح مکہ ہجرت کے نہ ہونے کی علت ہے۔ یہ علت وجود اور عدم دو اعتبار سے اپنے معلول کے گرد گھومتی ہے۔ یہ صرف مکہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کسی بھی علاقے کی فتح کے بعد وہاں سے ہجرت کا حکم نہیں۔ اس کی دلیل دوسری روایت ہے کہ جس میں کہا گیا **«لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ» "فتح کے بعد ہجرت نہیں"**۔ صحیح بخاری میں عائشہؓ کی یہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ جب ان سے ہجرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: **"آج کوئی ہجرت نہیں۔ مومن فتنے کے ڈر سے اپنا دین بچانے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرتا تھا۔ آج تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کر دیا،**

مومن جہاں چاہے اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے"۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فتح سے قبل مومن فتنے کے ڈر سے اپنا دین بچانے کے لیے ہجرت کرتا تھا۔ فتح کے بعد یہ حالت تبدیل ہو گئی اور مسلمان اپنے دین کے اظہار اور اسلام کے احکامات پر عمل کرنے پر قادر ہو گیا۔ یوں کوئی بھی فتح ہجرت کی نفی کی علت ہے صرف فتحِ مکہ نہیں۔ اس لیے فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں سے مراد یہ ہے کہ علاقے کی فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں کیونکہ اب تو وہ علاقہ فتح ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے صفوان کو یہ کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ مکہ فتح ہو چکا، پس اب وہاں سے ہجرت منقطع ہے۔ کیونکہ ہجرت کفار کے علاقے اور دارالکفر سے نکلنے کو کہتے ہیں۔ اب مکہ دارالکفر نہیں رہا بلکہ دارالاسلام بن گیا اب وہاں سے ہجرت کا سوال نہیں۔ یوں کوئی بھی علاقہ فتح ہو جائے اور دارالاسلام میں داخل ہو جائے پھر وہاں سے کوئی ہجرت نہیں۔ اس کی تائید امام احمد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے معاویہؓ کے حوالے سے نقل کی ہے، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا **«لا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ مَا تُقُبِّلَتْ التَّوْبَةُ، وَلا تَزَالُ التَّوْبَةُ مَقْبُولَةً حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ الْمَغْرِبِ»** "جب تک توبہ قبول ہوتی رہے اس وقت تک ہجرت بھی منقطع نہیں ہو گی اور توبہ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک قبول ہوتی رہے گی"۔ اور امام احمد نے نبی ﷺ کا یہ فرمان بھی نقل کیا ہے کہ **«إِنَّ الْهِجْرَةَ لا تَنْقَطِعُ مَا كَانَ الْجِهَادُ»** "جب تک جہاد ہے ہجرت ختم نہیں ہو گی"۔ دوسری روایت میں ہے کہ **«لا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ مَا قُوتِلَ الْعَدُوُّ»**۔ "جب تک دشمن سے جنگ ہوتی رہے گی ہجرت ختم نہیں ہو گی"۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ دارالکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت باقی ہے ختم نہیں ہوئی۔

2) جو ہجرت کرنے پر قادر ہو لیکن وہ اپنے رہائشی علاقے میں بھی اپنے دین کو ظاہر کر سکتا ہو اور مطلوبہ شرعی احکامات پر بھی عمل کر سکتا ہو اس صورت میں ہجرت اس کے لیے مندوب ہے فرض نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ سے قبل وہاں سے ہجرت کرنے کی ترغیب دیتے تھے کیونکہ وہ دارالکفر تھا اور اس کے حوالے سے صریح آیات بھی نازل ہوئیں، جیسے **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا**

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امید وار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے" (البقرۃ:218)۔ اور ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (التوبہ:20) "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبہ والے ہیں اور یہی لوگ مراد پانے والے ہیں"۔ یہ آیات طلبِ ہجرت میں صریح ہیں۔ فرض اس لیے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں باقی رہنے والے مسلمانوں کے اس عمل کو قبول فرمایا۔ روایت میں ہے کہ نعیم النحام نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم بنو عدی نے ان کے پاس آکر کہا: آپ ہمارے پاس ہی رہیں اور اپنے دین پر ہی رہیں، جو آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا، ہم اسے روکیں گے۔ آپ ہمارے لیے وہی کام کریں جو آپ کرتے تھے۔ وہ بنو عدی کے یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے ایک عرصے تک ہجرت نہیں کی بعد میں ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: «قَوْمُكَ كَانُوا خَيْرًا لَكَ مِنْ قَوْمِي لِي، قَوْمِي أَخْرَجُونِي وَأَرَادُوا قَتْلِي، وَقَوْمُكَ حَفِظُوكَ وَمَنَعُوكَ» " تمہاری قوم تمہارے لیے بہ نسبت میری قوم کے میرے لیے، اچھی تھی میری قوم نے مجھے نکالا اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیا، جبکہ تمہاری قوم نے تمہیں ہجرت سے روکا اور تمہاری حفاظت کی" (ابن حجر نے الاصابۃ میں ذکر کیا ہے)۔

3) جو شخص ہجرت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا اور عاجزی کی وجہ سے اس سے ہجرت کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔ یہ عاجزی مرض یا روکے رہنے پر مجبور کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر کمزوری کے سبب جیسے عورتیں اور بچے وغیرہ۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا (النساء: 98) "مگر جو مرد عورتیں اور بچے بے بس ہیں جنہیں نہ تو کسی چارہ کار کی طاقت نہ کسی راستے کا علم۔"

4) جو شخص اپنے علاقے میں اپنے دین کو ظاہر کر سکتا ہے اور مطلوبہ شرعی احکامات کو بھی ادا کر سکتا ہے اور دار لکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے، اس حالت میں ہجرت کرنا اس کے لیے حرام ہو گا، خواہ وہ تن تنہا دار لکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی قدرت رکھتا ہو یا اپنے علاقے میں موجود مسلمانوں کے گروہ کے ساتھ مل کر یہ کام کر سکتا ہو یا اپنے علاقے سے باہر دوسرے علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کی مدد سے یہ کام کر سکتا ہو یا اسلامی ریاست کے ساتھ تعاون کر کے یہ فرض ادا کر سکتا ہو یا کسی بھی جائز وسائل کو بروئے کار لا کر یہ کام کر سکتا ہو تو اس کے لیے دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے کام کرنا لازمی ہے اور اس حال میں ہجرت اس پر حرام ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اپنے علاقے کو دارالاسلام میں شامل کرنا اس پر فرض ہے اور انسان قدرت رکھنے کے باوجود کسی فرض کو ادا نہ کرے، تو وہ گناہ گار اور حرام کا مرتکب ہوتا ہے۔

یوں دارالاسلام کے ہوتے ہوئے دارالکفر میں رہائش اختیار کرنا ان لوگوں پر حرام ہے، جن پر ہجرت فرض ہو اس سے بڑھ کر یہ کہ دارالکفر میں رہائش پذیر ہونے سے وہ دارالکفر کے باشندوں اور شہریوں میں سے شمار ہو گا اور اس پر دارالکفر کے احکامات نافذ ہوں گے۔ اسلامی ریاست کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے بھی اس پر دارالکفر کے باشندے والے احکامات لاگو ہوں گے۔ دوسرے افراد کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اس کے الگ احکامات ہیں، اس پر حد نافذ نہیں ہو گی، اس سے زکوۃ وصول نہیں کی جائے گی، دارالاسلام میں موجود اپنے کسی رشتہ دار کا وارث نہیں بنے گا، دارالاسلام میں موجود اس کے ایسے رشتے دار پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہو گا جو دارالاسلام میں اس کی موجودگی کی صورت میں واجب تھا۔ کیونکہ دارالکفر میں رہنے والے مسلمانوں پر شرعی احکامات نافذ نہیں ہوں گے۔ ان کے نہ دارالاسلام کے مسلمانوں جیسے فرائض ہیں نہ ہی ان جیسے حقوق، پس ان پر احکامات لاگو نہیں ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان دارالکفر میں رہنے والوں سے اسلام کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اسلام کے ماتحت آنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سلیمان بن بریدہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ **«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ أَوْصَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللَّهِ وَمَنْ مَعَهُ مِنْ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا، ثُمَّ قَالَ: اغْزُوا بِاسْمِ اللَّهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ، اغْزُوا وَلاَ تَغُلُّوا وَلاَ تَغْدِرُوا وَلاَ تَمْثُلُوا وَلاَ**

تَقْتُلُوا وَلِيداً، وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنْ الْمُشْرِكِينَ فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلاَثِ خِصَالٍ أَوْ خِلاَلٍ، فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الإِسْلاَمِ فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوا مِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللهِ الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَلا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلاَّ أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ...» ”رسول اللہ ﷺ جب کسی فوج کے سپہ سالار کو روانہ کرتے تو اس کو خاص طور پر اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتے اور اپنے ساتھ مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کی نصیحت کرتے، پھر فرماتے اللہ کا نام لے کر اللہ کہ راہ میں لڑو جو اللہ کا انکار کرتا ہے اس سے قتل کرو، لڑو، اور غلومت کرنا اور دھوکہ مت دینا مثلہ مت کرنا (ناک، کان وغیرہ نہ کاٹو) نومولود کو مت مارنا، جب مشرک دشمنوں سے آمنا سامنا ہو جائے تو ان کو تین باتوں کا اختیار دو، ان میں سے جو بات بھی وہ قبول کریں تم بھی قبول کر لو اور ان سے مت لڑو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو، اگر مان جائیں تو قبول کر لو اور مت لڑو۔ پھر ان کو اپنا علاقہ چھوڑ کر دارالمہاجرین منتقل ہونے کا حکم دو اور انہیں بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے بھی وہی حقوق اور فرائض ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور اگر وہ انکار کریں تو ان کو بتاؤ کہ ان کا حکم بھی دو ردراز دیہاتوں میں رہنے والے مسلمانوں کا ہے۔ اللہ کا وہ حکم ان پر بھی چلے گا جو مسلمانوں پر چلتا ہے تاہم مال غنیمت اور مال فئی میں انہیں حصہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد نہ کریں“ (مسلم)۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”پھر ان کو اپنے دار سے دار لمہاجرین میں منتقل ہونے کی دعوت دو اگر وہ ایسا کریں تو ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور ان کے بھی وہی فرائض ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ یہ نص اس بات کی شرط عائد کرتی ہے کہ ان کے حقوق اور فرائض اس وقت ہی ہوں گے اگر وہ منتقل ہو جائیں یعنی اس صورت میں تمام شرعی احکامات ان کے لیے بھی ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ فرمانا کہ ان کو بتاؤ اگر وہ ایسا کریں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو مہاجرین جیسے حقوق حاصل نہیں ہوں گے نہ ہی مہاجرین جیسے فرائض ہوں گے۔ یہاں جزاء کا حصول شرط کے

حصول سے منسلک ہے۔ شرط نہیں پائی جائے گی تو جزاء بھی نہیں ملے گی، یعنی اگر وہ منتقل نہ ہوئے تو دارالاسلام میں مسلمانوں کو جو کچھ مل رہا ہے وہ ان کو نہیں ملے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ فرمانا کہ ان کو بتاؤ کہ وہ دور دراز دیہاتوں میں رہنے والے مسلمانوں کی طرح ہوں گے اللہ کا حکم تو ان پر چلے گا جیسا کہ مسلمانوں پر چلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو قتل نہیں کیا جائے گا اور ان کے اموال کو بطورِ غنیمت نہیں لیا جائے گا۔ اور دوسرے احکامات ان پر نافذ نہیں ہوں گے جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ مشروط ہیں دارالاسلام منتقل ہونے سے۔ رسول اللہ ﷺ نے مال کے مسئلے کی مزید وضاحت کی اور فرمایا کہ انہیں مالِ غنیمت اور مالِ فئی میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا سبب رسول اللہ ﷺ نے ان کا منتقل نہ ہونا بیان کیا۔ اور دوسرے تمام اموال کو بھی غنیمت اور فئی پر قیاس کیا جائے گا یعنی ان کے تمام مالی حقوق ساقط ہو جائیں گے۔ دارالمہاجرین منتقل نہ ہونے والا مسلمان مالی حقوق کے لحاظ سے غیر مسلموں کی طرح ہو گا۔ یعنی اس کے کوئی مالی حقوق نہیں ہوں گے چونکہ وہ دارالمہاجرین منتقل نہیں ہو گا تو مالی احکامات اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ یہ مالی حقوق کی تاکید کے لیے ہے اگرچہ کوئی بھی حکم ان پر نافذ نہیں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ منتقل ہو جائیں تب ان کے مہاجرین کی طرح حقوق ہوں گے اور مہاجرین کی طرح فرائض ہوں گے۔ اس وقت دارالمہاجرین ہی دارالاسلام تھا اس کے علاوہ پوری دنیا دارالکفر یعنی دارالحرب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دار المہاجرین کے علاوہ کسی بھی علاقے پر حملہ آور ہوتے، اس اعتبار سے کہ وہ دار الکفر ہے۔ انسؓ سے روایت ہے **«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يُغِرْ حَتَّى يُصْبِحَ، فَإِنْ سَمِعَ أَذَانًا أَمْسَكَ، وَإِنْ لَمْ يَسْمَعْ أَذَانًا أَغَارَ بَعْدَ مَا يُصْبِحُ»** **"جب رسول اللہ ﷺ کسی قوم پر حملہ آور ہوتے تو صبح کا انتظار کرتے۔ پس آپ ﷺ اگر اذان کی آواز سنتے تو رک جاتے اور اذان کی آواز نہ سنتے تو صبح ہوتے ہی ان پر حملہ کر دیتے"**(بخاری)۔ عصام المزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جنگی مہم کو روانہ کرتے تو ان سے فرماتے: **«إِذَا رَأَيْتُمْ مَسْجِدًا أَوْ سَمِعْتُمْ مُنَادِيًا فَلا تَقْتُلُوا أَحَدًا»** **" اگر تمہیں مسجد نظر آئے یا تم اذان کی آواز سنو، تو کسی کو قتل مت کرنا"** اسے پانچوں نے روایت کیا ہے سوائے ابن ماجہ کے۔ ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دارالمہاجرین کے علاوہ

تمام علاقوں کو دارالحرب سمجھتے تھے، یعنی دارالکفر۔ اگرچہ وہاں کے رہنے والے مسلمان ہوں پھر بھی اس کا حکم دارالکفر کا ہی ہو گا۔ وہاں کے رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سوائے اس بات کے فرق نہیں کیا جائے گا کہ مسلمانوں سے لڑائی نہیں ہو گی، ان کو قتل نہیں کیا جائیگا اور ان کے اموال پر بھی بطور غنیمت قبضہ نہیں کیا جائے گا، جبکہ غیر مسلموں سے لڑائی ہو گی ان کو قتل بھی کیا جائے گا اور ان کے اموال کو غنائم کے طور پر حاصل بھی کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ تمام احکامات یکساں ہوں گے۔ پس ہر وہ علاقہ جو دارالاسلام میں شامل نہیں دارالحرب سمجھا جائے گا اور اس پر دارالحرب کے احکامات نافذ ہوں گے۔ یہ تمام باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حکم دار کا ہوتا ہے وہاں کے رہنے والوں کا نہیں کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، اس میں رہنے والا دارالحرب کا باشندہ سمجھا جائے گا خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ بالکل اسی طرح دارالاسلام کا حال ہے اس کے تمام باشندوں پر اسلام کے احکامات کو نافذ کیا جائے گا اس میں مسلمان اور ذمی دونوں برابر ہیں۔ دار کے مختلف ہونے سے احکامات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جو شخص دارالکفر کا شہری ہے خواہ مسلمان ہے یا غیر مسلم وہ ان احکامات میں شامل نہیں جو ریاست دارالاسلام میں نافذ کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور ان کے وہی فرائض ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں''۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا یعنی دارالمہاجرین منتقل نہیں ہوئے تو ان کے مہاجرین جیسے حقوق و فرائض نہیں ہوں گے۔ یعنی دارالاسلام میں نافذ احکامات ان کے لیے نہیں ہوں گے کیونکہ وہ اس اسلامی ریاست کے شہری نہیں۔ سوائے دو احکامات کے کوئی اور حکم ان پر لاگو نہیں ہو گا۔ وہ دو احکامات یہ ہیں: اس دارالکفر کو فتح کرنے کی صورت میں ان کی جان اور مال پر کوئی دست درازی نہیں کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد کے مطابق یہ دو چیزیں (جان و مال) مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ»** **''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جہاد کروں جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے**

رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، جب انہوں نے یہ کیا تو انہوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ بنالیا، سوائے اس کے جو ان پر حق ہے اور ان کا حساب تو اللہ تعالیٰ ہی پر ہے" یہ حدیث متفق علیہ ہے، ابوہریرۃؓ اور ابنِ عمرؓ سے مروی ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ جو شخص دارالاسلام میں رہائش اختیار کرے خواہ ذمی ہو یا مسلم اس پر ریاست دارالاسلام کے تمام احکامات نافذ کرے گی، سوائے جن سے شریعت نے غیر مسلموں کو مستثنیٰ کیا ہے جیسا کہ عبادات۔

دار کے دارالکفر یا دارالاسلام ہونے کی حیثیت کی بنیاد پر اس میں رہنے والوں کی شہریت کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو شخص دارالاسلام میں رہتا ہے مسلمان ہے یا کافر (ذمی) وہ اسلامی ریاست (دارالاسلام) کا شہری ہے اور اس پر ریاست کی جانب سے اسلامی احکامات نافذ کیے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو شخص دارالکفر میں رہتا ہے خواہ مسلمان ہے یا کافر، وہ دارالکفر کا شہری ہے اور ریاست کی جانب سے اس پر دارالکفر کے شہری کے احکامات ہی نافذ ہوں گے۔ یہاں عارضی رہائش یا قیام کا اعتبار نہیں بلکہ مستقل سکونت کا اعتبار ہو گا۔ اگر اسلامی ریاست کا کوئی مسلمان شہری تجارت، علاج، تعلیم، اپنے عزیزوں سے ملنے، سیر وسیاحت یا کسی اور غرض سے دارالکفر چلا جائے، کچھ سال یا مہینے قیام کرے لیکن شہریت اسلامی ہی ہو تو وہ دارالاسلام کا ہی شہری سمجھا جائے گا۔ اگرچہ فی الحال وہ دارالکفر میں مقیم ہے۔ اس کے برخلاف وہ مسلمان جو کہ دارالکفر کا باشندہ ہے اور تجارت، علاج، تعلیم عزیز و اقارب سے ملنے، سیر وسیاحت کے لیے یا کسی اور غرض سے دارالاسلام میں آئے اور کئی دن، مہینے یا سالوں تک قیام کرے لیکن اسلامی ریاست کی شہریت حاصل نہ کرے بلکہ دارالکفر کی شہریت ہی برقرار رکھے یعنی دارالکفر کو ہی اپنا ملک سمجھے اور مستقبل میں واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ دارالکفر کا باشندہ اور شہری ہی سمجھا جائے گا۔ اور اس پر مستامن کے احکامات ہی نافذ ہوں گے۔ یعنی وہ دارالاسلام میں امان کے ساتھ یعنی ریاست سے اجازت لیے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں موضوع کسی دار میں قیام نہیں، خواہ وہ قیام کتنا طویل کیوں نہ ہو، بلکہ موضوع شہری ہونا ہے۔

یوں جب خلافت قائم ہو جائے گی اور اسلامی ریاست وجود میں آئے گی تو وہ علاقے جہاں حکمرانی مسلمانوں کی اتھارٹی کے ذریعے اور امان اسلام کے ذریعے ہو گی وہ دارالاسلام کہلائے گا۔ اس کے علاوہ جتنے بھی علاقے ہوں گے ان کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہاں اسلام کی حکمرانی نہیں ہے یا اس کا امن کفر کی طرف سے ہے، یعنی کفار پر منحصر ہے تو وہ دارالکفر یا دارالحرب کہلائے گا، اگرچہ اس کے رہنے والے سب کے سب مسلمان ہوں۔ اس پر دارالحرب کے احکامات لاگو ہوں گے۔ اگر وہ علاقہ ایسا ہو جہاں حکمرانی اسلام کے ذریعے ہو اور اس کی امان بھی اسلام کی وجہ سے ہو، لیکن وہ ابھی خلافت میں مدغم (شامل) نہ ہوا ہو، تو وہ دارالاسلام ہی ہو گا اور اس پر دارالاسلام کے احکامات ہی لاگو ہوں گے۔ البتہ اس کا حکم باغیوں کا ہو گا۔ ان کے عقود (معاہدے) درست ہوں گے، ان کی طرف سے قاضیوں اور گورنروں کا تقرر صحیح ہو گا۔ ان کے قاضیوں اور گورنروں کے احکامات بھی درست سمجھے جائیں گے۔ لیکن خلیفہ کی بیعت میں داخل کرنے کے لیے ان سے قتال کیا جائیگا۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے **«إِذَا بُوِيعَ لِإِمَامَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا» "جب دو اماموں (خلفاء) کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کرو"** (مسلم نے ابو سعید سے روایت کیا)۔ اس لیے جونہی کسی ملک میں اسلامی ریاست قائم ہو جائے جیسے عراق، ترکی یا شام میں، تب اس مسلمان کا حکم جو برطانیہ، امریکا یا روس میں ہے اس شخص کی طرح ہو گا جو دارالحرب میں ہے۔ صرف یہ کہ مسلمان کی جان و مال اس ملک کو فتح کرنے کی صورت میں محفوظ ہو گا۔ ان مسلمانوں کا حکم جو کسی اسلامی علاقے میں ہیں اور انہوں نے اسلام کو نافذ بھی کیا ہوا ہے لیکن ابھی خلافت میں داخل نہیں ہوئے، باغیوں کا ہو گا۔ اگر انہوں نے اسلام کو نافذ نہیں کیا ہے تو پھر ان کا علاقہ دارالکفر ہو گا۔ اسی طرح مسلمانوں کا کوئی بھی علاقہ جہاں اسلام نافذ نہ ہو یا اس کا امان خارجی ہو یعنی مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو تو وہ بھی دارالکفر سمجھا جائے گا اور دارالکفر کے احکامات ہی اس پر لاگو ہوں گے، اگرچہ وہاں رہنے والے سب کے سب مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ علاقہ چاہے خلافت کے پڑوس میں ہو یا اس سے دور ہو، اس میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ اسلامی ریاست ان تمام علاقوں کو ایک ہی اسلامی علاقہ سمجھے

گی، جہاں کبھی اسلام نافذ ہوا یا جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت مسلمان ہو۔ ان علاقوں کو ایک وحدت کی شکل میں اکٹھا کرنا فرض ہے تاکہ یہ اسلام کے جھنڈے تلے آجائیں اور ان کے گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق ہو۔

'اسلام کی امان' سے مراد یہ ہے کہ ان کا امن اسلامی اتھارٹی کے ذریعے ہو، جبکہ کفر کی امان' سے مراد یہ ہے کہ ان کا تحفظ و سلامتی کفر کی اتھارٹی کے بل بوتے پر ہو۔ القاموس المحیط میں کہا گیا ہے: **الأمن والآمن كصاحب ضد الخوف أمن كفرح أمناً وأماناً بفتحهما** '۔ ابو داؤد نے سعدؓ سے روایت کیا ہے: : **«لَمَّا كَانَ يَوْمُ فَتْحِ مَكَّةَ أَمَّنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ النَّاسَ إِلاَّ أَرْبَعَةَ نَفَرٍ وَامْرَأَتَيْنِ وَسَمَّاهُمْ»** "جس دن مکہ فتح ہوا اس دن رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو امن دے دیا سوائے چار مردوں اور دو عورتوں کے اور ان کے نام بھی لیے۔" اور ابی بن کعبؓ سے روایت ہے: **«فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ الْفَتْحِ قَالَ رَجُلٌ لا يُعْرَفُ: لا قُرَيْشَ بَعْدَ الْيَوْمِ، فَنَادَى مُنَادِي رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَمِنَ الأَسْوَدُ وَالأَبْيَضُ إِلا فُلانًا وَفُلانًا نَاسًا سَمَّاهُمْ»** "فتح مکہ کے دن ایک آدمی نے کہا کہ معلوم نہیں آج کے بعد قریش کا نام و نشان بھی ہو گا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ کے منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ ہر کالے اور گورے کو امن ہے سوائے فلاں فلاں کے اور ان کے نام بھی لیے"۔ اسے احمد نے اپنی مسند میں حسن اسناد سے نقل کیا ہے اور حاکم نے بھی اپنی مستدرک اور ابنِ حبان نے اپنی صحیح میں اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔ دونوں کے راوی ابی بن کعبؓ ہیں۔ یہ ہے امان کا مطلب، پھر ان امان کے الفاظ کی اضافت اسلام یا کفر کی طرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اضافت اس اتھارٹی کی طرف ہے جو امان مہیا کرتی ہے، کیونکہ ایک ریاست میں امان اتھارٹی کے ذمہ ہوتی ہے۔ پس اسلام کی امان کا مطلب ہے یہ امان مسلمانوں کی اتھارٹی اور قوت کے ذریعے ہے اور کفر کی امان کا مطلب یہ ہے کہ یہ امان کفار کی اتھارٹی کے ذریعے ہے۔

داخلی امان سے مراد یہ ہے کہ اتھارٹی کی قوت کی وجہ سے رعیت میں سے ہر شخص کی جان و مال اور آبرو محفوظ ہو۔ جبکہ خارجی امان سے مراد یہ ہے کہ ریاست اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی حدود کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھ سکتی ہو اور یہ تحفظ کسی غیر ملکی اتھارٹی کے ذریعے نہ ہو۔

جہاں تک اس دفعہ کی دوسری شق کا تعلق ہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلام نے دوسری ریاستوں کے ساتھ معاہدوں کی اجازت دی ہے ۔ ارشاد باری ہے **اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ** **"سوائے ان کے جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو"** (النساء: 90)۔ اور فرمایا **وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ** **"اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو تو وارثان مقتول کو خون بہا دو"** (النساء:92)۔ اور فرمایا **وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ** ﷺ **"ہاں اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تم پر مدد کرنا لازم ہے سوائے ان لوگوں کے خلاف جن میں اور تم میں عہد پیمان ہے"** (الانفال:72)۔ ان آیات میں میثاق سے مراد معاہدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایلہ کے حکمران یوحنہ بن روبہ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ نے بنی ضمر کے ساتھ بھی معاہدہ کیا۔ اس قسم کے معاہدات میں مسلمان ان شرائط کے پابند ہوتے ہیں کہ جن پر معاہدہ طے پایا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **«وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ»** **"مسلمان اپنی شرط کا پابند ہوتا ہے"**۔ اسے ترمذی نے نقل کیا اور اسے حسن صحیح کہا ہے لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب یہ شرائط اسلام سے متصادم نہ ہوں اگر کوئی شرط اسلام کے خلاف ہو اس کو ترک کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **"مسلمان اپنی شرط کا پابند ہے سوائے اس شرط کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے"** (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں فرمایا: **«مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَهُوَ بَاطِلٌ»** **"ایسی شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے"** عائشہؓ سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اس لیے مسلمان معاہدات میں پائی گئی شرائط کی پابندی کریں گے جب تک وہ اسلام کے خلاف نہ ہوں۔ اس شق کی دلیل وہی ہے جو معاہدات کے جائز ہونے اور اپنی شرائط کو پورا کرنے کی دلیل ہے۔

جہاں تک اقتصادی اور تجارتی تعلقات سے متعلق اس شق کے دوسرے حصے کی بات ہے یعنی کس قسم کے تجارتی معاہدات ناجائز ہیں اور کس قسم کے معاہدات جائز ہیں، تو اس حوالے سے یہ دیکھا جائے گا کہ

ایسے اقتصادی معاہدات جو امت کے لیے ضرر رساں ہو سکتے ہیں وہ ممنوع ہوں گے جیسے خام مال کو ریاست سے باہر لے جانے کے معاہدات یا ایسے معاہدات جن سے ریاست کے اندر فیکٹریوں کے بند ہونے کا اندیشہ ہو یا اس سے ملتے جلتے معاہدات، یعنی ہر وہ معاہدہ ممنوع ہو گا جس میں نقصان کا اندیشہ ہو، اس کے متعلق اِس قاعدے پر عمل کیا جائے گا **(كل فرد من أفراد المباح إذا كان يؤدي إلى ضرر يمنع ذلك الفرد ويبقى الشيء مباحاً)" مباح چیز کے اجزاء میں سے کوئی جزو اگر نقصان دہ ہو تو وہ جزو تو ممنوع ہو گا لیکن وہ چیز پھر بھی مباح ہی رہے گی"**۔ یہی حال تجارتی معاہدات کا ہے۔

ان ریاستوں کا حکم یہ ہے کہ یہ محارب ریاستیں ہیں، یہ اس لیے کہ یہ کفار ہیں اور ابھی تک اسلام کی اتھارٹی کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ اسلام سے برسرپیکار ہی سمجھی جائیں گی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: **«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ» "مجھے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک لڑائی کا حکم ہے کہ جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں"**۔ یہ ایک عام حکم ہے۔ یہ حکمی طور پر محارب ہیں یعنی احکام کے اعتبار سے، اور ان کا حکمی طور پر محارب ہونا ہمارے اور ان کے درمیان معاہدات کی وجہ سے ہے۔

تیسری شق کی دلیل وہی ہے جو دارالحرب سے متعلق احکامات کی دلیل ہے، جب ہمارے اور دارالحرب کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو۔ اس دفعہ میں جن ریاستوں کا نام لیا گیا ہے، ان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم نہ کرنے کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے زیرنگیں علاقوں میں ان کو سفارت خانے کھولنے کی اجازت دینے میں بڑے نقصان کا خطرہ ہے۔ کیونکہ ان ممالک کے سفارت خانوں کا کام، جہاں یہ قائم ہوتے ہیں، وہاں اپنی ریاست کا تسلط کو قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس لیے اس قاعدے کی رُو سے ان کو روک دیا جائے گا کہ اگر مباح کا کوئی جزو نقصان تک پہنچاتا ہو وہ جزو ممنوع ہو گا۔ تاہم ان کی رعایا کو اسلامی ریاست میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا، سوائے اس شخص کے کہ جس سے نقصان کا اندیشہ ہو۔ ان کے وقتی ایلچی

(پیغام لانے والے) کو بھی نہیں روکا جائے گا۔ صرف اس وقت اس کو روکا جائے گا کہ وہ شخص جو پیغام لے کر آرہا ہے، وہ ایلچی نہ ہو اور اس کا ریاست میں داخل ہونا نقصان دہ ہو۔

یہ ریاستیں حربی حکماً اس لیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ»** **"مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں"**۔ کیونکہ یہ لوگ کفار ہیں۔ جہاں تک انہیں حکماً حربی سمجھنے کا تعلق ہے نہ کہ فعلاً تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان فعلاً (عملی) جنگ نہیں ہو رہی ہے۔ نہ ہی ان کی طرف سے یا ہماری طرف سے حالتِ جنگ میں ہونے کا اعلان ہوا ہے۔ لیکن جس وقت ان میں سے کوئی ریاست یا یہ سب اسلامی سرزمین پر دست درازی کرنے کی جسارت کریں پھر ان کے ساتھ عملاً حالتِ جنگ والا معاملہ کیا جائے گا جیسا کہ شق نمبر 4 میں بیان ہے۔ اس وجہ سے امریکہ و برطانیہ کی جانب سے عراق اور افغانستان کے خلاف جارحیت کے بعد وہ عملاً ہمارے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں۔ اس طرح کوئی بھی ملک جو مسلمانوں کی کسی بھی علاقے پر حملہ کرنے کا اعلان کر دے تو وہ کافر حربی فعلاً ہو گا اور جب تک یہ حالت جنگ برقرار رہے گی ان کے ساتھ عملی جنگی کے احکامات کے مطابق معاملہ کیا جائیگا۔

جہاں تک شق نمبر 4 کا تعلق ہے، تو اس کی دلیل وہی ہے جو جہاد کی ہے جس میں کفار سے قتال کا حکم ہے اور وہ دلائل جو کفار کے خون اور مال کو حلال کرتے ہیں اور جو عملاً ان سے قتال کرنے کے دلائل ہیں۔ ارشاد باری ہے: **قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ** (التوبہ: 123) **"اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں"**۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ»** **"مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی نہ دیں"** یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہاں الفاظ مسلم کے ہیں۔ مسلمان اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **"اگر وہ ایسا کریں گے تو اپنی جان**

و مال کو مجھ سے محفوظ بنالیں گے سوائے اس مال کے جس کا وصول کرنا حق ہے"۔ ارشاد باری ہے **وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** **"اور جو شخص اس موقع پر پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لیے پینترا بدلتا ہو یا جو اپنی جماعت کی پناہ لینے آتا ہو، وہ مستثنیٰ ہے، باقی اور جو بھی ایسا کرے گا وہ اللہ کے غضب میں آئے گا"** (سورۃ الانفال:16)۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ **«اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ»"سات تباہ کن چیزوں سے بچو"** اس میں آگے فرمایا **«وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ»** **" میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر فرار ہونا"**۔ ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

اس کے علاوہ بھی قتال اور معرکہ کے احکامات اور دارالحرب کے بہت سے احکامات ہیں۔

ان جارح اور عملی جنگ والے ملکوں سے دائمی صلح جائز نہیں یعنی دائمی جنگ بندی یا دائمی امن معاہدہ جائز نہیں کیونکہ اس سے جہاد معطل ہو جائے گا جبکہ جہاد قیامت تک جاری رہنے کے لیے ہے۔ دائمی جنگ بندی سے اسلام کی دعوت بھی رک جائے گی اور اسلام دوسرے ادیان پر غالب نہیں آسکے گا۔ ارشاد باری ہے **وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ** **"اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارا اللہ ہی کا ہو جائے"** (الانفال:39)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِي اللَّهُ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ»** **"جہاد اس وقت سے لے کر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا اس وقت تک جاری رہے گا جب میرا آخری امتی دجال سے لڑے گا"**۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔

ان ممالک کے ساتھ وقتی صلح اور وقتی جنگ بندی (سیز فائر) کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کو مد نظر رکھا جائے گا۔

الف) جس ریاست اور ہمارے درمیان عملی جنگ ہو رہی ہو اور اس کی وہ زمین بھی غیر اسلامی ہو جہاں اس کا وجود ہے تو ان کے ساتھ وقتی صلح اور جنگ بندی جائز ہے، یعنی ایک معلوم مدت تک ان سے جنگ نہ کرنے کا

معاہدہ کرنا جائز ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ جنگ بندی مسلمانوں اور اسلام کے مفاد میں اور شرعی شرائط کے مطابق ہو۔

اس کی دلیل صلح حدیبیہ ہے۔ یہ صلح اسلامی ریاست، جسے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں قائم کیا تھا اور قریش کی ریاست جو ایسی زمین پر قائم تھی جس کو اسلام نے ابھی تک فتح نہیں کیا تھا، یعنی ایسی ریاست جس کی زمین اسلامی نہیں تھی، کے درمیان ہوئی تھی۔

ب) وہ ریاست جس کے اور ہمارے درمیان عملی جنگ ہو رہی ہو، اگر وہ پوری کی پوری اسلامی زمین پر قائم ہو یعنی اس کی سرزمین ایسی ہو کہ جس کو مسلمانوں نے پہلے فتح کیا ہو اور اس کی سرزمین کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو جس کو مسلمانوں نے پہلے فتح نہ کیا ہو جیسے (اسرائیل) یہودیوں کی وہ ریاست جو فلسطین کی سرزمین کو غصب کر کے (چھین کر) بنائی گئی ہے؛ اس کے ساتھ صلح جائز نہیں کیونکہ اس ریاست کا قیام ہی شرعاً باطل ہے۔ اس کے ساتھ کوئی صلح کرنے کا مطلب اسلامی سرزمین سے اس کے حق میں دستبردار ہونا ہے جو حرام اور اسلام میں بہت بڑا جرم ہے بلکہ اس کے ساتھ دائمی طور پر حالت جنگ میں رہنا فرض ہے، خواہ اسلامی سرزمین پر مسلط کیے گئے غیر قانونی حکمرانوں نے اس کے ساتھ جنگ بندی کا کوئی معاہدہ کر رکھا ہو۔

یوں یہودی ریاست کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرنا خواہ وہ معاہدہ بالشت بھر زمین کے بدلے ہی کیوں نہ ہو، شرعاً حرام ہے، کیونکہ یہ ریاست غاصب ظالمانہ ریاست ہے۔ اس کا وجود ہی مسلمانوں کی زمین پر ہے۔ اس کے ساتھ صلح کرنے کا مطلب مسلمانوں کی زمین سے دستبرداری ہے اور اس کے ناپاک وجود کو برقرار رکھنا بلکہ مضبوط کرنا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں۔ اسلام حتمی طور پر تمام مسلمانوں کو اس ریاست کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے اپنی فوجوں کو متحرک کرنے کا حکم دیتا ہے اور ہر طاقت رکھنے والے کو اس فوج میں شامل ہونے کا حکم دیتا ہے۔ یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اسکے وجود کو مٹا نہ دیا جائے اور اسلامی زمین کو اس کے چنگل سے آزاد نہ کرا لیا جائے۔ ارشاد باری ہے **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** **"اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز کوئی راستہ (اختیار یا غلبہ) نہیں**

دیا"(النساء:141)۔ اور فرمایا **فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ** "جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو اس نے تم پر کی ہے"(البقرۃ:194)۔ اور ارشاد باری ہے **وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ** "انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے"(البقرۃ:191)۔

دفعہ نمبر190: عسکری معاہدات عسکری نوعیت کے دوسرے معاہدات یا عسکری معاملات سے ملتے جلتے معاہدات جیسا کہ سیاسی معاہدات اور فوجی اڈے یا ہوائی اڈے کرایہ پر دینے کے معاہدات بالکل ممنوع ہیں۔ تاہم ہمسائیگی، اقتصادی، تجارتی، مالیاتی، ثقافتی اور عارضی جنگ بندی کے معاہدات جائز ہیں۔

معاہدات کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ سمجھوتے ہیں کہ جو حکومتیں آپس میں خاص تعلق کو منظم کرنے اور قوانین و شروط کی تجدید کی غرض سے طے کرتی ہیں۔ مسلمان فقہاء نے ان معاہدات کے لیے "الموادعات" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کفار اور مسلمانوں کے درمیان معاہدات کے انعقاد کے جائز ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ** "سوائے ان کے جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے" (النساء:90)۔ اسی طرح یہ ارشاد کہ **وَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓی اَهْلِهٖ** " اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے"(النساء: 92) یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ **وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ** "اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے سوائے ان لوگوں کے خلاف کہ جن کے اور تمہارے درمیان عہد و پیمان ہے"(الانفال: 72)۔ ان تمام آیات میں میثاق سے مراد

معاہدات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی کفار کے ساتھ کئی ایک معاہدے کیے۔ تاہم معاہدے کے انعقاد کی صحت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس معاہدے کا موضوع ایسا ہو جس کی شرع نے اجازت دی ہے۔ جیسا کہ اس کی مدت مقرر ہو اس طرح تعلقات کے حوالے سے دوسرے احکامات کے مطابق ہو۔ ان معاہدات میں سے کچھ سیاسی ہوتے ہیں اور کچھ غیر سیاسی۔

جہاں تک غیر سیاسی معاہدات کا تعلق ہے اس سے مراد وہ سمجھوتے ہیں جو دو ریاستوں کے درمیان کسی خاص معاملے کے حوالے سے تعلقات کی کیفیت کا تعین کرتے ہیں۔ جیسے مالیاتی تعلقات، اقتصادی، تجارتی، صنعتی یا پھر ثقافتی تعلقات کی سمت کا تعین کرتے ہیں ان تعلقات کے موضوع کے لیے شرع کو مد نظر رکھا جائے گا اور اس موضوع کے حوالے سے متعلقہ شرعی احکامات کی پیروی کی جائے گی۔ جیسے جائز اقتصادی معاہدات جن پر اجیر (مزدور) کے احکام اور خارجی تجارت کے احکامات لاگو کیے جائیں گے۔ اسی طرح جائز تجارتی معاہدات، جن پر خرید و فروخت کے احکامات اور خارجی تجارت کے احکامات نافذ کیے جائیں گے۔ اسی طرح جائز مالی معاہدات پر احکام الصرف (آپس میں کرنسی کے تبادلے کے احکام) لاگو کئے جائیں گے۔ یا وہ معاہدہ جائز ثقافتی معاہدہ ہو گا جس پر سیکھنے اور سکھانے کے احکامات تدریسی مواد کے حوالے سے نافذ کیے جائیں گے اسی طرح اس تعلیم کے یقینی اور غالب گمان کے مطابق پیدا ہونے والے نتائج کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔

سیاسی معاہدات تین قسم کے ہوتے ہیں:

وہ سیاسی معاہدات جو جائز ہیں اور وہ ریاست کے وجود کو متاثر بھی نہیں کرتے نہ ہی ریاست کی داخلی یا خارجی اتھارٹی کے منافی ہیں اور نہ ہی کسی کافر کو اسلامی ریاست پر بالادست کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر صلح کے معاہدات، عارضی جنگ بندی کے معاہدات وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں قریش کے ساتھ صلح اور عارضی جنگ بندی کا معاہدہ کیا۔ اسی طرح ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی ضمرۃ اور بنی مدلج کے ساتھ کیا۔ یا پھر اچھے ہمسائیگی کا معاہدہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کے ساتھ اچھے ہمسائیگی کا معاہدہ کیا وغیرہ وغیرہ۔

ان معاہدات میں سے جائز ہنگامی ضرورت کے معاہدات یعنی جب ریاست تنگی اور پریشانی میں ہو تو کسی ریاست سے صرف جزیہ وصول کر کے اس کو (کچھ عرصے کے لیے) کفر نظام بر قرار رکھنے کی اجازت دینا یا کافر اتحادیوں کی جانب سے مشترکہ حملہ کرنے کی صورت میں ان میں سے کسی ملک کو دولت دے کر اس اتحاد سے الگ کرنا۔ ان معاہدات میں سے کچھ بالکل ممنوع ہیں، جیسے حفاظت (سیکورٹی) کے معاہدات، دائمی طور پر غیر جانبدار رہنے کے معاہدات، سرحدوں کو مستقل کرنے کے معاہدات، ہوائی اڈوں اور فوجی اڈوں کے معاہدات یا اس سے ملتے جلتے معاہدات وغیرہ بالکل ناجائز ہیں کیونکہ ان کا موضوع ہی ناجائز ہے۔ سیکورٹی (حفاظت) کے معاہدات کافر کو مسلمان پر بالا دست بناتے ہیں اور مسلمان کافروں کے رحم کرم پر ہوتے ہیں۔ ہمیشہ غیر جانبدار رہنا بھی ناجائز ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے اسلام کی دعوت سے دستبرداری اور جہاد کو روکنا۔ ہوائی اڈوں اور عسکری اڈوں کو کرائے پر دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان سے کافر کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

عسکری معاہدات رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے حرام ہیں **«لا تَسْتَضِيئُوا بِنَارِ الْمُشْرِكِينَ»** ترجمہ: **"اور مشرکوں کی آگ سے روشنی بھی مت لو"**۔ اس کو احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ کسی قوم کی آگ کنایہ ہے جنگ کے دوران ان کے وجود سے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ» "میں کبھی کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا"**۔ اس کو مسلم نے عائشہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ **«إِنَّا لا نَسْتَعِينُ بِمُشْرِكٍ» "ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیتے"** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«لاَ نَسْتَعِينُ بِالْكُفَّارِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ» "ہم مشرکین کے خلاف کفار سے مدد نہیں لیتے"** اس کو ابن ابی شیبہ نے سعید بن منذر سے روایت کیا ہے۔

یہی بات احمد اور ابو داؤد نے ذی مخمر سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«تُصَالِحُونَ الرُّومَ صُلْحًا آمِنًا، وَتَغْزُونَ أَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِهِمْ» "تم روم سے امن کے ساتھ صلح کروگے اور اس کے بعد تم ان سے لڑوگے"**۔ اس میں۔ "تم ان سے لڑوگے" کا مطلب ہے تم ان کے افراد سے لڑوگے ریاست سے نہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ " تم روم سے امن کے ساتھ صلح کروگے " اور مسلمانوں اور کافروں

کے درمیان صلح صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ جزیہ دینا قبول کریں اور مسلمانوں کے زیر سایہ رہیں۔ کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جن کفار سے جنگ کریں ان کو تین اختیار دیں یعنی اسلام، جزیہ یا پھر جنگ۔ صلح ہونے کا مطلب ہے کہ انہوں نے جزیہ دیا اور اسلامی ریاست کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اس لیے اس حدیث میں تم صلح کرو گے قرینہ ہے اس بات کا کہ وہ مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گئے اور صرف کچھ لوگوں نے لڑائی کی اور حقیقت میں روم کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا ان کو شکست دی اور ان کے علاقوں پر قبضہ کیا مسلمانوں کے ساتھ روم کے افراد نے لڑائی کی ریاست نے نہیں۔ ریاست نے صلح کر دی اس لیے اس حدیث سے مراد رومی افراد سے لڑو گے۔ اس حدیث کی اس طرح تفسیر کرنا اس لیے بھی بہتر ہے کہ اس صورت میں دونوں حدیثوں کو جمع کیا جا سکتا ہے یعنی دونوں عمل ہو سکتے ہیں۔ اور یہ اصول فقہ کے اس قاعدے کی رو سے ہے کہ دو دلیلوں کے درمیان اعمال (ان دونوں پر عمل کرنا) ان سے اہمال (ایک کو چھوڑنے) کرنے سے بہتر ہے۔ جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو تب ہی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے گی۔ ان تمام حدیثوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بحیثیت ریاست مشرکین سے مدد لینے کے جائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ مدد نہ لینے کی دلیل انتہائی صریح اور واضح ہیں۔

دفعہ نمبر 191: ریاست کے لیے ان تنظیموں (آرگنائزیشنز) میں شمولیت جائز نہیں جن کی بنیاد اسلام نہیں یا وہ غیر اسلامی احکامات کو نافذ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی ادارے جیسا کہ اقوامِ متحدہ، عالمی عدالت انصاف، عالمی مالیاتی فنڈ (آئی۔ ایم۔ ایف) عالمی بنک (ورلڈ بینک) یا علاقائی تنظیمیں جیسے عرب لیگ۔

جس موضوع اور جس بنیاد پر یہ بین الاقوامی تنظیمیں یا یہ علاقائی ادارے قائم ہیں وہ شرعاً حرام ہیں۔ اقوام متحدہ سرمایہ درارانہ نظام کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ کفریہ نظام ہے۔ اس کے علاوہ یہ بڑے ممالک خصوصاً

امریکہ کی آلہ کار ہے جو وہ دوسرے چھوٹے ملکوں خصوصاً عالم اسلام میں قائم ملکوں پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ عالمی عدالت انصاف کفر نظام کے مطابق فیصلے کرتی ہے۔ اس کے پاس اپنے فیصلے لے جانے کا مطلب اللہ کے نازل کردہ احکامات کو پس پشت ڈال کر طاغوت کے فیصلے کو قبول کرنا ہے۔ عالمی مالیاتی فنڈ سودی قرض دینے کی بنیاد پر قائم ہے اور حرام طریقے سے کرنسیوں کا تبادلہ کرتی ہے۔ یہ بڑی کرنسی کو کسی ملک کی کرنسی کے بدلے برابری کے طور پر نہیں دیتی بلکہ بڑی کرنسی کو ایک خاص مقدار کے سود کے لیے ان ممالک کو دیتی ہے جو اس کرنسی کے محتاج ہیں یہ تبادلہ (ایکس چینج) شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ یہ برابری کی بنیاد پر بھی نہیں اور نقد (کیش) کی صورت میں بھی نہیں بلکہ قرض کی شکل میں ہوتا ہے۔

کرنسیوں کا تبادلہ اگر قرض کی شکل میں ہو تو وہ حرام ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ سارے کا سارا سود پر مبنی ہے جو کہ قطعاً حرام ہے۔ عالمی بنک بھی دوسرے بنکوں کی طرح سود کے ذریعے کاروبار کرتا ہے۔ عرب لیگ بھی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر قائم ہے اور اپنے دستور میں عرب ریاستوں کی آزادی کی حفاظت کی بات کرتی ہے یعنی اسلامی سرزمین کی بندر بانٹ اور پھر ان ٹکڑوں کی حفاظت کی بات کرتی ہے جو کہ حرام ہے۔ او آئی سی بھی عرب لیگ جیسی ہی تنظیم ہے۔ اس وجہ سے اسلامی ریاست کے لیے حرام ہے کہ وہ ان نام نہاد تنظیموں میں شمولیت اختیار کرے۔

یہ ہے مقدمہ دستور، اس میں ہم نے ان احکامات کو بیان کیا جن پر دستور کی دفعات تشکیل دی گئی ہیں۔ اس میں ہم نے ہر ضروری چیز کی تشریح کر دی اور اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ ایک اسلامی دستور ہے یعنی یہ ان احکام شرعیہ کا مجموعہ ہے جو شرعی دلائل کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اجماع صحابہ اور قیاس سے مستنبط ہے۔ اس لیے ان پر عمل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔